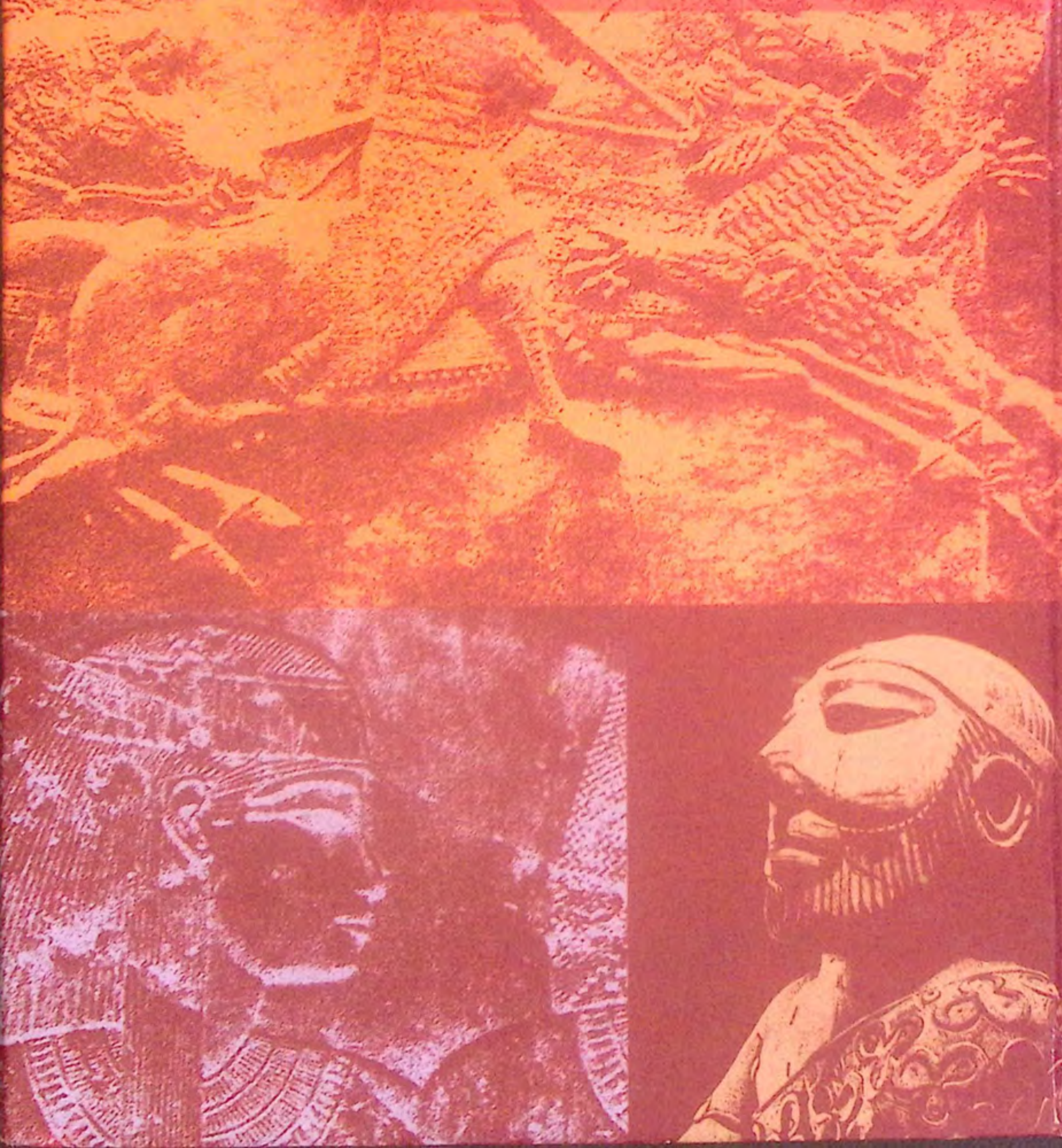


سبط حسن

ماضی کے مزار



ماضی کے مزار

سبطِ حسن

مکتبہ دانیال

ناشر : حُوری نورانی

مطبع : مقصود پرنٹنگ پریس، کراچی

اشاعت : اکیسویں بار ۲۰۱۸ء

سرورق : خدا بخش ابڑو

قیمت : ۸۷۵ روپے

ISBN: 978-969-419-012-6

Mazi Kay Mazar

by SIBTE HASAN

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE

مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone:35681457-35682036-35681239
Email:danyalbooks@hotmail.com

حبیب جالب

سبطِ حسن کے نام

جو مٹا دیتا تجھے وہ نام واپس کردیا
چھین لیتا چین جو آرام، واپس کردیا

دردمندانِ وطن کے خُوں سے جو لبریز تھا
جی بہت خوش ہے وہ تُو نے جام واپس کردیا

فکر کو آزاد جو ہونے نہ دیتا عُمر بھر
تُو نے یہ اچھا کیا وہ دام واپس کردیا

مرحبا سبطِ حسن اے ملک کے زندہ ادیب
تُو نے اِک زردار کا انعام واپس کردیا

(یہ نظم حبیب جالب نے 'ماضی کے مزار' کے پہلے ایڈیشن پر
داؤدانعام لینے سے جناب سبطِ حسن کے انکار پر لکھی تھی)

پبلشر کا نوٹ

'موسیٰ سے مارکس تک' کے موجودہ ایڈیشن کو سابقہ ایڈیشنوں کے برعکس کمپیوٹر پر کمپوز کر کے شائع کیا جارہا ہے۔ اس ایڈیشن میں 'موسیٰ سے مارکس تک' کے حوالہ جات و حواشی کو بھی یکساں انداز میں پیش کیا جارہا ہے یعنی اب ہر باب کے حوالہ جات اور حواشی اس باب کے آخر میں یکجا کر دیے گئے ہیں نیز بعض نامکمل حوالوں کو جہاں جہاں ممکن تھا، مکمل بھی کر دیا گیا ہے۔

ہم محترم پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر احمد، ڈائریکٹر، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، کے بے حد ممنون ہیں جنھوں نے ازراہِ لطف و کرم اس اہم کام میں ہم سے مکمل تعاون کیا اور یوں یہ کام بخوبی ممکن ہوسکا۔

فہرست

دیباچہ

عیار فطرتِ پشیمیاں زما خیزد
صفائے بادہ ازیں دُردِ تہ نشیں پیداست

اس کتاب کا ذہنی خاکہ میں نے سترہ سال پہلے قلعہء لاہور کے ایامِ اسیری میں بنایا تھا۔ وہاں لکھنے پڑھنے کی سہولتیں نصیب نہ تھیں لہٰذا تنہائی کے اوقات میں خیال کے گھوڑے خوب دوڑاتے تھے۔ میں نے اپنے اس خیالی منصوبے کا نام ''آثار وافکارِ مشرق'' رکھا تھا اور پوری کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلی جلد میں پرانی تہذیبوں کی تاریخ، ادب اور افکار و عقائد کا (ابتدا سے ولادتِ مسیح تک) جائزہ لینا مقصود تھا۔ دوسری جلد مسیحی دور کے لیے مخصوص تھی اور تیسری جلد میں ظہورِ اسلام سے مغربی تہذیب کے اثر ونفوذ کے آغاز تک (۱۷۵۷ء) کا تذکرہ کرنا چاہتا تھا۔

مشرق کی قدیم تہذیبوں کے بارے میں مغربی زبانوں میں بے شمار تصانیف موجود ہیں۔ دانایانِ فرنگ نے پرانے کتبوں اور لوحوں کی مدد سے سومیری، عکادی، مصری، قدیم پہلوی اور مشرق کی دیگر مُردہ زبانوں کی تحریریں پڑھ لی ہیں اور ان کی گرامر اور لغتیں بھی تیار کرلی ہیں۔ ان دانشوروں کی تلاش و تحقیق کی بدولت مشرق کی پرانی تہذیبوں کے بکثرت نوشتے جو ملبوں میں دفن تھے مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان تہذیبوں کے عروج و زوال کی مستند تاریخیں بھی مرتب ہوکر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اردو زبان کا خزانہ ان بیش قیمت نوادر سے ہنوز خالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اجداد کے اقدارِ حیات، طرزِ معاشرت اور اندازِ فکر و احساس سے بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ ہماری کم آ گہی کا یہ عالم ہے کہ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا علمائے دین بھی نمرود، شداد اور فرعون وغیرہ کی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اکثر حضرات کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ فرعون قدیم فرماں روایانِ مصر کا لقب تھا، کسی مخصوص بادشاہ کا نام نہ تھا۔

ہماری درس گاہوں میں بھی مشرقی تہذیبوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ مشرق کی قدیم زبانوں کا کوئی حرف شناس ملتا ہے۔ حالانکہ مغرب کی سبھی ممتاز درس گاہوں میں مشرق کی تہذیبوں کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں اور مشرق کی مُردہ زبانوں کے درجنوں عالم موجود ہیں۔ ہم لوگ مشرقی تہذیب کی ثناوصفت میں تقریریں تو خوب کرتے ہیں لیکن اس تہذیب کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس کے رنگارنگ مظاہر سے یکسر ناآشنا ہیں۔

یہی بے بضاعتی اس کتاب کی اصل محرک تھی لیکن مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ اتنے بڑے کام کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے جس وسیع مطالعے اور گہری نظر کی ضرورت ہے میں اس سے محروم ہوں۔ بدقسمتی سے کوئی مرشد و رہبر بھی میسر نہ تھا جو مجھے صحیح راستے پر لگاتا یا میری تہی مائگی کی تلافی کرسکتا۔ رہ گئی کتابوں کی فراہمی سو وہ بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔ یہاں تو کسی موضوع پر تحقیق کرنے سے پہلے یہ تحقیق کرنی پڑتی ہے کہ متعلقہ کتابیں کہاں اور کیسے دستیاب ہوں گی۔ یہ معروضات عذرِ گناہ کے طور پر نہیں پیش کی جارہی ہیں بلکہ اصل مقصد ان دشواریوں کی نشان دہی ہے جو مشرقی تہذیبوں کے مطالعے کی راہ میں حائل ہیں۔

بہر حال ''آثار و افکارِ مشرق'' کی پہلی جلد حاضر خدمت ہے۔ چاہتا تھا کہ اس جلد میں وادیِ دجلہ و فرات کے علاوہ وادی سندھ، مصر، ترکی، شام و فلسطین اور ایران و عرب کی تہذیبوں کا جائزہ بھی لے لوں لیکن بابلی تہذیب ہی کا ذکر اتنا پھیل گیا کہ کتاب کا حجم دوسری تہذیبوں کا متحمل نہ ہو سکا۔ ان تہذیبوں کی داستان اب دوسری جلد میں بیان کروں گا۔

اس کتاب کے وہ حصے ناظرین کی خاص توجہ کے مستحق ہیں جن میں تخلیق کائنات، تقدیر اور حیات بعد الموت جیسے عقائد سے بحث کی گئی ہے۔ یہ عقیدے آج بھی مشرق و مغرب کے کروڑوں انسانوں کے ایمان کا جز ہیں۔ ان کی صحت اور عدمِ صحت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ ہم نے پرانی قوموں کے ان رسوم و رواج پر روشنی ڈالی ہے جو ہمارے بعض مروجہ عقائد کی اساس ہیں تاکہ وہ تاریخی پس منظر نمایاں ہو جائے جن میں ان عقیدوں نے پرورش پائی ہے اور ان کے معاشی، سماجی اور تہذیبی محرکات بھی کھل کر سامنے آ جائیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں مسز مایا جمیل، ریڈر شعبہء انگریزی کراچی یونیورسٹی، جناب محمود بیگ، لائبریرین کتب خانہ محکمہء آثارِ قدیمہ حکومتِ پاکستان، جناب عبدالوہاب، کتب خانہء پنجاب یونیورسٹی اور جناب ابنِ حسن قیصر، لیاقت نیشنل لائبریری کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ان احباب نے کتابوں کی فراہمی میں بڑی مدد کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے تعاون اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کتاب کبھی مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ اپنے عزیز دوست مسٹر روشن علی بھیم جی، مینجنگ ڈائریکٹر ایسٹرن فیڈرل یونین کمپنی لمیٹڈ کا بھی ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھے مشرقِ قریب کے آثارِ قدیمہ اور یورپ کے عجائب گھروں کی سیر کا موقع ملا۔ جناب محمد طفیل، مدیر نقوش کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے گل گامش کی داستان کو، جو نقوش میں شائع ہوئی تھی اس کتاب میں شامل کرنے کی اجازت دی۔

رہ گئے ملک نورانی اور بیگم ممتاز ملک نورانی سو اُن کی کن کن نوازشوں کا اعتراف کیا جائے۔ ملک نورانی اربابِ وطن کے علمی ذوق سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ دیرینہ دوستی کی لاج رکھی ہے ورنہ

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم

سبطِ حسن
کراچی
۲۱ اگست ۱۹۶۹ء

دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن عرصے سے نایاب تھا۔ جناب ملک نورانی مسلسل تقاضہ کرتے رہتے تھے مگر میں دوسرے کاموں میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ نظرِ ثانی کی نوبت نہ آتی تھی۔ یوں بھی مجھ سے اپنی چھپی ہوئی تحریر دوبارہ نہیں پڑھی جاتی۔ پڑھتا ہوں تو لامحالہ ترمیم اور اضافے کو جی چاہتا ہے۔ اس کتاب پر نظرِ ثانی کرتے وقت بھی یہی صورتِ حال پیش آئی چنانچہ وہ حصے جو میری دانست میں بھرتی کے تھے میں نے خارج کر دیے اور تین نئے باب بڑھا دیے۔ آریاؤں کا عقیدۂ تخلیق، چینیوں کا عقیدۂ تخلیق اور ارتقا کا نظریہ۔ اس ضمن میں خدا کے جسمانی تصور سے بھی بحث کی جا سکتی تھی جو صدیوں تک یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں رائج رہا ہے لیکن موجودہ دور میں شاید ہی کوئی ذی فہم یہ ماننے پر تیار ہو کہ خدا کے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان ہیں یا یہ کہ وہ قیامت کے دن فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا اور آٹھ فرشتے اس کا تخت اٹھائے ہوں گے اور دوزخ کی تسکین کے لیے خدا اپنی ران دوزخ میں ڈال دے گا۔ (الغزالی مصنفہ علامہ شبلی نعمانی ص ۱۴۹) حالانکہ اشاعرہ اور مشبّہہ کے علاوہ امام ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء۔۱۳۲۸ء) تک کا یہی عقیدہ تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ نظریۂ ارتقا کی تشریح کے بغیر یہ کتاب نامکمل تھی۔ نظریۂ ارتقا کے مطالعے سے قارئین کو یہ فیصلہ کرنے میں سہولت ہوگی کہ سائنسی علوم نے کائنات اور انسان کی حقیقت کے بارے میں جو شواہد فراہم کیے ہیں ان کی موجودگی میں تخلیق، روح، حیات بعد الموت اور تقدیر وغیرہ کے روایتی عقیدے کس حد تک قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں صغرسنی کی موت کی مانند کتابوں کی زندگی بھی بہت مختصر ہوتی ہے۔ کوئی کتاب چار پانچ برس جی جائے تو غنیمت جانیے لیکن یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ماضی کی اس داستان میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے اور اربابِ ذوق کو ہنوز اس کی جستجو ہے۔

سبطِ حسن

کراچی ۱۲ جولائی ۱۹۷۶ء

پہلا باب

ماضی کے مزار

اس زمین میں ماضی کے نہ جانے کتنے مزار پوشیدہ ہیں۔قومیں جن کا ایک فرد بھی اب صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے، زبانیں جن کا کوئی بولنے والا اب زندہ نہیں ہے، عقائد جن کا ایک پیرو بھی اب کہیں نظر نہیں آتا۔ پُر رونق شہر، عظیم معابد اور عالی شان محل جن کے نشان بھی اب باقی نہیں لیکن ماضی کبھی نہیں مرتا۔وہ خاک میں ملتے ملتے بھی اپنے فکر وفن اور علم و ہنر کا خزانہ حال کے حوالے کر جاتا ہے۔ حال جو مستقبل کا پہلا قدم ہے، اَجداد کے اس اثاثے کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ جو اشیا مفید اور کارآمد ہوتی ہیں ان کو کام میں لاتا ہے، جو اقدار اور روایتیں صحت مند ہوتی ہیں ان کو قبول کر لیتا ہے۔ البتہ بے کار چیزوں کے انبار ضائع کر دیے جاتے ہیں اور فرسودہ اقدار و روایات کو رد کر دیا جاتا ہے اور جب زندگی کا کارواں اگلی منزل کی طرف کوچ کرتا ہے تو اس کے سامانوں میں نئے تجربات اور تخلیقات کے علاوہ بہت سی پرانی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔قافلۂ حیات کا یہ سفر ہزاروں سال سے یوں ہی جاری ہے۔

قومیں فنا ہو جاتی ہیں مگر نئی نسلوں کے طرزِ معاشرت پر، صنعت و حرفت پر، سوچ کے انداز پر اور ادب و فن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ زبانیں مُردہ ہو جاتی ہیں لیکن ان کے الفاظ اور محاورے، علامات اور استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر ان کا جز بن جاتے ہیں۔ پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے لیکن نئے مذہب کی ہر آستین میں اور عمامہ و دستار کے ہر پیچ میں پرانے بت پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے نقش و نگار سے نئی تہذیب کے ایوان جگمگاتے رہتے ہیں۔

پانچ ہزار برس گزرے ایسی ہی ایک تہذیب دجلہ و فرات کی وادی میں اُبھری اور دیکھتے

ہی دیکھتے پورے مشرقِ قریب میں پھیل گئی۔ بنی نوعِ انسان کی دراصل یہ پہلی منظم تہذیب تھی۔ اس تہذیب کا سکہ ڈھائی ہزار برس تک بحرِ روم سے بحرِ عرب تک چلتا رہا۔ تب فارس کے آتش کدوں میں مویدینِ زرتشت کے زمزمے بلند ہوئے اور ہخامنشی فرماں رواؤں نے بابل و نینوا کے ملبوں پر ایرانی تہذیب کی عمارتیں کھڑی کیں۔

دجلہ و فرات کا تہذیبی دھارا ایرانی تہذیب میں مل گیا اور دوآبے کا مذہب باقی رہا نہ زبان لیکن وہاں کے باشندوں نے بنی نوعِ انسان کو پہلی بار علوم و فنون سے روشناس کر کے دنیا پر جو احسان کیا ہے، ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ دنیا کے سب سے پرانے گاؤں اسی دوآبے میں ملے ہیں۔ کاشت کاری نے سب سے پہلے وہیں رواج پایا تھا۔ کمہار کا چاک سب سے پہلے وہیں بنایا گیا۔ سب سے قدیم شہروں کے آثار وہیں برآمد ہوئے ہیں۔ شہری ریاستیں پہلے پہل اسی وادی میں قائم ہوئی تھیں اور قانون کا سب سے پہلا ضابطہ اسی سرزمین پر مرتب ہوا تھا مگر دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کا سب سے عظیم کارنامہ فنِ تحریر کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے مدرسے بھی دجلہ و فرات کے ساحلوں ہی پر کھولے گئے۔ سب سے پرانے کتب خانے بھی وہیں دستیاب ہوئے ہیں اور سب سے پرانی داستانیں بھی اسی خطے کی تصنیف ہیں۔

وادیِ دجلہ و فرات کا موجودہ نام عراق ہے۔ اس ملک کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل اور آبادی ستر لاکھ کے قریب ہے لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں اس وادی کا کوئی نام نہ تھا بلکہ پورا علاقہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمالی حصہ (موجودہ موصل کا علاقہ) جس میں انسانی آبادی کے سب سے قدیم آثار ملے ہیں اشور کہلاتا تھا۔ وسطی علاقے کا نام جہاں اب بغداد آباد ہے عکاد تھا اور بغداد سے جنوب کا ڈیلٹا سومیر کہلاتا تھا۔

اشور کا علاقہ دریائے دجلہ اور اس کے باج گزار دریاؤں، زاب کلاں اور زاب خورد کی کوہستانی وادی میں واقع ہے۔ اشور کے شمال مغرب میں کوہِ توروس ہے جو عراق کو ترکی سے جدا کرتا ہے اور شمال مشرق میں کوہستانِ زگروس کا طویل سلسلہ ہے جو ایران اور عراق کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ اس علاقے میں بارش کا سالانہ اوسط ۱۲ تا ۲۵ انچ ہے۔ موسم گرمیوں میں خوش گوار اور سردیوں میں نہایت سرد ہوتا ہے۔ یہاں گندم، جو، میوہ دار درخت، انگور اور

سبزیاں آسانی سے پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس سومیر کا علاقہ جھیلوں، ندی نالوں اور دلدلوں سے بھرا ہے۔ موسم گرم اور مرطوب ہوتا ہے اس لیے کھجور اور ناریل کے درخت بہ کثرت ہوتے ہیں۔

عراق دراصل دجلہ وفرات کا عطیہ ہے۔ وہاں کے باشندوں کی زندگی کا انحصار انھیں دریاؤں پر ہے۔ اگر یہ دریا خشک ہو جائیں تو عراق ویران ریگستان ہو جائے۔ دریائے فرات شمال میں کوہِ ارارات سے نکلتا ہے (یہ وہی پہاڑ ہے جس پر روایت کے مطابق سیلاب کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی جا کر ٹھہری تھی) اور ملکِ شام میں سے گزرتا ہوا شمال مشرق کی سمت سے عراق میں داخل ہوتا ہے اور میدان میں کئی سو میل کا سفر طے کر کے بالآخر خلیجِ فارس میں سمندر سے جاملتا ہے۔ دریائے فرات کی لمبائی ۱۷۸۰ میل ہے۔

دریائے دجلہ جس کی لمبائی ۱۱۵۰ میل ہے جھیل وان کے جنوب سے نکلتا ہے اور راستے میں دریائے زاب کلاں، زاب خورد اور دریائے دیالہ کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا بصرے سے ساٹھ میل شمال میں قرنا کے مقام پر دریائے فرات میں شامل ہو جاتا ہے۔

علمائے ارض کا کہنا ہے کہ اب سے کئی ہزار برس پہلے خلیجِ فارس کا شمالی ساحل قرنا کے قریب تھا اور دجلہ وفرات سمندر میں الگ الگ گرتے تھے۔ اتفاقاً دو اور دریاؤں کے دہانے بھی وہیں واقع تھے۔ ایک دریائے قرون جو مشرق میں ایران سے آتا تھا اور دوسرا وادی الباطن کا نالہ جو جنوب مغرب میں عرب سے آتا تھا۔ یہ دونوں خلیج فارس میں تقریباً آمنے سامنے گرتے تھے۔ ان دریاؤں کی مٹی دہانوں کے پاس جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ خلیجِ فارس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک رفتہ رفتہ مٹی کی ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دجلہ اور فرات کے بہاؤ کے ساتھ آنے والی مٹی کی نکاسی رک گئی اور یہ مٹی سمندر میں بہہ جانے کے بجائے دیوار کے شمال میں جمع ہوتی گئی۔ وہ پانی جو دیوار کے سبب سمندر میں نہ جا سکتا تھا پہلے دلدل بنا پھر آہستہ آہستہ خشک ہو گیا اس طرح وہ ڈیلٹا وجود میں آیا جہاں اب بصرہ آباد ہے۔

دجلہ اور فرات پہاڑوں سے نکل کر جب میدان میں آتے ہیں تو ان کو ایک پتھریلے پلیٹو سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اونچی اونچی پہاڑیوں کو کاٹتے ہوئے بہت نشیب میں بہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ گزشتہ پانچ چھ ہزار برس میں بھی ان کے دھارے کا رخ اس علاقے میں بہت کم بدلا ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں پرانے شہر دریاؤں کے کناروں پر بدستور موجود ہیں مثلاً ماری (حریری) اور جربلوس دریائے فرات پر اور نینوا اور آشور (قلعۃ الشرغاط) دریائے دجلہ پر۔ اس کے برعکس وسطی اور جنوبی خطوں میں جہاں مسطح میدان ہیں دریاؤں کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوب کے قدیم شہر مثلاً سپر (ابوحبہ) کیش (الاحمر) بابل، اریک (ورکا) اُرء (مقیر) العُبید اور اریدو (ابوشہرین) جو کسی زمانے میں دریائے فرات کے کنارے آباد تھے اب دریا سے میلوں دور ہیں۔ ان شہروں کے انحطاط اور زوال کا بڑا سبب دریا کے بہاؤ کا یہی تغیر ہے۔

دریائے فرات جب ڈیلٹا میں داخل ہوتا ہے تو اس کا بہاؤ بہت دھیما ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مٹی جسے دریا پلیٹو سے بہا کر لاتا ہے تہہ میں بالخصوص کناروں پر جمتی جاتی ہے اور دریا کی سطح قرب و جوار کی زمین سے بھی اونچی ہوتی جاتی ہے اور کناروں پر مصنوعی بند سے بن جاتے ہیں۔ مثلاً ناصریہ کے قریب نشیب کا یہ عالم ہے کہ اُرء کے کھنڈروں کے پاس سے گزرنے والی ریلوے لائن دریائے فرات کی تہہ سے بھی چھ فٹ نیچی ہے۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ فرات کا پانی بڑی آسانی سے آب پاشی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن کنارے کے بندوں کی دیکھ بھال آسان نہیں ہے۔ سیم اور تھور کی تباہ کاریاں اس پر مستزاد ہیں۔

ان دریاؤں کی ایک خصوصیت ان کا اچانک اور ناوقت سیلاب ہے۔ یہ سیلاب اپریل اور جون کے درمیانی ہفتوں میں آتا ہے جبکہ خریف کی فصلیں ابھی کھیتوں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ سیلاب کی وجہ سے دریاؤں کا پانی آناً فاناً کئی گز چڑھ جاتا ہے۔ طغیانی کے زور سے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں ایکڑ زمین، فصلیں، جھونپڑیاں اور مویشی پانی کی چادر میں چھپ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطے کے قدیم باشندے سیلاب کے دیوتاؤں "نن گرسُو اور تیامت" کو انسان کا دشمن خیال کرتے تھے۔ سیلاب نے ان لوگوں کے عقائد اور جذبات پر گہرے نقش چھوڑے ہیں مگر ان مسائل پر ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔

وادی کے قدیم باشندے

وادیٔ دجلہ و فرات میں انسان کم و بیش سوا لاکھ برس سے آباد ہے۔ اس بات کا ثبوت علمائے آثار

کو پہلی بار بردابلکا کے مقام پر ملا۔ یہ جگہ دریائے زاب خورد کے جنوب میں کرکوک اور سلیمانیہ کے درمیان واقع ہے۔ اس جگہ کو ڈاکٹر ناجی الاصیل سابق ڈائریکٹر محکمۂ آثارِ قدیمہ عراق نے ۴۹ء میں دریافت کیا تھا۔ ڈاکٹر ناجی کو بردابلکا میں پتھر کے بہت سے اوزار ملے جو ایک لاکھ بیس ہزار برس پرانے ہیں۔ اسی قسم کے اوزار سلیمانیہ سے بارہ میل جنوب میں ہزار مَرد کے مقام پر ایک غار کی سب سے گہری سطح میں بھی پائے گئے ہیں۔ تیسری دریافت کوہِ کُردشت کے ایک غار میں ہوئی جو دریائے زاب کلاں کی وادی میں رَواندوز کے قریب واقع ہے۔ کردی اب بھی سردیوں میں اس غار میں پناہ لیتے ہیں۔ وہاں آثارِ قدیمہ کے ماہر ڈاکٹر سولیکی کو ۴۵ فٹ کی گہرائی پر آدمیوں کے چار ڈھانچوں کے علاوہ چولھے کے نشان، راکھ کے ڈھیر، پتھر کے اوزار اور بیل، بھیڑ، بکری اور کچھوے کی ہڈیاں بھی ملیں۔ ایک ڈھانچہ تو چھ مہینے کے بچے کا تھا۔ ایک ڈھانچہ جس کی کھوپڑی بھی محفوظ تھی ۳۵ سال کے ایک آدمی کا تھا۔ اس آدمی کا قد پانچ فٹ ۱۳ انچ تھا۔ اس کی ہڈیاں موٹی موٹی تھیں اور جبڑا بھاری تھا مگر ٹھڈی ندارد تھی۔ اس کا ماتھا پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور بھوں کی ہڈی ابھری ہوئی تھی۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ آدمی پیدائشی لُنجا تھا اور کچھ عرصے بعد اس کا یہ ہاتھ پتھر کے چاقو سے کاٹ دیا گیا تھا۔ (دورِ حاضر کے انسان کو جو لوہے کے چاقو کا عادی ہے پتھر کے چاقو پر حیرت ہوگی لیکن پتھر کا چاقو بھی بہت تیز ہوتا ہے۔ چنانچہ صدرِ پاکستان نے پچھلے سال موہن جودڑو کے عجائب گھر کا افتتاح کرتے وقت ریشمی فیتے کو پتھر کے ایک پرانے چاقو سے ہی کاٹا تھا) یہ چاروں بدنصیب غار میں بیٹھے تھے کہ اچانک چھت گر پڑی اور وہ دب کر مر گئے۔ یہ حادثہ لگ بھگ ۴۵۰۰ قبلِ مسیح میں پیش آیا تھا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کی اچانک موت سے علمائے آثار ہزاروں سال پیشتر کی زندگی کا سراغ لگالیں گے۔

زراعت کی ابتدا

وادیِ دجلہ و فرات میں کھیتی باڑی کی ابتدا تقریباً سات ہزار سال قبلِ مسیح میں ہوئی۔ اس خطے میں حضری زندگی کے لیے جو کاشت کاری کی بنیادی شرط ہے حالات نہایت سازگار تھے۔ کیونکہ وہاں جو اور گیہوں کے جنگلی پودے آسانی سے مل جاتے تھے۔ شروع میں تو خانہ بدوش جہاں کہیں یہ جنگلی پودا دیکھتے وہیں پڑاؤ ڈال دیتے تھے اور جب خوراک ختم ہو جاتی تو کسی اور علاقے کی

طرف روانہ ہو جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھیں بیج بونا اور فصلیں اگانا بھی آ گیا۔ علمائے عمرانیات کا کہنا ہے کہ زراعت عورتوں کی ایجاد ہے اور مویشی پالنا بھی ہمیں عورتوں نے ہی سکھایا ہے۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کیونکہ ہوتا یہ تھا کہ مرد تو جنگلی جانوروں کے شکار کرنے چلے جاتے تھے اور عورتیں ڈیروں میں رہتی تھیں۔ ان کا کام بچوں کی دیکھ بھال کرنا، کھانا پکانا اور پوشاک تیار کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کو آس پاس کے پودوں، درختوں اور بے ضرر جانوروں کے مطالعے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ کیا عجب ہے کہ کبھی اتفاق سے جو یا گیہوں کے جنگلی بیج ڈیرے کے قریب ہی گر گئے ہوں اور بارش سے ان میں انکھوے پھوٹ رہے ہوں۔ بہر حال واقعے کی نوعیت کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ زراعت کا فن عورتوں نے ایجاد کیا۔ اس ایجاد نے پورے قبیلے کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور خانہ بدوش لوگ مارے مارے پھرنے کے بجائے اپنے کھیتوں کے پاس مستقل بود و باش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح گاؤں کی بنیاد پڑی۔ اب تک عہدِ قدیم کے جتنے گاؤں دریافت ہوئے ہیں ان میں عراق کے گاؤں سب سے پرانے ہیں۔

عراق کا سب سے پہلا گاؤں کریم شہر کے پاس ملا ہے۔ یہ جگہ بھی کرکوک اور سلیمانیہ کے درمیان اور بروابلکا کے قریب ہی واقع ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ کریم شہر ابتدا میں دراصل نیم خانہ بدوشوں کی ایک بستی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک حضری زندگی کے پوری طرح خوگر نہیں ہوئے تھے۔ یہ بستی دو ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی اور پورے رقبے پر پتھر کے روڑوں کا فرش بنایا گیا تھا۔ خانہ بدوشوں نے اپنی جھونپڑیاں غالباً اسی فرش پر بنائی تھیں۔ اس مقام پر پتھر کے ہنسیے، کدال اور چکیاں برآمد ہوئی ہیں۔

ارتقا کی دوسری کڑی معلقات کا گاؤں ہے۔ یہ گاؤں موصل کے قریب اربیل جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اس گاؤں میں مکان گڑھے کھود کر بنائے گئے تھے۔ اس طرح کہ گڑھوں کو پتھر کی چٹانوں کو اوپر تلے رکھ کر گھیر دیا جاتا تھا البتہ فرش یہاں بھی روڑوں ہی کے تھے۔

ارتقا کی تیسری منزل جرمو کی بستی ہے۔ یہ جگہ بروابلکا اور کریم شہر کے درمیان واقع ہے۔ اس گاؤں میں مکان کی پندرہ تہیں برآمد ہوئیں۔ جرمو کے باشندے چوکور گھروں میں رہتے تھے۔ ان کے گھروں میں ایک سے زائد کمرے ہوتے تھے۔ دیواریں مٹی کے گارے سے

بنائی جاتی تھیں۔ گھر میں کچی مٹی کے تنور اور پکی ہوئی مٹی کے تسلے ہوتے تھے جو زمین میں گاڑ دیے جاتے تھے۔ جرمو کے باشندے ہڈی کے چمچوں سے کھانا کھاتے تھے۔ ہڈی کی سُوئی سے سیتے تھے اور سن اور اُون سے کپڑا بننا جانتے تھے۔ ان کے تکیے پتھر کے ہوتے تھے۔ وہ پتھر کے زراعتی اوزار استعمال کرتے تھے۔ خاص طور پر ہنسیا جس میں مٹھیا لکڑی کی ہوتی تھی اور اسے رال سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ جرمو کی کھدائی میں سِل، بٹہ اور پتھر کے برتن بھی ملے ہیں اور جو اور گیہوں کے دانے بھی۔ پالتو جانوروں بالخصوص بھیڑ، بیل، سؤر اور کتے کی ہڈیاں بھی نکلی ہیں۔ یہ لوگ جسمانی آرائش وزیبائش کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ پتھر اور مٹی کے ہار، سنگِ مرمر کے دست بند اور کوڑی کے بندے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ حاملہ عورت کی ایک مورت اور جانوروں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی مورتیاں بھی نکلی ہیں۔ حاملہ عورت غالباً ان کی دھرتی ماتا تھی اور اس کا حمل افزائشِ نسل کی علامت تھا۔ جانوروں کی مورتیوں سے غالباً ان کے بچے کھیلتے تھے۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو گھر کے اندر ہی فرش کے نیچے دفن کر دیتے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جرمو کی بستی ۶۵۰۰ ق۔م میں آباد تھی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ متذکرہ بالا تمام آثار عراق کے شمال مشرقی خطے ہی میں (اشور) پائے گئے ہیں۔ جنوبی خطے یعنی ڈیلٹا میں ابتدائی عہد کی کوئی چیز اب تک نہیں ملی ہے۔ یہ بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈیلٹا کی زمین شمالی خطوں سے عمر میں کم ہے اور وہاں انسان بہت بعد میں آباد ہوا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ مثلاً اریدو (ابوشہرین) ڈیلٹا کی قدیم ترین بستیوں میں شمار ہوتا ہے لیکن وہاں پکی مٹی کے جو رنگین اور نقشی برتن ملے ہیں وہ جرمو کی بالائی تہوں کے برتنوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور انھیں کے ہم عصر ہیں۔

ڈیلٹا کو پہلے پہل دراصل شمالی باشندوں ہی نے آباد کیا تھا۔ انھیں جنوب کا رخ اس وجہ سے اختیار کرنا پڑا کہ ان کے علاقے میں کچھ اور قبیلے گھس آئے تھے۔ ان قبیلوں کا تعلق شامی نسل سے تھا۔

شمال سے آنے والے قبیلوں نے ڈیلٹا کے علاقے میں جو بستیاں بسائیں ان میں اریدو سب سے پرانی بستی شمار ہوتی ہے۔ اریدو ابتدا میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو بڑھتے بڑھتے ڈیلٹا کا

اہم شہر بن گیا۔ وہاں کھدائی میں اوپر تلے سترہ مندروں کے کھنڈر ملے ہیں۔ یہ مندر کچی اینٹوں سے بنے تھے اوران میں فقط ایک کمرہ ہوتا تھااور دروازے کے سامنے قربان گاہ بنادی جاتی تھی۔ میٹھے پانی کے دیوتا انکی کا مندر اسی شہر میں تھا۔

ڈیلٹا کے ارتقا کا دوسرا دور العبید کہلاتا ہے۔ اس دور کے لوگ پکی مٹی کی مہریں، کلہاڑی اور ہلالی شکل کے ہنسیے بھی بناتے تھے۔ نرسل کی چٹائیاں بنتے تھے اوران چٹائیوں پر مٹی کی لپائی کر کے مکان کھڑے کر لیتے تھے۔ اس قسم کا ایک مکان اریدو کی کھدائی میں ملا ہے اور بڑی اچھی حالت میں ہے۔

تقریباً ساڑھے پانچ ہزار برس گزرے اس خطّے میں انسانوں کا ایک اور ریلا آیا۔ پروفیسر فرینک فرٹ، اور جارج رُو کا خیال ہے کہ یہ نو وارد ایلم (جنوب مغربی ایران) کی سمت سے آئے تھے۔ پروفیسر کریمر کی رائے ہے کہ یہ لوگ نرے وحشی تھے اور انھوں نے ڈیلٹا کے پرانے باشندوں کو اپنا محکوم بنالیا تھا لیکن پروفیسر وُولی اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ نو وارد بھی مہذب لوگ تھے اور انھوں نے مقامی باشندوں کو غلام نہیں بنایا بلکہ انھیں میں گھل مِل گئے۔ اس امتزاج سے سومیری قوم کی تشکیل ہوئی۔

اہلِ سومیر کے بارے میں اب تک یہ تصفیہ نہیں ہوسکا ہے کہ وہ کس نسل کے لوگ ہیں۔ ان کے پرانے ڈھانچوں سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے دانت لمبے تھے۔ جبڑے کی ہڈی موٹی اور ابھری ہوئی تھی رنگ گندمی تھا اور سر کے بال سیاہ تھے۔ بعض محققوں کا قیاس ہے کہ یہ لوگ آرین تھے لیکن ان کی زبان آریائی خاندان کی کسی زبان سے مشابہت نہیں رکھتی بلکہ بیک وقت چینی، کوریائی، تامل، بتو، ماجیار (ہنگری) اور ترکی زبانوں سے ملتی جلتی ہے۔

سومیر کے خطّے کو سومیری زبان میں کی۔این۔گی یعنی ''جھاؤ کی زمین'' کہتے تھے۔ یہ علاقہ بود و باش کے لیے سخت ناموزوں تھا کیونکہ وہاں کا موسم بہت گرم اور مرطوب تھا۔ زمین پر چھوٹی چھوٹی جھیلوں اور ندی نالوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دلدل جھاؤ اور نرسل کی جھاڑیوں سے اٹے ہوئے تھے اور جھاڑیاں زہریلے جانوروں اور درندوں سے بھری تھیں۔ قرب و جوار کے ریگستانوں میں آندھیوں کے طوفان آتے تھے اور ریت کے بگولے اٹھتے رہتے تھے۔

جنوبی عراق کا جغرافیائی ماحول اور طرزِ معاشرت آج بھی تقریباً وہی ہے جو چھ ہزار برس پیش تر تھا۔ چنانچہ سیٹن لائڈ (Seaton Lloyd) لکھتا ہے کہ:

''دریائے دجلہ اور عراق شط العرب کا سنگم بنانے سے پہلے ایک وسیع دلدلی علاقے میں پھیل کر گزرتے ہیں۔ یہاں نرسل کی جھاڑیاں اور پتلے پتلے نالے ہیں جن کے کنارے کھجور کے درخت کھڑے ہوئے ہیں۔ اس عجیب وغریب دنیا میں وہاں کے عرب باشندے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھے اپنی بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں اور چاول کی فصلوں کے درمیانی وقفے میں مچھلیاں بھالے سے شکار کرتے اور مُرغابیاں جال سے پکڑ کر شہروں میں فروخت کرتے ہیں۔ ان کا طرزِ زندگی اور ماحول اِس علاقے کے قدیم ترین اور قبل از تاریخ باشندوں سے بہت مشابہ ہے۔ ان کے شیوخ کے کلیسا نما مہمان خانے جو فقط نرسل اور گارے سے بنے ہوتے ہیں اہلِ سُومیر کے چھ ہزار برس پرانے معبدوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔''

راقم الحروف نے اپنے سفرِ عراق کے دوران میں ایسے کئی مناظر دیکھے بلکہ نرسل کے بنے ہوئے ایک مہمان خانے میں عربوں کی روایتی مہمان نوازی سے لطف اندوز بھی ہوا۔

لیکن سومیری بڑے جفاکش، ذہین اور ہنرمند لوگ تھے۔ انھوں نے اپنے ماحول سے ہار نہیں مانی بلکہ اس کو اپنا مطیع بنالیا۔ انھوں نے جنگلوں کو کاٹا، دلدلوں کو خشک کیا اور بستیاں آباد کیں اور کاشت کاری کرنے لگے۔ ڈیلٹا کی زمین بہت زرخیز تھی۔ گو بارش بہت کم ہوتی تھی لیکن یہ کمی دریائے فرات پوری کر دیتا تھا۔ چنانچہ دنیا کی پہلی نہر جس کا ذکر کسی نوشتے میں آیا ہے سومیر ہی میں کھودی گئی تھی۔ یہ نہر عراق میں اب بھی موجود ہے اور اس کا نام الغرات ہے۔ اس نہر کو ریاست لگاش کے بادشاہ نے تقریباً پانچ ہزار برس گزرے اس لیے کھدوایا تھا کہ دریائے فرات کے پانی پر اُمّہ (جوخا) کی ہمسایہ ریاست سے آئے دن جو جھگڑا رہتا تھا وہ ختم ہو جائے۔

اہلِ سُومیر کی خوراک کھجور اور جو کی روٹی تھی۔ ان کے ہلوں میں ایک نلکی لگی ہوتی تھی تاکہ جتائی اور بوائی ساتھ ساتھ ہو جائے۔ یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس (۴۹۰ ق۔م ۔۴۲۵) نے اس علاقے کی زرخیزی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں پیداوار بیج سے

تین سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پیداوار آبادی کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ اہلِ سُومیر اپنی فاضل پیداوار کو قرب و جوار کے ملکوں کو برآمد کرتے تھے اور اس کے عوض تانبہ، چاندی، لکڑی اور دوسری چیزیں درآمد کرتے تھے۔

یہ لوگ گائے بیل، بھیڑ اور بکریاں پالتے تھے۔ مچھلی کا شکار کرتے تھے اور گوشت کھاتے تھے۔ جو کی شراب بناتے تھے اور اسے مٹی کے حقہ نما برتن میں بھر کر نلکیوں سے پیتے تھے۔ کچی اینٹوں کے ایک منزلہ اور دو منزلہ گھروں میں رہتے تھے۔ ان گھروں کی ساخت وہی تھی جو گرم ملکوں میں عموماً گھروں کی ہوتی ہے یعنی مکان کے وسط میں ایک صحن اور صحن کے چاروں طرف کمرے۔

سُومیری قوم کا سب سے عظیم تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شہر بسائے۔ شہری ریاستیں قائم کیں اور تحریر کا فن ایجاد کیا۔ تحریر جو ہمارے تجربے، خیال اور واقعے کو بقائے دوام بخشتی ہے۔ جو ابلاغ کا سب سے سہل، دیرپا اور معتبر ذریعہ ہے اور جو انسان کی ذہنی اور مادّی تخلیقات کا سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھتی ہے۔ جس جگہ سب سے پہلے یہ فن ایجاد ہوا اس کا نام ایرک (درکاء) ہے۔ فنِ تحریر کی افادیت جب سُومیر کے دوسرے شہروں پر آشکار ہوئی تو انھوں نے بھی تحریر کے فن کو اپنا لیا اور رفتہ رفتہ یہ فن دجلہ و فرات کی پوری وادی میں رائج ہو گیا۔

وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب درحقیقت عبارت ہے سُومیری تہذیب سے کیونکہ وادی کے باشندوں نے اہلِ سُومیر سے فقط لکھنے پڑھنے کا فن ہی نہیں سیکھا بلکہ ان کے دوسرے ہنر بھی اختیار کر لیے۔ ان کے رہن سہن اور نظم و نسق کے طریقوں کو اپنا لیا اور ان کے دیوی دیوتاؤں اور رسم و رواج کو قبول کر لیا۔ اہلِ سُومیر کے تہذیبی اثر و نفوذ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وادی پر سومیر کا سیاسی اقتدار گو ہزار سال سے بھی کم عرصے تک قائم رہا اور بابل و نینوا کی عظیم سلطنتوں نے سُومیر کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا لیکن سُومیری تہذیب کا سکہ بدستور چلتا رہا۔ چنانچہ عکاّدی اور اشوری ریاستوں کے قانون قاعدے اور معیشت و معاشرت کے طور طریقے بدستور وہی رہے جو سُومیریوں نے وضع کیے تھے۔

تہذیب سے تمدّن تک

تب انو نے پاکیزہ مقامات پر پانچ شہر بسائے اور
ان کو نام دیے اور وہاں عبادت کے مرکز قائم کیے۔
ان میں پہلا شہر اریڈو تھا۔
اسے پانی کے دیوتا اِن کی کے حوالے کیا گیا۔
لوح نیفر: سیلابِ عظیم

ہر تہذیب اپنے تمدّن کی پیش رو ہوتی ہے۔ تہذیب کے لیے شہر، دیہات، صحرا اور کوہستان کی کوئی قید نہیں کیونکہ تہذیب معاشرے کی اجتماعی تخلیقات اور اقدار کا نچوڑ ہوتی ہے اس لیے تہذیب کے آثار ہر معاشرے میں ملتے ہیں۔ خواہ وہ غاروں میں رہنے والے نیم وحشی قبیلوں کا معاشرہ ہو یا صحراؤں میں مارے مارے پھرنے والے خانہ بدوشوں کا معاشرہ ہو۔ چنانچہ تہذیب اس زمانے میں بھی موجود تھی جب انسان پتھر کے آلات واوزار استعمال کرتا تھا اور جنگلی پھلوں اور جنگلی جانوروں کے شکار پر زندگی بسر کرتا تھا۔ اسپین اور فرانس کے غاروں کی رنگین تصویریں اور مجسمے اب سے چالیس، پچاس ہزار برس پیش تر کے انسان کے حسنِ عمل اور عملِ حسن کا نادر نمونہ ہیں۔

لیکن تمدّن کی بنیادی شرط شہری زندگی ہے۔ تمدّن اسی وقت وجود میں آتا ہے جب شہر آباد ہوتے ہیں۔ دراصل تمدّن نام ہی ان رشتوں کی تنظیم کا ہے جو شہری زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ خواہ یہ تنظیم انسان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتی ہو یا انسان اور مادّی چیزوں کے باہمی ربط سے وابستہ ہو۔ یہی تنظیم آگے چل کر ریاستی نظام کی اساس بنتی ہے۔ تحریر کا رواج بھی

تمدن ہی کا مظہر ہے کیونکہ وہ معاشرہ جو فنِ تحریر سے ناواقف ہو مہذب کہا جاسکتا ہے لیکن متمدن نہیں کہا جاسکتا۔

پرانے زمانے میں یوں تو شہر ہر جگہ دیہات ہی کی ترقی یافتہ شکل ہوتے تھے لیکن شہر اور دیہات میں آبادی کی کمی بیشی کے علاوہ کیفیتی فرق بھی پایا جاتا تھا۔ان دونوں انسانی تنظیموں کے سماجی تقاضے اور ترکیبی عناصر جدا جدا اور ان کے ماحول و مشاغل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔زراعت زمین چاہتی ہے۔وسیع اور کشادہ زمین،فصلوں اور درختوں کو جھولا جھلانے والی زمین،کھیتوں سے سونا اگلنے والی زمین،چرواہوں کے بانسری کے گیتوں اور پرندوں کی چہچہاوٹوں سے شادکام اور مسرور زمین۔اس کے برعکس شہر زراعت کا دشمن ہوتا ہے۔وہ زمین کے سینے پر پتھر اور اینٹوں کا انبار رکھ دیتا ہے اور سڑکیں اس کے بدن میں لوہے کی گرم سلاخیں بن کر پیوست ہو جاتی ہیں۔زراعت زمین کو پھلوں،پھولوں اور پتیوں کے رنگ برنگے زیوروں سے سجاتی سنوارتی ہے۔شہر زمین کا زیور اتار لیتا ہے۔اس کا سہاگ لوٹ لیتا ہے۔

اس کے باوجود شہر انسانی ہنرمندی کا شاہکار ہے۔شہر میں انسان کی روحِ تخلیق نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔شہر علم و حکمت کا،صنعت و حرفت کا،تجارت اور سیاست کا مرکز ہوتا ہے،شہر انسان کے عقل و شعور کا افق وسیع کرتا ہے،اُسے جینے کے قرینے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے سلیقے سکھاتا ہے۔

شہر کی ابتدا

ابتدا میں شہر تجارتی مرکز ہوتے تھے یا مذہبی زیارت گاہیں یا دونوں۔ان کی جائے وقوع عام طور پر کوئی اہم گزرگاہ ہوتی تھی۔مثلاً کوئی بستی کسی دریا کے کنارے یا کسی شاہراہ پر آباد ہے۔اب اس راہ سے آنے جانے والے قافلے لامحالہ وہاں پڑاؤ ڈالیں گے یا کشتی کے مسافر وہاں اتریں گے، گاؤں والوں سے خوراک کا سامان خریدیں گے اور مبادلے میں اپنا مال ان کے ہاتھ فروخت کریں گے۔اس آمدورفت اور خرید و فروخت کے باعث گاؤں میں باقاعدہ تجارت کا آغاز ہوگا۔ دکانیں کھلیں گی،بازار قائم ہوں گے۔یہ دیکھ کر آس پاس کے ہنرمند،صناع اور بیوپاری وہاں آ

آ کر آباد ہوں گے۔ قرب و جوار کی مصنوعات سے تجارتی قافلے ترتیب دیے جائیں گے اور سوداگر دور دراز کا سفر کریں گے۔ آبادی بڑھے گی تو گاؤں کی آس پاس کی زمینوں پر نئی بستیاں بس جائیں گی۔ جلاہوں کی بستیاں، رنگ ریزوں کی بستیاں، ٹھٹھیروں کی بستیاں، سناروں کی بستیاں، معماروں کی بستیاں، موچیوں کی بستیاں، سوداگروں کی بستیاں۔ اس طرح گاؤں پھیلتے پھیلتے شہر بن جائے گا اور یہ بستیاں شہر کے محلوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

عراق اور ایران کا تو ذکر ہی کیا ہمارے ملک میں بھی قریب قریب سبھی پرانے شہر اسی طرح آباد ہوئے ہیں۔ لاہور، ملتان، کراچی اور پشاور وغیرہ ایک زمانے میں دیہات ہی تھے۔ مثلاً سو سال پیش تر تک باغبان پورہ، مغل پورہ، مزنگ، بادامی باغ، مصری شاہ اور اچھرہ وغیرہ لاہور کے مضافاتی گاؤں تھے بلکہ پٹواری اور پولیس کے کاغذات میں اب تک ان علاقوں کو موضع ہی لکھا جاتا ہے لیکن لاہور نے ترقی کی تو یہ موضعے شہر کا جز بن گئے۔ البتہ آبادی کے بیچ میں اِکا دُکا کھیت اب بھی عہدِ رفتہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہی صورت کراچی کی ہے جو دو سو سال پہلے تک فقط مچھیروں کی ایک بستی تھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی قبیلہ کسی دریا کے کنارے آباد ہوا۔ قبیلے کے پروہت نے جو عام طور پر قبیلے کا سب سے بزرگ آدمی ہوتا تھا اپنے دیوتا کے لیے گھاس پھوس کا ایک مندر بنایا۔ حسنِ اتفاق سے عقیدت مندوں کی مرادیں پوری ہونے لگیں اور دیوتا کی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی۔ جاتریوں کی آمد و رفت بڑھی تو سودا بیچنے والوں نے مندر کے آس پاس چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول لیں۔ تیوہاروں اور میلوں پر ہزاروں مرد عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پروہت کا کاروبار چمکا۔ قربانی اور چڑھاوے میں اسے دنیا بھر کی چیزیں مفت ملنے لگیں۔ غلہ، تیل، گھی، گائے، بیل، بھیڑ، بکری، کپڑے، زیور، غرضیکہ مندر میں چیزوں کا ڈھیر لگ گیا۔ سامان پروہت اور اس کے چیلوں چانٹوں کے استعمال سے کہیں زیادہ ہوتا تھا لہٰذا پروہت نے ان چیزوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ جس دیوتا کے طفیل یہ دولت مفت ہاتھ آئی تھی اس کے رہنے کے لیے مندر کی نئی عمارت بنوائی۔ رفتہ رفتہ آس پاس کی زمینیں بھی پروہت کے قبضے میں آ گئیں۔ مندر کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا اور دیوتا کا مندر اپنے علاقے کا سب سے بڑا

مندر اور سب سے اہم تجارتی، سیاسی اور مذہبی مرکز بن گیا۔ وادیِ دجلہ وفرات کے اکثر پرانے شہر اسی طرح وجود میں آئے۔ وہاں کے مندروں کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سُومیر میں اب تک مٹی کی جتنی لوحیں کھدائی میں نکلی ہیں (ڈھائی لاکھ) ان میں سے ۹۵ فیصد مندروں کے حساب کتاب سے متعلق ہیں۔ فقط پانچ فیصد ایسی لوحیں ہیں جن پر گیت، دعائیں اور داستانیں تحریر کی گئی ہیں۔

وادیِ دجلہ وفرات کے تمام قابلِ ذکر شہر اور ان کے مضافات کسی نہ کسی دیوتا کی ملکیت ہوتے تھے۔ مثلاً اریدو میٹھے پانی کے دیوتا انکی کی ملکیت تھا۔ اریک سب سے بڑے دیوتا انو کی ملکیت تھا۔ نیفر اِن لیل (ہوا کا دیوتا) کی ملکیت تھا۔ لگاش اِن لیل کے بیٹے نن گرسو کی ملکیت تھا اور اُر چاند دیوتا ننا کی ملکیت تھا۔ ''انو، اِن لیل، ان کی اور نن ہورسگ نے جب کالے بالوں والوں کی تشکیل کر لی تو ہریالی زمین سے پھوٹ نکلی''۔ ان شہروں کے دیوتا کی ملکیت ہونے کے معنی دراصل دیوتا کے مندر یعنی پروہتوں کی ملکیت کے تھے۔ شہری زندگی کا مرکز اور محور یہی مندر تھے۔ شہر کی سب سے بڑی اور سب سے شان دار عمارت مندر ہی کی ہوتی تھی۔ مندر کے خزانے میں سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کے علاوہ ضروریاتِ زندگی کا وافر ذخیرہ جمع رہتا تھا۔ مثلاً اناج، روغنیات، شراب، کھجور، خشک مچھلی، اُون، کھال، تارکول کے پیپے، بخور، آلاتِ زراعت وصنعت اور بیج۔ ان سب چیزوں کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا اور ان کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ رقص وسرود کے مذہبی مناسک کی ادائیگی کی خاطر دیوداسیاں مقرر تھیں۔ مندر کے باورچی خانے، لنگر خانے، اور شراب کی بھٹیوں کی دیکھ بھال بھی دیوداسیوں ہی کے سپرد تھی۔

عراق کے قدیم شہر

علمائے آثار کو عراق میں اب تک درجنوں قدیم شہروں کے سراغ مل چکے ہیں۔ ان میں بعض اہم شہر یہ ہیں۔ اریدو (ابوشہرین)، اُر (مقیر)، لارسا (سن کرہ)، اِریک (درکا)، بادطبرا (تل المدائن)، لگاش (تلو)، اُمہ (جوخہ)، اراب (بسایا)، نیفر، اکشاک، کِش (الاحمر)، سپر (ابوحبہ)، شروپک (فارا)، لرک (تل ولایہ) اور اسین (الجریات)۔ عکاد کا سب سے بڑا شہر بابل تھا جو

وادیِ دجلہ وفرات کی پہلی عظیم سلطنت کے صدر مقام کی حیثیت سے اقصائے عالم میں مشہور ہوا۔ اَسُور کے اہم شہر اَشور، نینوا اور نمرود (کالح) تھے۔

ان شہروں میں عام طور پر تین طبقے آباد تھے۔ سب سے اونچا طبقہ عمیلو کہلاتا تھا (شاید عامل اسی سے مشتق ہے) اس طبقے میں امرا، مندر کے پروہت اور نویسندے شامل تھے۔ نویسندوں کو نظم ونسق میں بڑا دخل تھا کیونکہ تحریر کا فن اس وقت تک بہت کم لوگوں کو آتا تھا۔ عدالتوں کے حاکم اور فوج کے افسر بھی عمیلو طبقے ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

دوسرا طبقہ مشکینو کہلاتا تھا۔ یہی لفظ عربی زبان میں منتقل ہوکر مسکین بن گیا۔ اس طبقے میں بیوپاری، کاری گر اور دستکار شامل تھے۔ ان کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہ تھی اور نہ یہ لوگ فوج میں بھرتی ہو سکتے تھے۔

تیسرا طبقہ غلاموں کا تھا جن کے ''حقوق وفرائض'' پر ہم حمورابی کے قانون کے سلسلے میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

گاؤں میں بھی تین طبقے تھے۔ اوّل شرفا کا جن کا امتیازی نشان رتھ تھا۔ دوسرا طبقہ مالیوں، چرواہوں اور سائیسوں کا تھا اور تیسرا کاشت کاروں اور کھیت مزدوروں کا۔ فوجی سپاہی عام طور پر اسی تیسرے طبقے سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ زمین کا لگان جنس میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے ہر گاؤں میں پیدائش اور موت کا ایک رجسٹر ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۵ ویں صدی قبلِ مسیح کا ایسا ہی ایک رجسٹر ال عیلاخ کی کھدائی میں دستیاب ہوا ہے۔ اس رجسٹر میں ان سب دیہاتیوں کی تفصیلات درج ہیں جو شہر ال عیلاخ کے ماتحت تھے۔ بعض رجسٹر ایسے بھی ہیں جن میں ہر گاؤں کے مکان کا نمبر شمار اور مالکِ مکان کا سماجی رتبہ اور پیشہ بھی درج ہے۔

سُومیر کی زمین معدنیات سے خالی تھی۔ وہاں نہ تانبا ہوتا تھا نہ ٹن، نہ سونا نہ چاندی، حتیٰ کہ کھجور کے علاوہ کوئی لکڑی بھی میسر نہ تھی مگر اہلِ سُومیر کے پاس اناج کی افراط تھی اور اناج ایسا مال تھا جس کے عوض وہ ہر قسم کی دھات اور لکڑی دوسرے ملکوں سے درآمد کر سکتے تھے۔ چنانچہ تانبہ اناطولیہ اور آرمینیا اور آذربائیجان سے، کانسہ عمان سے، ٹن ایران اور افغانستان سے، چاندی کوہ تاؤراس (اناطولیہ) سے، سونا، ہاتھی دانت اور قیمتی لکڑی وادیِ سندھ سے اور

دیواروں کی لکڑی لبنان سے آتی تھی۔ اہلِ سُومیر ان خام اشیا سے نہایت عمدہ قسم کی مصنوعات تیار کرتے تھے اور پھر انھیں دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ سُومیر دراصل اپنے زمانے کا برطانیہ یا جاپان تھا۔

دراصل اشیائے خام کی قلت کسی محنتی اور ہوشیار قوم کے لیے کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتی بلکہ حوصلے اور ہمت کی آزمائش انھیں نامساعد حالات ہی میں ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے قویٰ کمزور اور دل و دماغ ضعیف ہوتے ہیں وہ حالات کی سخت گیریوں اور جفاطلبیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ البتہ جو قومیں کارزارِ ہستی میں جہد اور جفاکشی کو اپنا شعار بناتی ہیں وہ ترقی کی دوڑ میں دوسرے پر سبقت لے جاتی ہیں۔ سُومیر ایسے ہی جیالوں کی بستی تھی۔ چنانچہ محل اور معبد کی سخت گیریاں بھی اہلِ سومیر کی تخلیقی اور صنعتی صلاحیتوں کو کچل نہ سکیں۔ اسی بنا پر پروفیسر وولی کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

> ''مقامی حالات ہی نے اہلِ سُومیر کو مہذب بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ برآمد کے لیے مصنوعات تیار کرتے تھے تاکہ اپنی ملکی ضروریات کے لیے خام مال حاصل کر سکیں۔ وہ دھاتوں کے سب سے اچھے کاری گر تھے حالانکہ ان کے ملک میں دھاتیں ناپید تھیں''۔

سُومیر کے شہر تجارتی اور صنعتی شہر تھے۔ ہر پیشے کی اپنی ایک برادری (گلڈ) ہوتی تھی اور اس برادری میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پیشے آبائی ہوتے تھے اور نسلاً بعد نسلٍ اولاد میں منتقل ہوتے رہتے تھے اس لیے سونار کا بیٹا عام طور پر سونار اور بڑھئی کا بیٹا بڑھئی ہوتا تھا۔ بعض پیشے ایسے تھے جن کے لیے چھوٹی دکانیں یا کوٹھریاں بھی ہوتی تھیں مثلاً ٹھٹھیرے یا درزی کا پیشہ، چنانچہ کپڑا بننے والے عام طور پر کارگاہوں میں کام کرتے تھے۔ اکثر و بیش تر کارگاہیں تو مندر کی ملکیت ہوتی تھیں لیکن بعض بیوپاریوں کی اپنی نجی کارگاہیں بھی تھیں۔ مندر کی کارگاہوں میں مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ کاری گروں کو اُجرت چاندی میں ادا کی جاتی تھی۔ گو اس وقت تک سکے ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن چاندی کا ایک خاص وزن جس پر ٹھپہ لگا ہوتا تھا بطور سکہ استعمال ہوتا تھا۔

وادیِ دجلہ وفرات کے قدیم باشندوں کے آلات اوراوزار عام طور پر کانسے کے ہوتے تھے۔کانسہ تانبے،لوہے یا سونے چاندی کی مانند کوئی منفرد دھات نہیں ہے بلکہ ٹن اور تانبے کا مرکب ہے۔ کانسے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ٹن اور تانبے سے زیادہ سخت،مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے اور اس کا رنگ بھی جلدی خراب نہیں ہوتا۔ پھر کانسے کا نقطۂ تحلیل(Melting point) تانبے سے کم ہوتا ہے مگر اس مرکب کی تیاری ایک کیمیاوی عمل ہے اور جب تک تانبے اور ٹن کو آٹھ اور ایک کی نسبت سے پگھلا کر آپس میں ملایا نہ جائے کانسہ نہیں بن سکتا۔کانسے کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ وادیِ کے لوگوں نے تجربے کر کے کانسہ بنانے کا کیمیاوی طریقہ معلوم کرلیا تھا۔ چنانچہ ان کے ہل، ہنسئے،ہتھوڑے اور کدال، نیزے اور کٹار سب کانسے کے ہوتے تھے اسی لیے وادیِ دجلہ وفرات کی تہذیب کو ہم کانسے کی تہذیب کہتے ہیں۔ بعد میں یہی کانسے کی تہذیب مصر،ایران،چین اور وادیِ سندھ میں بھی رائج ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ لوہے کا زمانہ دنیا میں ساتویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں شروع ہوا یعنی امن و جنگ کے اکثر آلات واوزار لوہے کے بننے لگے لیکن ان کی تکنیک بدستور وہی رہی جو کانسے کے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی۔ چنانچہ تین ہزار قبلِ مسیح سے اٹھارویں صدی عیسوی تک یعنی تقریباً پانچ ہزار برس تک انسانی معاشرے نے تکنیکی اعتبار سے کوئی بنیادی ترقی نہیں کی۔گو کانسے کی جگہ لوہے نے لے لی لیکن جو آلات واوزار شروؔ قین اور حمورابی کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے وہی ۱۸ اویں صدی عیسوی تک استعمال ہوتے رہے۔تب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور انسانی معاشرہ ایک نئے تہذیبی دور میں داخل ہوا۔

سُومیر اور بابل کے لوگ بین الاقوامی تجارت میں بڑے ماہر تھے۔اس زمانے میں جب آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے،راستے نہایت خطرناک تھے اور کوئی بین الاقوامی قانون یا ادارہ تاجروں کی جان اور مال کے تحفظ کی ضمانت کے لیے موجود نہ تھا دور دراز ملکوں کے ساتھ کاروبار کرنا بہت خطرناک تھا لیکن سومیر اور بابل کے بیوپاریوں نے ان خطرات کی پروا نہ کی اور اناطولیہ، سندھ، کنعان، مصر اور ایران مختصر یہ کہ اس وقت کی پوری مہذب دنیا کا سفر کرتے رہے۔ خام مال کی خریداری اور مصنوعات کی فروخت ان کا بنیادی مقصد ہوتا تھا۔ دنیا کی اہم

تجارتی منڈیوں میں ان کی نوآبادیاں قائم تھیں اوران کے گماشتے خریدوفروخت کی نگرانی کرتے تھے۔مثلاً شام میں ان کی مشہور نوآبادی قطنہ تھی۔رفتہ رفتہ اس نوآبادی نے اتنافروغ پایا کہ ڈھائی ہزارقبلِ مسیح میں وہاں اُر کے تاجروں نے اپنے ہم قوموں کی عبادت کے لیے اُرکی دیوی نن ایگل (Nin Egal) کامندربھی تعمیر کرلیا۔لکڑی کے تاجروں نے ایسی ہی ایک نوآبادی لبنان میں دریائے فرات کے کنارے ال عیلاخ (Al Alakh) کے مقام پر بسائی تھی۔یہاں سے دیودار کی لکڑی دریا کی راہ سے بابل اور سومیر لائی جاتی تھی۔

اُشور، بابل اور سومیر کے فرماں رواؤں کو کبھی کبھی اپنے تاجروں کے معاشی مفاد کی خاطر فوجی مہمیں بھی بھیجنی پڑتی تھیں۔جس طرح حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کوسندھ بھیجا یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں برطانوی فوجیں تجارتی منڈیوں کی حفاظت کی خاطر ہر جگہ دھاوے کیا کرتی تھیں۔

چنانچہ شرو قین اوّل نے عکادی تاجروں کے تحفظ کی خاطر اپنا ایک لشکر ایک بار اناطولیہ بھیجا تھا۔اناطولیہ کی کھدائیوں میں کُل تیپ اور بوگازکوئی کے مقام پر شہر پناہ کے باہر عکادی اور سومیری تاجروں کی بستیوں کے بھی آثار ملے ہیں۔ان کے محلّے کو قروم کہتے تھے۔

اسی قسم کے قروم وادی کے شہروں میں بھی ہوتے تھے جہاں بیرونی تاجر آ کر قیام کرتے تھے چنانچہ اُر کے قروم اور مقبروں کی کھدائی میں موہن جو دڑو کے زمانے کی سندھی مصنوعات برآمد ہوئی ہیں۔مثلاً بادشاہ میس کلم ڈگ (۲۷۵۰ق۔م) کی قبر میں سونے کی ایک پن ملی ہے جس کے ایک سرے پر بندر بنا ہے اور پتھر کے کندہ شدہ مرتبان بھی نکلے ہیں جو کوتی (بلوچستان) کے بنے ہوئے ہیں۔ان کے علاوہ اُر اور دوسرے مقامات پر ۲۴ ویں صدی قبلِ مسیح کی بہ کثرت منقش اور مصور مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو وادی سندھ کے تاجر اپنے ساتھ لے جاتے تھے لیکن وادیِ سندھ سے تجارت اور آمدورفت کا یہ سلسلہ سولھویں صدی قبل مسیح میں اچانک ختم ہوگیا۔یہی وہ زمانہ ہے جب دجلہ وفرات کی وادی پر کسدیوں کا غلبہ ہوا تھا۔غالباً اسی زمانے میں آریاؤں نے وادی سندھ کی تہذیب کو پامال کیا تھا جس کے باعث وادیِ سندھ اور وادیِ فرات کے تجارتی تعلقات منقطع ہوگئے تھے۔

وادیِ دجلہ وفرات کے لوگوں نے کانسہ، سونا چاندی اور ادنیٰ مصنوعات کے علاوہ فنِ تعمیر میں بھی بڑی ایجادیں کیں۔ حالانکہ ان کو نہ پتھر میسر تھا اور نہ ان کے ملک میں عمدہ لکڑی ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم لکھے چکے ہیں ابتدا میں ان کے جھونپڑے نرسل کی چٹائیوں ہی سے بنتے تھے بلکہ جنوبی عراق میں دیہاتیوں کے گھر اب تک چٹائیوں ہی کے ہوتے ہیں۔ دراصل کھجور اور نرسل کو ان کی گھریلو زندگی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو بانس اور ناریل کو مشرقی پاکستان میں حاصل ہے۔ جنوبی عراقیوں کا طریقۂ خانہ سازی یہ ہے کہ وہ پہلے نرسل کی بہت سی شاخوں کو جوڑ کر ان کے گٹھے بناتے تھے۔ یہ گٹھے مخروطی ہوتے تھے۔ پھر دو گٹھوں کو آمنے سامنے زمین میں گاڑ کر ان کے مخروطی سروں کو آپس میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے کمان کی شکل محرابی ہو جاتی ہے۔ جتنی لمبی جھونپڑی بنانی ہو اسی لحاظ سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی محرابی گٹھے گاڑ دیے جاتے ہیں۔ پھر نرسل کے پتلے پتلے گٹھوں کو محرابی گٹھوں سے افقاً باندھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک سرنگ نما ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے۔ تب اس ڈھانچے کو نرسل کی چٹائیوں سے منڈھ دیتے ہیں۔

لندن کے برٹش میوزیم میں، ہم نے پتھر کی ایک سل پر ایسے ہی ایک مکان کا نقش کندہ دیکھا۔ یہ نقش تقریباً چھ ہزار برس پرانا ہے۔ اس میں کئی جانور مکان کے دونوں سمت کھڑے ہیں۔

اہلِ عراق نے فنِ تعمیر میں جو کمال حاصل کیا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ مثلاً محراب، گنبد اور ستون جن کے سہارے متمدن دنیا نے اپنے قصر وایوان تعمیر کیے، قدیم عراقیوں ہی کی ایجاد ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان سب کی بنیاد وہی نرسل کا جھونپڑا ہے جسے فنِ تعمیر کے اصول سے ناواقف خانہ بدوشوں نے ہزاروں سال پیش تر اپنا سر چھپانے کے لیے بنایا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ نرسل کے گٹھوں، کھپچیوں اور چٹائیوں کی قدرتی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس سے محراب، گنبد اور ستون خود بخود بن جاتے ہیں۔ نرسل کی کمانیوں کو جھکاؤ تو محراب بن جاتی ہے اور جھونپڑی محراب دار سرنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ محرابی ہونے کی وجہ سے چھت پر پانی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اس طرح ابتدا میں محراب کی ایجاد ہوئی۔ چنانچہ سب سے قدیم محرابیں عراق کے پرانے کھنڈروں ہی میں ملی ہیں۔ مثلاً شہر نیفر کی زمین دوز نالی کی محراب جو کچی اینٹوں

سے بنی ہے۔ شہر اُر کے ایک شاہی مقبرے کا دروازہ بھی محرابی ہے۔ اس محراب کی جڑائی پکّی اینٹوں سے ہوئی ہے۔ شہر لارسا کے ایک مکان میں بھی ایک محرابی دروازہ ملا ہے جو پکّی اینٹوں سے بنا ہے اور اُر میں کسدی دَور کے ایک معبد میں پندرھویں صدی قبلِ مسیح کی ایک پکّی محراب موجود ہے اس محراب کی جڑائی رال سے ہوئی ہے۔

گنبد کی ایجاد کے محرک بھی عراق کے قدرتی حالات تھے۔ مکان بنانے کے لیے جس قسم کی لکڑی درکار ہوتی ہے دجلہ وفرات کی وادی اس سے خالی ہے۔ لامحالہ وہاں کے باشندوں کو چھت کی ساخت ایسی بنانی پڑی جس میں لکڑی بالکل استعمال نہ ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ گنبد چونکہ اندر سے کھوکھلا اور اونچا ہوتا ہے اس لیے گنبد دار عمارت گرمیوں میں ٹھنڈی رہتی ہے اور دیکھنے میں بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اُر کی کھدائی میں ۲۷ سو قبلِ مسیح کا ایک شاہی مقبرہ ملا ہے جس میں ایک گنبد اب تک صحیح سلامت ہے۔ غالباً یہ دنیا کا سب سے پرانا گنبد ہے۔ اس گنبد کو پتھر کے ٹکڑوں اور مٹّی کے گارے سے بھرا گیا ہے۔ اسی طرح اُر کے زیگورات کی چھت پر ایک گنبد دار حوض ملا ہے۔ یہ گنبد سلطان اُرنمو (۱۲۵۰ ق ۔م) نے بنوایا تھا۔ اس گبند کی جڑائی اینٹوں سے ہوئی ہے۔

کچھ عرصے پہلے تک ماہرینِ آثار کا خیال تھا کہ وادیِ دجلہ وفرات کے قدیم باشندے ستون بنانا نہیں جانتے تھے۔ یہ خیال اتنا پختہ ہوگیا تھا کہ جب کسی ماہرِ آثار نے نیفر کے مقام پر پندرھویں صدی قبلِ مسیح کی ایک ایسی عمارت دریافت کی جس کے بڑے کمرے میں ستونوں کی دورویہ قطار کھڑی تھی تو علمائے آثار نے اس کے دعوے کی تردید کردی اور اس کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ ان کی کتابوں میں یہی لکھا تھا کہ اس خطّے میں ستونوں کا رواج تیسری صدی قبل مسیح میں یونانی فتوحات کے بعد شروع ہوا۔ حالانکہ جس ملک میں قدرت خود کھجور کے سڈول ستون فراہم کرتی ہو وہاں ستونوں کا استعمال حیرت انگیز بات نہیں۔ پھر ایسا ہوا کہ اسی قسم کے ستون مختلف مقامات پر برآمد ہونے لگے۔ مثلاً ارک میں تین ہزار قبلِ مسیح کے کئی بڑے بڑے ستون دریافت ہوئے۔ اِن ستونوں کی موٹائی سات آٹھ فٹ تھی۔ یہ ستون کچی اینٹوں کے تھے اور ان پر کاشی کے نہایت خوبصورت نقش ونگار بنے تھے۔ ایسے ہی کئی ستون کیش میں بھی برآمد

ہوئے اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ العبید کے چھوٹے معبد میں کھجور کے تنوں کے قدرتی ستون پائے گئے۔ ان ستونوں پر تانبے کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ ان ستونوں کو بادشاہ آ ئنی یادا نے ۲۷ سو قبلِ مسیح میں بنوایا تھا۔ تب دنیا کو معلوم ہوا کہ ستون دراصل کھجور کے تنوں کی نقل ہیں اور ستون کا استعمال سب سے پہلے عراق میں ہی ہوا تھا نہ کہ یونان میں۔

جس قوم نے گنبد، محراب اور ستون ایجاد کیے اس کے لیے شاہی محلات اور عالی شان عمارتیں بنانا دشوار نہ تھا۔ چنانچہ ماری، خورسا آباد اور بابل کے شاہی محلوں کے کھنڈر ان کی ہنر مندی کے شاہد ہیں۔ مگر ان کا سب سے حیرت انگیز اور یادگار تعمیری کارنامہ زیگورات ہیں۔ اس تعمیری کارنامے پر ہم مینارِ بابل کے ضمن میں مفصل بحث کریں گے۔

شہری ریاستیں

اپنی تہذیبی وحدت کے باوجود وادیِ دجلہ و فرات کا خطہ بہت سی شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان میں بعض چھوٹی تھیں اور بعض بڑی۔ مثلاً لگاش کی ریاست کا رقبہ فقط ۱۸ سو مربع میل تھا اور آبادی ۳۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے برعکس اریک اور اُر کی شہری ریاستیں اپنے عہدِ عروج میں پورے سُومیر پر حاوی تھیں۔ ہر شہری ریاست ایک مرکزی شہر اور گردونواح کے دیہات اور قصبوں پر مشتمل تھی۔

شہری ریاست اہلِ سومیر کی بڑی تاریخی اور عہد آفریں ایجاد ہے۔ یہ شہری ریاستیں تقریباً تین ہزار قبلِ مسیح میں وجود میں آئیں جبکہ یونانی تہذیب کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کے باوجود مغربی مورخ اب تک یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ شہری ریاست کا تصور دنیا کو اہلِ یونان نے عطا کیا ہے۔ حالانکہ شہری ریاستیں سومیر میں یونان سے دو ہزار برس قبل قائم ہو چکی تھیں۔ یہی وہ سیاسی ادارہ تھا جس نے آگے چل کر ریاست اور سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔

شہری ریاست کے قیام کے متعدد عوامل اور محرکات تھے۔ اوّل شہری مندر کی مرکزیت۔ دوم سومیری سماج میں طبقات کا پیدا ہو جانا۔ سوئم شہروں کی باہمی رقابتیں اور دشمنیاں اور چہارم سومیر میں نہروں کا نظام۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سومیر کے مندر کس طرح آہستہ آہستہ اپنے علاقے کے سب سے دولت مند اور بااثر ادارے بن گئے۔ یہ مندر اپنے قرب و جوار کے سب سے بڑے زمیندار اور سب سے بڑے بیوپاری ہوتے تھے اس لیے مندر کا اور مندر کے ساتھ شہر کا فروغ خود اس بات کی علامت ہے کہ سماج کی ''یک حجری وحدت'' یا اکائی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہاں دیہات کے اس پنچایتی نظام کی گنجائش باقی نہیں تھی جس میں آراضیاں اور ذرائع آفرینی کے دیگر ذرائع لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہوتے تھے اور ان کی ضروریات پوری کرنا سب کا مشترکہ فرض ہوتا تھا۔ اب معاشرے کا طبقاتی دور شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف کاشت کاروں، کاری گروں اور غلاموں کا طبقہ تھا اور دوسری طرف پروہتوں، بیوپاریوں، اور زمینداروں کا طبقہ۔ ان دونوں طبقوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے تھے۔ کیونکہ ان کے رشتے کی نوعیت حاکم اور محکوم کی ہو گئی تھی۔ حاکم طبقے کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ پیداوار کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قابض ہو جائیں اور محکوم طبقوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو دولت انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے پیدا کی ہے اس کو اپنے تصرّف میں لائیں۔

ظاہر ہے کہ ان طبقاتی رشتوں کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے کے لیے طاقت درکار تھی۔ یہ طاقت دو قسم کی تھی ایک ذہنی اور روحانی طاقت دوسرے فوجی طاقت۔ روحانی اور ذہنی طاقت کا سرچشمہ مندر تھا۔ چنانچہ پروہت حضرات ایسی ایسی دعائیں، گیت، روایتیں اور داستانیں وضع کرتے رہتے تھے جن سے عقیدت مندوں کو یقین آ جائے کہ دیوتاؤں نے انھیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ دن رات ان کی خدمت کرتے رہیں اور جو کام ان کے سپرد کیا جائے اسے پوری تن دہی اور دیانت داری سے سرانجام دیتے رہیں۔ دھن دولت کا لالچ نہ کریں کیونکہ یہ دنیا چند روزہ ہے بلکہ جو کچھ پیدا کریں اسے دیوتا کی امانت سمجھ کر مندر کے حوالے کر دیں۔ اسی روحانی تعلیم کا کرشمہ ہے کہ سومیر کی شہری ریاستیں دیوتا ہی کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ ابتدا کے جمہوری زمانے میں بھی اور اس زمانے میں بھی جبکہ یہ شہری ریاستیں موروثی بادشاہتوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ چنانچہ سومیر کا ہر بادشاہ خواہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہوتا، اپنے آپ کو دیوتا کا نائب اور خادم ہی خیال کرتا تھا۔ بادشاہوں کی رسمِ تاج پوشی مندروں میں ہی

ادا کی جاتی تھی اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ مندر سے تعلقات خوش گوار رہیں۔ مالِ غنیمت میں جو زر و جواہر اور غلام ہاتھ آتے تھے ان کا بڑا حصہ مندر کو بطور نذر پیش کر دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مندروں کے خزانے اتنے وافر ہو گئے کہ بعض اوقات بادشاہ مہم پر جانے سے پہلے مندروں سے جنگی قرضے حاصل کرتے تھے۔

لیکن عوام کو مطیع و فرماں بردار بنانے کے لیے مندر کی روحانی طاقت کافی نہ تھی بلکہ فوج کی مادّی قوت بھی درکار ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سومیر کے شہر برابر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ کبھی سرحدی کھیتوں کی ملکیت پر تلواریں کھنچتی تھیں، کبھی نہری پانی پر خون خرابہ ہوتا تھا، کبھی مندروں کی اندوختہ دولت پیکار کا باعث بنتی تھی، کبھی مالِ غنیمت کی خواہش مہم جوئی پر اکساتی تھی اور کبھی غلاموں کی ضرورت ہمسایہ خطوں پر حملہ کرنے کا تقاضا کرتی تھی۔

ایسی ہی ایک جنگ ۲۵۵۰ ق۔م میں سومیر کی دو ہمسایہ ریاستوں لگاش اور اُمہّ کے درمیان ہوئی۔ نزاع کا سبب ایک سرحدی اراضی تھی جس کا نام گوعدین تھا۔ عدین سومیری زبان میں چراگاہ کو کہتے ہیں۔ باغِ عدن کا تصور غالباً یہیں سے آیا ہے۔ کیونکہ انجیل کے مطابق باغِ عدن دجلہ و فرات کی وادی ہی میں واقع تھا۔ گوعدین دراصل لگاش کی ملکیت تھی لیکن اُمہّ کے انیسی (بادشاہ) نے اپنے دیوتا کے حکم سے دھاوا کیا اور گوعدین کو ہضم کر لیا۔ نہری زمین کو، نن گرسو کی دل پسند زمین کو۔ اس نے سرحد کا پتھر بھی اکھاڑ کر پھینک دیا اور لگاش میں داخل ہو گیا۔ لگاش کی فوج نے جو ''نیزوں اور بھاری ڈھالوں سے مسلح تھی اُمہ کی فوج کا مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو شکست دے دی۔

''اَن لیل کے حکم سے بادشاہ اِناتوم نے اپنا جال اُن پر پھینکا اور میدانِ کارزار ان کی لاشوں سے بھر گیا۔ جو بچ رہے اپنی جان بچانے کی خاطر اِناتوم کے روبرو زمین پر لیٹ گئے اور زار و قطار روئے۔''

اس واقعے کی یادگار وہ منقوش پتھر ہے جس میں گدھ لاشوں کو کھاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

مگر شہری ریاستوں کے قیام کا بنیادی سبب اور تعینِ حدود کا اصل محرک سومیر کا نہری نظام تھا۔ یہ شہری ریاستیں دراصل نہروں کی وجہ سے قائم ہوئیں۔ نہریں جو اہلِ سومیر کی

معاشرتی زندگی کی شہ رگ تھیں۔ ان نہروں کی بدولت وہ لوگ اتنا غلہ پیدا کر لیتے تھے کہ سال بھر آرام سے کھاتے اور فاضل پیداوار سے برآمدی تجارت کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ نہروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سومیری بادشاہ جنگی فتوحات کی مانند نئی نہر نکالنے پر بھی بہت فخر کرتے تھے اور تھا بھی یہ بہت عظیم کارنامہ کیوں کہ کسی زرعی ملک میں جہاں بارش بہت کم ہوتی ہو زندگی کا انحصار نہروں پر ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وادیٔ دجلہ و فرات میں اُسی فرماں روا کو کامیابی اور مقبولیت نصیب ہوئی جس نے نہروں کی تعمیر اور مرمت کو اپنا فرض سمجھا اور جس نے نہروں کی طرف سے غفلت برتی وہ ناکام ہوگیا۔ چنانچہ سومیری عہد کے کئی یادگاری پتھر ملے ہیں جن پر نہروں کی کھدائی کا منظر کندہ ہے اور بادشاہ سر پر مٹی کا ٹوکرا اٹھائے اس قومی کام میں شریک ہے۔

نہروں کی تعمیر، مرمت اور نگرانی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے مزدوروں، کاری گروں اور انجینیر وں کی پوری فوج درکار ہوتی ہے۔ نہر کا کھودنا، نہر کے بند کی مرمت کرنا، نہر کی وقتاً فوقتاً صفائی کرنا تاکہ تہ میں مٹی جمنے کی وجہ سے نہر پایاب نہ ہوجائے، پانی کی مقدار اور مناسب تقسیم کی نگرانی کرنا اور پھر مصارف کا حساب کتاب رکھنا تاکہ آبیانے کی وصولی میں سہولت ہو، غرضیکہ نہروں کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے بہت بڑی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے سومیر کے دس پانچ گاؤں آپس میں مل کر بھی ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ کام تو گاؤں سے بڑی طاقت ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ شہری ریاستیں اسی وجہ سے قائم ہوئیں۔ چنانچہ سر لیونارڈ وولی لکھتا ہے:

"ملک اور دریا (فرات) کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ایک مخصوص علاقے میں جس کا رقبہ نہروں کے نظام سے متعین ہوتا تھا باشندے ایک مشترکہ سیاسی وحدت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان نہروں کی منصوبہ بندی اور نگہداشت کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی علاقائی طاقت اس کام کی دیکھ بھال کرے اور یہ علاقائی طاقت تمام اختیارات کی مالک ہو۔ حالات کی منطق ہی نے دریائے فرات کے ڈیلٹا کو نہروں سے سیراب ہونے والی ایسی زرعی وحدتوں میں تقسیم کردیا جن کے نظم و

نسق کے اپنے اپنے مرکز ہوتے تھے۔ چنانچہ شہری ریاستوں کی ترقی کا سبب
سومیریوں کی مخصوص ذہنیت نہ تھی بلکہ سومیر کا طبعی کردار تھا''۔[۱]

ابتدا میں شہری ریاستیں جمہوری بنیادوں پر قائم ہوئی تھیں۔ ہر شہری ریاست کے نظم و نسق کے لیے مجلسِ شوریٰ ہوتی تھی لیکن اس مجلسِ شوریٰ میں فقط عمائدینِ شہر شریک ہو سکتے تھے۔ نہروں اور تجارتی راستوں کی نگرانی کرنا، ریاست کے اندر امن وامان قائم رکھنا، شہریوں کے باہمی اختلافات اور مقدمات کا تصفیہ کرنا مجلسِ شوریٰ کے فرائض میں داخل تھا۔ مجلسِ شوریٰ کے علاوہ روزمرّہ کے کاموں کے لیے بزرگانِ شہر کی ایک مجلسِ اعلیٰ ہوتی تھی۔ ان دونوں ایوانوں میں فیصلے کثرتِ رائے کی بجائے اتفاقِ رائے سے ہوتے تھے۔

یہ محدود جمہوریت زیادہ دن نہ چل سکی۔ دولت اور دولت آفرینی کے ذرائع جب چند ہاتھوں میں سمٹنے لگے تو جمہوری نظام کی بنیاد کمزور ہوگئی۔ شہری ریاستوں کی باہمی آویزشوں نے بھی شخصی حکومت کے قیام میں مدد دی۔ کیونکہ جنگ کے موقع پر تمام اختیارات لامحالہ سپہ سالارِ فوج کے سپرد کرنے پڑتے تھے۔ سومیری زبان میں اس شخص کو لوگل یعنی ''بڑا آدمی'' کہتے تھے۔ ابتدا میں لوگل کا عہدہ ''باندہ'' یعنی عارضی ہوتا تھا اور جنگ کے ہنگامی حالات گزر جانے پر تمام اختیارات مجلسِ شوریٰ کو منتقل ہو جاتے تھے مگر ہنگامی حالات کے اختتام کا فیصلہ لوگل باندہ ہی کرتا تھا۔ چنانچہ یہ ہنگامی حالات رفتہ رفتہ عارضی سے مستقل ہونے لگے۔ کیونکہ لوگل باندہ کا فائدہ اسی میں تھا اور بالآخر یہی لوگل باندہ بادشاہ بن گئے لیکن شخصی حکومتیں قائم ہونے کے بہت دن بعد تک مجلسِ شوریٰ کا نظام قائم رہا اور قیاس یہی کہتا ہے کہ بادشاہ کے لیے مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرنا آسان نہ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ گل گامش کی داستان میں گل گامش کے اس طرزِ عمل کی مذمّت کی گئی ہے کہ مجلسِ شوریٰ کو خاطر میں نہیں لاتا۔

''گل گامش ایوانِ شوریٰ میں زبردستی گھس آیا ہے۔ حالانکہ یہ عمارت
شہریوں کی ملکیت ہے۔''

بعض دستاویزوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں مندر کا پروہت بادشاہ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ یہ مہا پروہت سنگا یا سنگو کہلاتا تھا اور اس کے نائب یا وزیر کا لقب نو باندہ

تھا۔ سنگا جو لوگل (بادشاہ) بھی تھا مندر ہی کے احاطے میں رہتا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد لوگل اور سنگا کے عہدے الگ الگ ہو گئے۔ سنگا نے مندر اور اس کی املاک کا نظم و نسق سنبھال لیا اور لوگل نے شہری ریاست کے نظم و نسق کی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔ لوگل اپنے خاندان کے ساتھ مندر سے الگ ایک محل میں رہتا تھا۔ اس عمارت کو ایگل (بیتِ عظیم) کہتے تھے۔ چنانچہ کیش اور اریدو میں ایسے محل برآمد ہوئے ہیں جن کے گرد موٹی موٹی چہار دیواریاں کھنچی ہیں۔

بادشاہ ریاستی فوج کا سپہ سالار، عدالتِ عالیہ کا سربراہ اور پروہتوں کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ مندر کی عمارت کی مرمت اس کا سب سے مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سومیر، عکاد اور اشور سے ایسی لاتعداد تحریریں اور منقوش مناظر برآمد ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ مندر کی عمارتوں کی تعمیر اور مرمت کے کاموں میں برابر شریک ہوتے تھے اور مندر کی آرائش و زیبائش میں اضافہ کرنا اپنے لیے باعثِ برکت و افتخار سمجھتے تھے۔ اس طریقۂ کار کی سیاسی مصلحت اندیشیاں بالکل واضح ہیں۔

عراق کے قدیم مورخ اپنے ملک کی تاریخ کو دو اَدوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق پہلا دَور سیلابِ عظیم پر ختم ہوا اور دوسرا دور سیلابِ عظیم کے بعد شروع ہوا۔ یہ وہی سیلابِ عظیم ہے جو سامی روایتوں میں منتقل ہو کر طوفانِ نوح بن گیا۔ خوش قسمتی سے عراق کی کھدائی میں لوحوں پر کندہ کی ہوئی ایک ''فہرستِ شاہاں'' ملی ہے۔ یہ فہرست اِریک کے فرماں روا توہیگل (۲۱۲۰۔۲۱۱۴ ق۔م) نے مرتب کروائی تھی۔ اس نوشتے میں سومیر میں پرانی داستانوں اور روایتوں کے علاوہ سورماؤں اور بادشاہوں کے حقیقی اور افسانوی کارنامے سن وار درج ہیں۔

فہرستِ شاہاں کے مطابق ''آسمان سے پہلی بادشاہت شہر اریدو میں اتاری گئی''۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اریدو اہلِ سومیر کی سب سے پرانی بستی ہے۔

فہرست نویس کا بیان حیرت انگیز حد تک درست نظر آتا ہے۔ البتہ اس نے اریدو کی بادشاہت کی مدت میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ بادشاہت ۶۴ ہزار ۸ سو برس قائم رہی اور اس طویل عرصے میں فقط دو بادشاہوں نے حکومت کی۔ پھر کسی نامعلوم

سبب کی بنا پر آسمان کی بادشاہت بادطبرا میں منتقل ہوگئی، وہاں تین بادشاہوں نے ایک لاکھ ۸ ہزار برس حکومت کی۔

''میں اس موضوع کو ترک کرتا ہوں کیونکہ بادشاہت لرک منتقل ہوگئی اور وہاں ایک بادشاہ نے ۲۸ ہزار ۸ سو سال حکومت کی۔ میں اس موضوع کو ترک کرتا ہوں کیونکہ بادشاہت سپر میں منتقل ہوگئی اور وہاں ایک بادشاہ نے ۲۱ ہزار برس حکومت کی۔ میں اس موضوع کو ترک کرتا ہوں کیونکہ بادشاہت شرو پک میں منتقل ہوگئی جہاں ایک بادشاہ ادبارتو تو نے ۱۸ ہزار چھ سو برس حکومت کی۔ یہ پانچ شہر ہیں جہاں آٹھ بادشاہوں نے ۲ لاکھ ۴۱ ہزار برس حکومت کی اور تب زمین پر سیلاب آ گیا''۔

فہرست شاہاں کی روایت کے مطابق سیلاب کے بعد بادشاہت دوبارہ ''آسمان کے نیچے اتاری گئی''۔ لیکن اب کے شہر کیش میں جو سومیر کی شمالی سرحد پر واقع تھا۔ کیش میں ۲۳ بادشاہ ہوئے جنھوں نے ساڑھے ۲۴ ہزار برس حکومت کی۔ فہرستِ شاہاں میں ان بادشاہوں کے نام درج ہیں۔ مگر بارہ کے نام یا لقب سامی ہیں۔ مثلاً کلبون (کتا) قلومو (بھیڑ) زوقاقیق (بچھو) چھ نام سومیری ہیں اور چار کسی نامعلوم زبان کے ہیں تب فہرستِ شاہاں کے مطابق ''کیش کو جنگی اسلحوں نے کاٹ کھایا'' اور بادشاہت اینا نا (اِریک کا مقدس معبد) منتقل کر دی گئی۔

اِریک کا پہلا بادشاہ میس کیا گ گا شر خداوند اُتو (سورج) کا بیٹا تھا۔ وہ مندر کا مہا پروہت بھی تھا۔ اس نے ۳۲۴ برس حکومت کی تب اس کا بیٹا اِن میکر بادشاہ ہوا۔ وہ جس نے اریک کی تعمیر کی۔ ان میکر نے ۴۲۰ برس حکومت کی۔ تب لوگل باندہ بادشاہ ہوا جو گڈریا تھا۔ اس نے ۱۲ سو سال حکومت کی۔ چوتھا بادشاہ رموزی تھا اور پانچواں بادشاہ گلِ گامش تھا جس کے رزمیہ کارنامے بہت مشہور ہوئے۔ گل گامش کلاب (اریک کی ایک مضافاتی بستی) کے ایک پروہت کا لڑکا تھا۔ اس نے ۱۲۶ برس حکومت کی۔ گل گامش کے بعد اریک میں سات اور بادشاہ ہوئے مگر ان کی بادشاہت کی عمریں طبعی تھیں۔ چنانچہ کسی نے تیس سال حکومت کی، کسی نے ۳۶ سال اور کسی نے فقط چھ سال تب بادشاہت اُر میں منتقل ہوگئی جہاں چار بادشاہوں نے ۱۷۷ سال

حکومت کی۔

اس فہرست میں لکھا ہے کہ کیش کا آخری بادشاہ آگا تھا اور اس کو اِریک کے پہلے بادشاہ نے شکست دی تھی۔ مگر عراق کی دوسری پرانی لوحوں سے یہ بات اب پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ آگا کو اریک کے پہلے بادشاہ نے شکست نہیں دی تھی بلکہ پانچویں بادشاہ گل گامش نے شکست دی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم عراق کے تاریخی دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سر لیونارڈ وولی، ص، ۴۱۹

لوح قلم کا معجزہ

''اگر تم میری ہدایتوں پر عمل کرو گے تو صاحبِ ہنر محرر بن جاؤ گے۔ وہ اہلِ قلم دیوتاؤں کے بعد پیدا ہوئے آئندہ کی باتیں بتا دیتے تھے۔ گو وہ اب موجود نہیں ہیں لیکن ان کے نام آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے اپنے لیے اہرام نہیں بنائے اور نہ اس قابل ہوئے کہ اپنی اولاد کے لیے دولت چھوڑ جاتے لیکن ان کی وارث ان کی تحریریں تھیں جن میں دانائی کی باتیں لکھی تھیں۔ وہ اپنی لوحوں اور نرسل کے قلموں کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے اور پتھر کی پشت کو بیوی سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ گو انھوں نے اپنا جادو سب سے چھپایا لیکن یہ راز ان کی تحریروں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گو وہ اب زندہ نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں لوگ اب بھی یاد رکھتے ہیں۔ پس یاد رکھو تمھیں بھی تحریر کا علم حاصل کرنا ہوگا کیونکہ کتاب عالی شان مقبرے سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔''

(بارھویں صدی قبل مسیح کی ایک مصری تحریر)

علمائے آثار کی تحقیق شاہد ہے کہ تحریر کا فن سب سے پہلے دجلہ و فرات کی وادی ہی میں وضع ہوا۔ گو مصریوں اور پھر فونیقیوں نے بھی یہ ہنر جلد ہی سیکھ لیا لیکن اوّلیت کا شرف بہر حال قدیم عراقیوں ہی کو حاصل ہے اور اگر ان لوگوں نے بنی نوعِ انسان کو علم اور معرفت کا کوئی اور تحفہ عطا نہ کیا ہوتا تب بھی ان کا یہ کارنامہ ایسا ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ انقلابی ایجاد اب سے ساڑھے پانچ ہزار برس پیشتر سومیر کے شہر اریک کے معبد میں ہوئی۔ اریک اس وقت عراق کا سب سے خوش حال اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ چنانچہ داستانِ گل گامش کا مصنف اریک کا

قصیدہ ان لفظوں میں کہتا ہے:

شہر پناہ کی دیوار پر نظر ڈالو
اس کی گگر تانبے کی مانند جھلکتی ہے
اور اندرونی دیوار دیکھو جس کی نظیر نہیں
آستانے کو چھوؤ جو بہت قدیم ہے
اِی اَنّا کے قریب جاؤ جو عشتار دیوی کا مسکن ہے
ایرک کی دیوار پر چڑھو اور میں کہتا ہوں اُس پر چلو بھی
کرسی کے چبوترے کو غور سے دیکھو
اور چنائی کو جانچو
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی ہے؟

اس شہر کی عظمت کی نشانی ورقہ کے وہ کھنڈر ہیں جو چھ میل کے دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کھنڈروں کی کھدائی جرمنوں نے ۱۹۳۴ء میں شروع کی تھی مگر وہ پندرہ سال کی مسلسل محنت کے باوجود کام مکمل نہ کر سکے۔ ماہرینِ آثار کا تخمینہ ہے کہ اس شہر کی کھدائی کے لیے تقریباً نصف صدی درکار ہوگی۔

ورقہ کے ٹیلوں کی کھدائی میں جرمنوں نے پچاس فٹ کی گہرائی پر ایک زیکورات دریافت کیا۔ یہ زیکورات ۳۵ فٹ اونچا تھا اور مٹی کے ردّوں کو رال سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ دیواروں کی زیبائش کے لیے مٹی کے چھوٹے چھوٹے تکونے ٹکڑے استعمال کیے گئے تھے۔ ان تکونوں کو رنگ کر آگ میں پکایا گیا تھا اور پھر گیلی دیواروں پر چپکا دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے دیواریں بڑی خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ زیکورات کے ملبوں میں ماہرینِ آثار کو کارتوس نما کئی مہریں بھی ملی ہیں جن پر مناظر کندہ ہیں۔ ایک مہر پر قیدیوں کو قتل ہوتا دکھایا گیا ہے۔ ایک مہر پر مویشیوں کے جھنڈ بنے ہیں۔ ایک مہر پر شیر چوپایوں پر حملہ کر رہا ہے۔ ایک مہر پر پروہت کوئی مذہبی ناچ ناچ رہے ہیں اور بالکل برہنہ ہیں لیکن ان مہروں سے بھی زیادہ قیمتی مٹی کی وہ تختی ہے جس پر تصویری حروف کندہ ہیں۔ اس تختی پر ایک بیل کا سر، ایک مرتبان کی شکل اور کئی قسم کی

بھیڑیں بنی ہوئی تھیں اور دو مثلث بھی کھنچے تھے۔ یہ انسان کی سب سے پہلی تصویری تحریر تھی جو ۳۵۰۰ ق۔م کے قریب لکھی گئی۔ لوح پر کندہ کی ہوئی یہ تصویریں بظاہر سامنے کی چیز معلوم ہوتی ہیں اور ان کا مفہوم کافی واضح ہے لیکن ہیں یہ علامتیں اور ان علامتوں میں حروف کا سا تجریدی عمل بھی موجود ہے۔ مثلاً مرتبان کی شکل فقط مرتبان کی علامت نہیں ہے بلکہ مرتبان میں رکھی ہوئی کسی چیز گھی، تیل وغیرہ کا وزن بھی بتاتی ہے۔ ان تصویروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تختی پر مندر کی املاک کا کوئی حساب درج ہے۔ اسی زمانے کی کچھ اور تختیاں جمدۃ النصر اور دوسرے مقامات پر بھی ملی ہیں۔ ان پر بھی اسی قسم کے حسابات لکھے ہیں۔

دراصل تحریر کا فن مندروں کی معاشی ضرورتوں کے باعث وجود میں آیا۔ مندر کی دولت چونکہ دیوتاؤں کی ملکیت ہوتی تھی اس لیے پروہتوں کو اس کا باقاعدہ حساب رکھنا ہوتا تھا۔ زرعی پیداوار کا حساب، بیج، آلات اور اوزار کا حساب، چڑھاوے اور قربانی کا حساب، کاری گروں کی مزدوری کا حساب، اشیائے برآمد و درآمد کا حساب، غرضیکہ آمدنی اور خرچ کی درجنوں مدیں تھیں اور ذہین سے ذہین پروہت بھی اس وسیع کاروبار کا حساب اپنے ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حسابات کوئی نجی معاملہ نہ تھے بلکہ سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی معاش ان سے وابستہ تھی۔ تیسرے یہ کہ خرید و فروخت کا سلسلہ فقط ایک شہر اریک تک محدود نہ تھا بلکہ دوسرے شہروں سے بھی تجارتی تعلقات رکھنے پڑتے تھے اس لیے تحریری علامتوں کو پورے ملک کی مروجہ علامتیں بنانا ضروری تھا۔

لیکن ان تصویری حروف کی خرابی یہ تھی کہ وہ فقط اشیا کی علامت بن سکتے تھے کسی خیال یا جذبے کی نمائندگی نہیں کر سکتے تھے کوئی ہدایت نہیں دے سکتے تھے اور نہ کوئی سوال پوچھ سکتے تھے۔ تحریر کا فن حقیقی معنی میں تحریر کا فن اس وقت بنا جب اشیا کی تصویریں اشیا کی علامت کے بجائے ان کے نام کی آوازوں کی علامت بن گئیں۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی اہلِ سومیر نے خود ہی طے کرلیا۔ چنانچہ شہر شرَ وپک (فارا) سے بڑی تعداد میں جو لوحیں برآمد ہوئی ہیں ان کے تصویری حروف اشیا کے ناموں کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ علامت داڑھی دار سر کی ہے اور ''کا'' کی بھی جو سر کا سومیری تلفظ ہے اور بولنا چیخنا کی بھی۔ اسی طرح پیر کی علامت پیر کی

نمائندہ بھی تھی۔ ڈو کی بھی جو پیر کا سومیری تلفظ ہے اور پیر سے متعلق حرکات گب (کھڑا ہونا) گن (جانا) اور توم (آنا) کی آوازوں کی بھی۔

ایرک کے دور میں تصویری حروف کی تعداد دو ہزار سے بھی زیادہ تھی لیکن رفتہ رفتہ ان میں تخفیف ہوتی گئی۔ چنانچہ شروپک کی لوحوں میں جو تین ہزار ق۔م کی ہیں حروف کی تعداد گھٹ کر فقط آٹھ سو رہ گئی۔ شروپک کی لوحوں پر بھی مندر کے حسابات ہی کندہ ہیں۔ ان کے علاوہ چند علامتوں کی فہرستیں ہیں جو مندر کے طلبا کو بطور نصاب سکھائی جاتی تھیں۔ یہ فہرستیں موضوع وار ہیں۔ مثلاً مچھلیوں کی مختلف قسمیں ایک جگہ درج ہیں اور ہر علامت کے سامنے اس پروہت یا نویسندے کا نام کندہ ہے جس نے یہ علامت ایجاد کی تھی۔

۲۹ سو ق۔م کے لگ بھگ یعنی سو سال کے اندر ہی تصویری حروف میں اور کمی ہوئی چنانچہ ان کی تعداد صرف چھ سو رہ گئی۔ اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کا علم مدت تک مندر کے پروہتوں اور شاہی خاندان کے افراد کی اجارہ داری رہا کیونکہ علم کو عام کرنا اربابِ اقتدار کے مفاد کے خلاف تھا۔

اہلِ سومیر گیلی مٹی کی چھوٹی چھوٹی لوحوں پر سرکنڈے یا بیدِ مشک کے قلم سے لکھتے تھے۔ اس عمل کے باعث تصویری حروف لامحالہ پیکانی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ مصری چونکہ قرطاس Papyrus پر روشنائی سے لکھتے تھے اس لیے ان کے تصویری حروف زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں۔ اہلِ سومیر پہلے پوری تختی پر چار خانے بنا لیتے تھے۔ پھر ہر خانے میں اوپر سے نیچے کی طرف تصویریں کھودی جاتی تھیں تب لوح کو سکھا کر پکا لیا جاتا تھا۔ اگر دستاویز زیادہ اہم ہوتی تھی تو اس کے لیے مٹی ہی کا لفافہ بھی بنایا جاتا تھا اور لوح کو اس کے اندر رکھ دیا جاتا تھا۔ کھدائی میں ایسے لفافے بھی کثرت سے ملے ہیں۔

وادیٔ دجلہ اور فرات میں دو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ جنوب میں سومیری زبان اور وسط اور شمال میں عکاّدی زبان۔ سومیری زبان یوں تو دنیا کی کسی مُردہ یا زندہ زبان سے مشابہت نہیں رکھتی ہے اور نہ زبانوں کے کسی مروجہ خاندانوں سے اس کا کوئی تعلق نظر آتا ہے لیکن اس کی گرامر کے اصول وہی ہیں جو چینی یا ترکمانی یا فنّی (فن لینڈ) یا ماجیار (ہنگری) زبانوں کے ہیں۔ مثلاً

سومیری زبان میں الفاظ کی شکلیں نہیں بدلتیں بلکہ ان میں لاحقوں اور سابقوں کی مدد لی جاتی ہے۔ پھر ان کے مادّے عام طور پر یک رکنی ہوتے ہیں اور مرکب الفاظ دراصل دو الگ الگ لفظ ہوتے ہیں جن کی شکلیں نہیں بدلتیں۔ البتہ ان کے معنی اپنے ترکیبی الفاظ سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تحریر اور حروفِ ہجا کی تحریر میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ تصویری لفظوں کی علامتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کا سیکھنا اور یاد کرنا حروفِ ہجا کے مقابلے میں مشکل ہوتا ہے۔

بہرحال تصویری لفظوں میں اصل تصویر کی اہمیت رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوگئی اور یہ تصویریں فقط آوازوں کی نمائندگی کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ ان تصویروں کی بناوٹ بھی آسان ہوتی گئی اور بالآخر تجرید کا عمل اتنا بڑھ گیا کہ تصویریں دائروں اور خطوں میں بدل گئیں۔ مثلاً حرف 'ب' کی ابتدائی شکل بیت کی تھی۔ بیت کی علامت خیمہ تھا جس کے دروازے پر ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا۔ آدمی کی شکل گھٹتے گھٹتے فقط ایک نقطہ رہ گئی اور خیمہ ایک الٹے قوس نما خط میں بدل گیا اور یہ نشان لفظ بیت کے پہلے رکن کی آواز کی علامت قرار پایا۔

سومیری زبان کے برعکس عکادی زبان سامی خاندان (عربی، عبرانی، سواحلی، آرامی وغیرہ) سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ زبان بابل سے اشور تک بولی جاتی تھی اور وادی دجلہ اور فرات کے مغرب میں جو ملک تھے (شام، فلسطین، لبنان وغیرہ) وہاں بھی سمجھی جاتی تھی کیونکہ ان علاقوں کے لوگ بھی سامی النسل تھے۔ جب بابل میں آموری (سامی سلطنت) قائم ہوئی تو اہلِ بابل سومیری رسم الخط اختیار کرنے پر مجبور ہوئے کہ تہذیب و معاشرت کی تحریر وہی تھی لیکن ان کی زبان Inflective تھی۔ یعنی ان کے الفاظ کے ارکان کی آوازیں بدلتی رہتی تھیں۔ مثلاً کَتَبَ سے یکتُبُ، کاتب، مکتب، کتاب کی آوازیں بن جاتی ہیں۔ پس اہلِ بابل نے عکادی زبان کے تقاضوں کے بموجب سومیری رسم الخط میں مزید اصلاحیں کیں (۲۰۰۰ ق۔م) اور ان کی زبان کو اتنا فروغ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد عکادی زبان پورے مشرقِ قریب کی تہذیب اور امورِ سلطنت کی زبان ہوگئی اور سومیری زبان کا رواج رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوگیا۔ ہزار سال گزرنے کے بعد مندر کے پروہتوں کے علاوہ کوئی اس زبان کو سمجھنے والا نہ رہا۔ فقط مندر میں پڑھے جانے والے بھجنوں، گیتوں اور دعاؤں کی زبان سومیری رہ گئی اور اس کا وہی حشر ہوا جو لاطینی زبان کا ہوا۔

چوتھا باب

ایک عورت، ہزار افسانے

کسی پرانی قوم کے عقائد وافکار کا جائزہ لیتے وقت اس کے سماجی اور معاشرتی حالات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے ورنہ ان عقائد وافکار کے اصل محرکات ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ مگر انسان کا معاشرہ کوئی جامد اور ساکن شے نہیں ہے بلکہ اس میں وقتاً فوقتاً بعض اہم اور بنیادی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کا بھی علم ہونا چاہیے کیونکہ انسان کے خیالات اور احساسات پر ان تبدیلیوں کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ان علامتوں اور اصطلاحوں کے اصل مفہوم سے بھی آگاہ ہونا چاہیے جو اس زمانے میں رائج تھیں اس لیے کہ الفاظ کی شکلیں اگرچہ کم بدلتی ہیں لیکن ان کے معنی اور مطالب میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً دیوی دیوتا کی اصطلاحیں قدماکسی اور معنی میں استعمال کرتے تھے اور ہم کسی اور معنی میں استعمال کرتے ہیں یا بھگوان کی اصطلاح کو جس کے مروّجہ معنی خدا یا ایشور کے ہیں گیاہستانی دور کے آریہ بالکل مختلف معنی میں استعمال کرتے تھے۔ بھاگ سنسکرت میں حصے کو کہتے ہیں اور بھاگوان شکاری قبیلے کا وہ بزرگ مرد ہوتا تھا جو خورد ونوش کی چیزوں کو قبیلے والوں میں برابر تقسیم کرتا تھا۔ اس دور کے معاشرے میں حصے بانٹنا نہایت اہم سماجی فریضہ تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قبیلے کے لوگ بھاگوان کے فرائض اسی آدمی کے سپرد کرتے تھے جو سب سے زیادہ دیانت دار اور منصف مزاج ہوتا تھا۔ دراصل ان کا حقیقی رزّاق وہی تھا۔ جب آریاؤں کی زندگی کا انحصار شکار پر نہ رہا اور انھوں نے کھیتی باڑی اور تجارت وحرفت شروع کی اور ذاتی ملکیت کو فروغ ہوا تو بھاگوان کا یہ قدیم منصب لامحالہ ختم ہوگیا۔ البتہ انصاف اور رزّاقی کا وہ تصور جو لفظ بھگوان کے ساتھ وابستہ تھا بدستور باقی رہا۔ چنانچہ جب آریائی ذہنوں نے دیوتاؤں کی تخلیق کی تو ان

دیوتاؤں کو نہ صرف بھگوان کے اوصاف سے نوازا بلکہ انھیں بھگوان کا پرانا لقب بھی عطا کیا اس طرح لفظ بھگوان کے معنی اور مفہوم بالکل بدل گئے۔ بھگوان جو ابتدا میں ایک انسان تھا اور شکار کے حصے تقسیم کرتا تھا معاشرتی حالات میں تبدیلی کے بعد ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ کرنے پر مامور ہو گیا۔

یہی حادثہ لفظ قسمت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ چنانچہ حصہ تقسیم کرنے والے کا معزز عہدہ تو ختم ہو گیا لیکن آنے والی نسلوں میں یہ یقین باقی رہا کہ کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جو دنیاوی نعمتوں کو انسانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اسی سے قسمت اور لوحِ تقدیر کے تصورات پیدا ہوئے اور اب کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ ایک زمانے میں دنیاوی نعمتوں کو قبیلے کا سربراہ ہی لوگوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔

وادیِ دجلہ وفرات کے قدیم باشندوں کے ابتدا میں کیا عقائد تھے اور ان میں عہد بہ عہد کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں ان سوالوں کا جواب آسان نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ذرائع معلومات کی کمی کی ہے کیونکہ تین ہزار قبلِ مسیح سے پیش تر کے ایسے کوئی آثار موجود نہیں ہیں جن سے پتہ چل سکے کہ شکاری دَور یا گلّہ بانی کے زمانے میں وہاں کے لوگوں کی کیا سوچ تھی۔ فنِ تحریر کی ایجاد کے بعد بھی یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا اس لیے کہ جن لوحوں اور کتبوں سے سرزمینِ عراق کے قدیم باشندوں کے خیالات اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ زیادہ تر اشور بنی پال کے کتب خانے سے یا نیفر کی کھدائی میں ملی ہیں۔ یہ نوشتے مذہبی دعاؤں، رزمیہ داستانوں، دیوتاؤں کے قصے، شاہی مہموں، تجارتی معاہدوں اور کاروباری حساب کتاب پر مشتمل ہیں۔ جن لوحوں سے افکار اور عقائد کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ فقط ایک خاص طبقے یا گروہ کے عقائد کی عکاسی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کے نویسندوں نے اور مندر کے پروہتوں نے فقط وہی چیزیں محفوظ کی ہوں گی جو ان کے عقائد کے مطابق ہوں گی۔ مخالفین کے خیالات کو قلم بند کرنا ان کے لیے ضروری نہ تھا۔ یوں بھی وابستگانِ سلطنت اور مندروں کے پروہتوں کے علاوہ بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نوشتوں میں افکار و عقائد کی حد تک بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور اس یکسانیت سے بعض محققین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس خطے کے لوگوں

کے خیالات میں دو ہزار برس کی طویل مدت میں کوئی تبدیلی یا ترقی نہیں ہوئی۔

بظاہر یہ بڑی حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے لیکن وادیٔ دجلہ و فرات کے لوگوں کے خیالات میں اس پورے دور میں درحقیقت بہت کم تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس مدت میں وہاں بار بار سیاسی تغیرات رونما ہوئے۔ کبھی سلطنتِ بابل کا پرچمِ اقتدار بلند ہوا، کبھی کسدیوں اور ایرانیوں کی یلغار کا شور مچا اور کبھی اشور کی فتوحات کا غلغلہ اٹھا لیکن معاشرے کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ پرانے طبقاتی رشتے اپنی جگہ بدستور قائم رہے۔ چنانچہ مندر کے پروہتوں کا تسلّط ہو یا نظم و نسق کے اصول، زراعت کے طریقے ہوں یا صنعت و حرفت کے انداز جو شروقین اور حمورابی کے عہد میں تھے وہی اشور بنی پال اور بختِ نصر کے زمانے میں بھی رائج رہے۔ بہت ہوا تو سومیریوں کے انو دیوتا کی جگہ بابل کے مرڈک کو مل گئی یا آتو کا نام شمس ہو گیا ورنہ پرانے رسوم و رواج اور طرزِ زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔

اور فرق آنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ کسی معاشرے کے طرزِ زندگی اور فکری اسلوب میں تبدیلیاں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب معاشرے کا وجود ان تبدیلیوں کا متقاضی ہو اور معاشرے کا وجود اسی وقت تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے جب پیداوار کے پرانے رشتے معاشرے کی ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگیں۔ تب نئے اور پرانے خیالات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ فرسودہ رشتوں اور فکروں کی مخالفت شروع ہوتی ہے اور نئے افکار و نظریات پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس لکھتا ہے کہ:

> ''معاشرتی چیزیں پیدا کرتے وقت (خواہ یہ چیزیں زرعی ہوں یا صنعتی) انسانوں کے درمیان چند مخصوص رشتے قائم ہوتے ہیں۔ (زمین دار کاشت کار کا رشتہ، آقا اور غلام کا رشتہ، کارخانے دار اور مزدور کا رشتہ) یہ رشتے ناگزیر ہوتے ہیں اور ان کو قائم کرنے میں افراد کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پیداوار کے یہ رشتے پیداوار کی مادّی قوتوں کے ارتقا کے مخصوص درجے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ رشتے مجموعی طور پر عبارت ہوتے ہیں معاشرے کی معاشی ساخت سے یہی معاشی ساخت وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر قانون اور سیاست کا بالائی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے اور

جس سے سماجی شعور کی مختلف شکلیں میل کھاتی ہیں۔ ماڈی زندگی میں پیداوار کا انداز وطریق ہی زندگی کے سماجی، سیاسی اور ذہنی طرزِ عمل کا تعیُّن کرتا ہے۔ لوگوں کا شعور ان کے وجود کو متعین نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کا تعیُّن کرتا ہے۔ پیداوار کے ماڈی عناصر ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر پیداوار کے مروجہ رشتوں سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ اسی بات کو قانون کی زبان میں یوں کہیں گے کہ ماڈی عناصر ملکیت کے ان رشتوں سے متصادم ہو جاتے ہیں جن کے اندر رہ کر وہ اب تک مصروفِ عمل تھے۔ چنانچہ ملکیت یا پیداوار کے یہ رشتے عناصرِ پیداوار کے حق میں زنجیرِ پا بن جاتے ہیں تب سماجی انقلاب کا دور آتا ہے اور معاشی بنیاد کی تبدیلی کے ساتھ سماج کے بالائی ڈھانچے (سیاست، قانون، اخلاق، افکار وعقائد) کی کایا بھی کم وبیش پلٹ جاتی ہے مگر اس قلبِ ماہیت پر غور کرتے وقت پیداوار کے معاشی حالات میں جو ماڈی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان میں اور قانونی، سیاسی، مذہبی، جمالیاتی یا فلسفیانہ تبدیلیوں مختصر یہ کہ ذہنی پیکروں کے تغیُّرات میں امتیاز کرنا چاہیے۔ کیونکہ ماڈی تبدیلیوں کو تو سائنسی طور پر ٹھیک ٹھیک ناپا جاسکتا ہے لیکن ذہنی تبدیلیوں کا تعیُّن آسان نہیں ہوتا اور شعور کی آویزشیں انہیں ذہنی پیکروں میں نمودار ہوتی اور لڑی جاتی ہیں۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک معدوم نہیں ہوتا جب تک عناصرِ پیداوار کے لیے سماج میں ترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے اور پیداوار کے نئے اور بہتر رشتے اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے وجود کے ماڈی عوامل پرانے سماج کے بطن میں پوری طرح پرورش نہیں پا لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان فقط اُنہیں مسائل سے نبرد آزما ہوتی ہے جن کو حل کرنے کی اس میں سکت ہوتی ہے۔ درحقیقت اس قسم کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہی اس وقت ہے جب اس کے حل کے لیے ماڈی حالات موجود ہوں''۔

وادیِ دجلہ وفرات کے لوگوں کو تقریباً دو ہزار برس تک عناصر پیداوار یا پیداواری رشتوں کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہی کانسے کے آلاتِ پیداوار اور آلاتِ جنگ جو

شہری ریاستوں کے ابتدائی زمانے میں استعمال ہوتے تھے چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانیوں کے غلبے کے وقت بھی رائج تھے۔ نہ معاشرے کی بنیادی ساخت بدلی اور نہ خیالات اور عقائد کی دنیا میں کوئی ہلچل پیدا ہوئی یہی وجہ ہے کہ عراق کی سرزمین سے زرتشت، مانی یا مزدک کی مانند کوئی انقلابی شخصیت کبھی نہ ابھری اور نہ کوئی ایسی سماجی تحریک پیدا ہوئی جو پرانے توہمات اور عقائد کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرتی۔ اگر ایسی کوئی تحریک اٹھی ہوتی تو شاہی نوشتوں یا پروہتوں کی تصنیفوں میں اس کی مذمت کے اشارے ضرور ملتے مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ زرتشت اور مانی ومزدک چھٹی صدی قبلِ مسیح کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

قدما کی تحریری روایتیں بھی ذرائع معلومات کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتی ہیں۔ یہ لوگ ہر عہد میں پرانی داستانوں کو اپنے وقتی تقاضوں یا مذاق کے مطابق از سر نو مرتب کرتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ہی داستان مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی تھی۔ چنانچہ لوحوں پر سنِ تحریر درج نہ ہو تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ داستان کی ابتدائی شکل کیا تھی اور وہ عہد بہ عہد کتنے قالبوں میں ڈھلی۔ لطف یہ ہے کہ اکثر لوحوں پر سن سرے سے غائب ہیں اور اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ فلاں لوح فلاں عہد کی ہے تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہی کہ ان لوحوں میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں وہ پورے عہد کی ذہنی کاوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس طویل تمہید سے ہمارا منشا اپنے اصولِ تنقید کی وضاحت کرنا تھا اور پرانے عقائد و افکار کی ارتقائی منزلوں کی جستجو میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں ان سے ناظرین کو آگاہ کرنا تھا۔ مگر ان عقائد کی تشریح سے قبل قدما کے معاشرتی ماحول کا ایک مختصر ساخاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔

انیسویں صدی سے پیش تر انسان کے ماضیِ بعید کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص اور محدود تھیں۔ عہدِ قدیم زمین کے سینے میں دفن تھا اور ہمیں نہ ان دفینوں کی خبر تھی اور نہ ہمارے پاس ان کی تلاش و تحقیق کا کوئی ذریعہ موجود تھا۔ ہماری آگہی کا سارا اثاثہ چند مذہبی کتابیں تھیں یا وہ لوک کہانیاں جو پرانی قوموں میں ہزاروں برس سے رائج ہیں۔ پس انہیں نوشتوں اور روایتوں کی روشنی میں انسان اور اس کے قدیم معاشرے کا سراغ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے ایک پادری اُشر نے انجیل کی کتاب پیدائش کے مطالعے سے ثابت کیا تھا کہ

ظہورِ آدم کا واقعہ ۴۰۰۴ قبل مسیح میں پیش آیا تھا اور دانایانِ مغرب نے پادری اُشر کی اس کاوش کو بہت سراہا تھا لیکن انیسویں صدی میں جب سائنس نے ترقی کی اور نئے نئے علوم مثلاً علم الارض، علم الحیوان اور علم الافلاک کو فروغ ہوا تو زمین اور زندگی کی عمریں متعیّن ہونے لگیں۔ ارتقائے حیات کے نظریے بننے لگے اور زمین کی تہوں سے بے شمار ایسی چیزیں برآمد کی جانے لگیں جن سے یہ ثابت ہوگیا کہ زندگی کے جرثومے کروڑوں برس سے زمین کی آغوش میں پرورش پا رہے ہیں۔ دانش وروں نے ان معدوم جانوروں کے ڈھانچے بھی ڈھونڈ نکالے جو لاکھوں برس گزرے معدوم ہو چکے ہیں اور جب ۱۸۹۱ء میں پروفیسر ڈوبائے کو جاوا میں قدیم انسان کی چار لاکھ برس پرانی ایک کھوپڑی ہاتھ آئی تو پادری اُشر کا حساب بالکل ہی غلط ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ (جرمنی) کے مقام پر آدمی کا ایک جبڑا ملا جو پانچ لاکھ برس پرانا تھا اور ۱۹۰۷ء میں پیکنگ (چین) کے ایک نواحی غار میں انسانوں کے ۴۵ ڈھانچے دستیاب ہوئے جو چار لاکھ برس پرانے تھے۔ چنانچہ اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کم از کم پانچ لاکھ برس سے اس کرۂ ارض پر آباد ہے۔

محققین نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس پانچ لاکھ برس کے عرصے میں انسان کے آلات و اوزار، رسم و رواج، رہن سہن، عقائد و عادات اور فکر و فن میں وقتاً فوقتاً نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ انسانی تہذیب کوئی جامد اور ساکت شے نہیں ہے جو ایک مقام پر مستقل ٹھہری رہتی ہو بلکہ وہ ایک تغیّر پذیر اور فعاّل حقیقت ہے جس نے اب تک ارتقائے حیات کے مختلف مدارج طے کیے ہیں اور یہ عمل بدستور جاری ہے۔ ان تبدیلیوں کا باعث وہ آلات واوزار ہیں جن کو انسان حصولِ معاش کی خاطر خود بناتا ہے۔ دراصل تہذیبِ انسانی کے مختلف عہدوں کی شناخت انہیں آلات و اوزار سے کی جاتی ہے چنانچہ ۱۸۳۶ء میں کرسٹین ٹامسن Christian Tomsen نامی ایک فرانسیسی عالم نے آلات واوزار کے فرق کے پیشِ نظر انسانی تہذیب کے تین بنیادی عہد قائم کیے ہیں۔

۱۔ پتھر کا زمانہ جب کہ آلات واوزار پتھر، لکڑی، یا ہڈی کے ہوتے تھے۔

۲۔ دھات کا زمانہ جب کہ آلات واوزار کانسے کے ہوتے تھے۔

۳۔لوہے کازمانہ جوایک ہزار قبلِ مسیح کے قریب شروع ہوااور ہنوز جاری ہے۔

پتھر کا زمانہ تقریباً پانچ ہزار قبل مسیح تک جاری رہا۔اس کو زمانہء قبل از تاریخ بھی کہتے ہیں۔علمائے آثار نے پتھر کے زمانے کو بھی تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔قدیم حجری دور : ۵لاکھ تا ۲۰ہزار قبل مسیح

۲۔وسطی حجری دور ۲۰ہزار تا ۱۲ہزار قبل مسیح

۳۔جدید حجری دور ۱۲ہزار تا ۵ہزار قبل مسیح

مگر کرسٹین ٹامسن نے حجری دور سے پہلے کا وہ طویل زمانہ نظرانداز کردیا جس میں انسان جنگل کے پھل پھول، جڑی بوٹی اور گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا حالانکہ حجری دور کے لوگوں کے افکار وعقائد اپنے پیش روؤں کے تجربات سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔اس ثمریابی کے دور میں انسان اپنی خوراک خود پیدا کرنے پر قادر نہ تھا بلکہ قدرت کی فیاضیوں کا دست نگر تھا۔وہ ثمریابی کی خاطر محنت ضرور کرتا تھا مگر اس کی محنت میں اور دوسرے جانوروں کی محنت میں چنداں فرق نہ تھا۔اس دور کے آخری دنوں میں انسان نے غالباً لکڑی اور پتھر کی مدد سے پھل توڑنے اور جڑیں کھودنے کا ہنر حاصل کرلیا تھا۔ثمریابی کے دور کا انسان چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں رہتا تھا۔ان قبیلوں کا طرزِ معاشرت پنچایتی یا اشتراکی تھا اوران میں عورت مرد، چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں کی جاتی تھی بلکہ پورا قبیلہ ایک وحدت تصور ہوتا تھا البتہ عورت کو مرد پر ایک فوقیت حاصل تھی۔وہ یہ تھی کہ پھل پھول جمع کرنے کے علاوہ وہ بچے بھی پیدا کرتی تھی۔ یعنی قبیلے کے وجود اور افزائش کی براہِ راست ذمّے دار عورت تھی۔عورت مرد کی مباشرت اور بچے کی ولادت میں جو رشتہ ہے اس وقت تک انسان اس رشتے سے واقف نہیں ہوا تھا اس لیے وہ افزائشِ نسل کو واحد عورت کا ہی کارنامہ سمجھتا تھا۔آسٹریلیا اور امریکا کے بعض پرانے قبیلے اب تک یہی خیال کرتے ہیں۔

حجری دور کے آغاز پر قبیلے کی وحدت تو بدستور برقرار رہی بلکہ اور زیادہ مضبوط ہوگئی البتہ قبیلے کے اندر عورت کی حیثیت ضمنی ہوگئی۔یہ دور جنگلی جانوروں کے شکار کا دور تھا۔کیونکہ اب انسان پتھر کے نکیلے ٹکڑوں کو لکڑی سے جوڑ کر کلہاڑے اور بھالے بنانے لگا تھا۔جنگلی

جانوروں کا شکار بڑے جان جوکھم کا کام تھا۔ اس میں جسمانی طاقت زیادہ درکار ہوتی تھی لہٰذا یہ کام مردوں کے سپرد ہوا۔ دراصل اسی وقت سے معاشرے میں تقسیم کار کی بنیاد پڑی۔ مرد شکار کرتے تھے اور جو کچھ ہاتھ آتا تھا اسے پورا قبیلہ آپس میں بانٹ لیتا تھا۔ عورتیں بدستور ساگ پات، پھل اور جڑی بوٹیاں جمع کرتی تھیں۔ یہ چیزیں بھی غذا کے کام آتی تھیں کیونکہ شکار کا ملنا تو ایک اتفاقی امر تھا۔ ثمر اندوزی کے علاوہ عورتوں کا کام بچوں کی پرورش کرنا، قبیلے کے بوڑھوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنا اور جانوروں کی کھال کو صاف کر کے اس سے قبیلے والوں کے لیے پوشاک تیار کرنا تھا۔

اسی زمانے میں گلّہ بانی بھی شروع ہوئی کیونکہ شکاریوں کو کبھی کبھی جنگ میں گائے، بھینس، بکری، بھیڑ یا ہرن کے بچے مل جاتے تھے یا وہ زخمی جانور کو زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اس طرح مویشی پالنے اور گلّے بانی کا رواج ہوا اور انسان شکار کی محتاجی سے آزاد ہوا۔ اب اسے شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مویشی پالنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لوگ جانوروں کا دودھ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ مگر ان سہولتوں کے باوجود انسان کی صحرا نوردی اور خانہ بدوشی بدستور باقی رہی بلکہ مویشیوں کے لیے گھاس چارے کی تلاش میں اسے اب مجبوراً گیاہستانی علاقوں کا سفر کرنا پڑا۔ چنانچہ آریاؤں کے قافلے جو پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں ایران میں داخل ہوئے اور جنہوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو تاخت و تاراج کیا دراصل گیاہستانی لوگ ہی تھے۔ ان کو اپنے گلّوں کے لیے چارے کی خاطر دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔

اس دور کے آثار دریائے دجلہ کی وادی میں شمشال، شنیدر، کریم شہر اور دوسری جگہوں پر ملے ہیں۔ البتہ ان آثار میں کوئی مُورت دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ غالباً اس وقت تک اس خطے کے لوگ سحر اور مذہب کے تصور سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

گلّہ بانی کے بعد کھیتی باڑی کا دور آیا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ زراعت کا فن عورتوں نے ایجاد کیا تھا۔ اس عظیم ایجاد نے معاشرتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ انسان پہلی بار زمین سے وابستہ ہوا اور اس نے سفری زندگی ترک کر کے حضری زندگی اختیار کی۔ زراعت کی وجہ سے

انسان پہلی بار اپنی غذا خود پیدا کرنے کے قابل ہوا۔ مگر چونکہ زراعت عورت کی ایجاد تھی اور قبیلے والوں کا خیال تھا کہ یہ کام عورت ہی بہتر سرانجام دے سکتی ہے اس لیے قبیلے کے اندر عورت کو دوبارہ فوقیت حاصل ہوئی۔ اس کی ذات تمام اختیارات کا سرچشمہ قرار پائی۔ اس طرح زراعت کی ابتدا کے ساتھ دنیا میں اُموی نظام باقاعدہ رائج ہوا۔ یہ نظام مصر، عراق، یونان، ایشیائے کوچک اور وادی سندھ میں صدیوں تک قائم رہا۔ حتیٰ کہ مصر میں فراعنہ کے عہد تک تخت و تاج کی حقیقی مالک اور مندر کی مہا پروہت ملکہ ہی ہوتی تھی اور فراعنہ کو ملکہ کے ساتھ شادی کرنے کے طفیل ہی اقتدار نصیب ہوتا تھا۔

اُموی نظام کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر ریورز لکھتا ہے کہ یہ ایسی سماجی تنظیم ہے جس میں "ہر شخص کے حقوق ــــ دوسرے کے مقابلے میں اور پورے معاشرے کے مقابلے میں ــــ ماں کے رشتے سے متعیّن ہوتے ہیں۔ معاشرے کی حد تک اس کے فرائض اور حقوق ان رشتوں سے متعیّن ہوتے ہیں جو اس شخص میں اور اس کی ماں کے رشتہ داروں میں اور اس کی ماں کے سماجی حلقے میں قائم ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُموی نظام میں قبیلے کے ہر شخص کو اس کے حقوق اور فرائض ماں کی طرف سے ملتے ہیں نہ کہ باپ کی طرف سے"۔

اس قسم کا اُموی نظام ان پس ماندہ قوموں میں اب تک رائج ہے جو زراعت کے ابتدائی دور سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔ مثلاً آسام میں اور مشرقی پاکستان کے سرحدی علاقوں میں ایک پس ماندہ قوم آباد ہے جس کو کھاسی کہتے ہیں۔

"ان کی سماجی تنظیم قدیم اُموی نظام کی نہایت مکمل مثال پیش کرتی ہے۔ ماں فقط خاندان کی سربراہ اور افرادِ خاندان کا رشتہء اتحاد نہیں ہے بلکہ خاندان کی جائیداد کی مالک بھی ماں ہی ہوتی ہے۔ وراثت اسی سے منتقل ہوتی ہے۔ باپ کا بچوں پر کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ وہ ماں کے قبیلے کے ماتحت ہوتے ہیں۔ باپ جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے اُموی رشتہ داروں (بھانجوں، بھانجیوں) میں بٹ جاتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اس کی ہڈیوں کو اس کی ماں کے قبیلے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے گھر میں نہ کھاتا ہے اور نہ رہتا ہے بلکہ کبھی کبھار اپنی بیوی سے رات کے

اندھیرے میں آ کر مل جاتا ہے۔"[1]

عراق میں سب سے پرانی مورتیاں جرمو اور حلاف میں ملی ہیں۔ یہ مورتیاں اسی زرعی اور اُموی نظام کے دور کی ہیں۔ یہ مورتیاں حاملہ عورتوں کی ہیں اور ان میں پستان اور پیٹرو کا ابھار بہت نمایاں ہے۔ اسی نوع کی مورتیاں کریٹ کے جزیرے میں، اناطولیہ کے پلیٹوپر، دریائے سندھ کی وادی میں اور یونان، مصر، ارفونیقیا میں بہ کثرت دستیاب ہوئی ہیں۔ دراصل دنیا کا شاید ہی کوئی پرانا خطہ ایسا ہو جہاں سے حاملہ عورت کی مورتیاں نہ ملی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بغداد، قاہرہ، استنبول، موہن جو دڑو، ایتھنز، روم، پیرس، ماسکو، لندن، نیویارک، برلن، پیکنگ اور ٹوکیو غرضیکہ دنیا کے بھی بڑے عجائب گھروں میں حاملہ عورت کی مورتیوں کی بہتات ہے۔

سوال یہ ہے کہ حاملہ عورت کی مورتیاں، زراعت کے اُموی عہد ہی میں کیوں بنائی گئیں اور اگر بنائی گئیں تو ان کی غرض و غایت کیا تھی۔ عمرانیات کے عالموں نے ان مورتیوں کو مادرِ ارض کا لقب دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی زرعی عہد میں یہ مورتیاں زرعی پیداوار کی افزائش کے ساحرانہ رسوم میں استعمال ہوتی تھیں کیونکہ اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک عورت کا تخلیقی عمل اور زمین کی زرخیزی کا عمل ایک ہی حقیقت کے دو رخ سمجھے جاتے تھے۔ سرجان فریزر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "شاخِ زرّیں" (Golden Bough) میں امریکہ کے اورنیکو قبیلے کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس دعوے کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایک بار ایک پادری نے اورنیکو قبیلے کے لوگوں سے ناراض ہو کر کہا کہ "تم لوگ بڑے بے رحم ہو تمہاری عورتیں سخت دھوپ میں بچوں کو سینے سے لگائے بیج بوتی رہتی ہیں اور تم ان کی بالکل مدد نہیں کرتے"۔ قبیلے والوں نے پادری کو جواب دیا کہ "مقدس باپ آپ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ عورتیں بچے پیدا کرتی ہیں لیکن ہم بچے نہیں پیدا کر سکتے۔ جب عورتیں بیج بوتی ہیں تو جوار کے پودوں میں دو دو تین تین بھٹے لگتے ہیں اور آلو کی جڑ سے دو دو تین تین ٹوکری آلو نکلتا ہے۔ بتائیے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ عورتیں بچے پیدا کرنا جانتی ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیج سے اناج افراط سے کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ پس انہیں بیج بونے دیجیے۔ جتنا وہ جانتی ہیں ہم نہیں جانتے"۔

اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ زراعت کے ابتدائی دور میں انسان کا شعور زراعت کے اصولوں سے آگاہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ یہ جانتا تھا کہ پودے کیوں اور کیسے بڑھتے ہیں۔

موہن جودڑو کی مورتیوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے سر جان مارشل لکھتا ہے کہ:

"ہر شخص جانتا ہے کہ وادی سندھ اور بلوچستان میں عورتوں کی جو مورتیاں نکلی ہیں ویسی ہی مورتیاں عراق، شام، فلسطین، قبرص، کریٹ، بلقان، ایران اور مصر میں بھی کثرت سے ملی ہیں۔ علمائے آثار کی متفقہ رائے ہے کہ یہ مورتیاں مادرِ کائنات یا قدرت کی دیوی کی ہیں۔ وادیِ سندھ کی مورتیاں مغربی ایشیا کی مورتیوں کی مانند غالباً سماج کے اُموی دور میں ایجاد ہوئیں"۔

لیکن سحر یا جادو کی اصل حقیقت اور سحر اور افزائش کے رشتے پر غور کرنے سے پہلے وادیِ دجلہ و فرات کے قدیم انسان کے اندازِ فکر اور طرزِ استدلال کا سرسری جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وادیِ دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کی نظر میں کائنات زندگی سے بھرپور ایک وحدت تھی۔ وہ چیزوں کو حیوانات، نباتات اور جمادات میں بانٹنے کے قائل نہ تھے بلکہ موجوداتِ عالم کو یکساں فعّال اور صاحبِ ارادہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر وہ شے جو ذہن، جذبے یا ارادے کو متاثر کر سکے حقیقی تھی اور جو حقیقی تھی وہ جان دار اور متحرک تھی۔ اس کی ایک فعال شخصیت تھی اور یہ شخصیت ارادے، عمل اور قدر شناسی کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لہٰذا ریت کا ذرّہ ہو یا پتھر کا ٹکڑا، آندھی کے طوفان ہوں یا سمندر کی موجیں، سورج کی شعاعیں ہوں یا چاند ستاروں کی چمک دمک، جانور ہو یا انسان سب صاحبِ ارادہ اور فعّال ہستیاں تھیں۔ چنانچہ سومیر کا ایک شاعر نمک سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

نمک! جسے پاکیزہ مقام پر پیدا کیا گیا
تجھے خداوندانِ لیل نے دیوتاؤں کی خوراک قرار دیا۔
تیرے بغیر دیوتا، بادشاہ، شہزادے، رئیس زادے
لوبان کی خوشبو نہیں سونگھ سکتے۔

اے نمک! میرا طلسم توڑ دے

مجھے سحر سے آزاد کر دے۔

اور اگر کسی راہ گیر کو ٹھوکر لگ جاتی تو وہ اس حادثے کو یوں بیان کرتا تھا کہ "میں چلا جا رہا تھا کہ پتھر کے ٹکڑے نے میرے پاؤں میں ڈس لیا اور میرا انگوٹھا لہولہان ہو گیا"۔

سوچ کا یہ قدیم انداز دنیا کی قریب قریب سبھی زبانوں میں موجود ہے۔ چنانچہ ایسے محاورے اور ترکیبیں اب بھی بکثرت ملیں گی جن میں بے جان چیزیں ارادے اور عمل کی صفتوں سے مزیّن نظر آئیں گی۔ مثلاً ہم آج بھی کہتے ہیں کہ سورج نکل آیا، دیوار کھڑی ہو گئی، چھت گر پڑی، جوتے نے کاٹ لیا، آندھی آ رہی ہے۔ گویا یہ سب زندہ اور صاحبِ ارادہ چیزیں ہیں۔ شاعری میں تو اظہارِ بیان کا یہ انداز بہت عام ہے چنانچہ سومیری شاعر اگر نمک سے خطاب کرتا ہے تو اردو کا شاعر آفتاب سے مصروفِ کلام ہے

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

اور ستاروں سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
جو چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیُّر

قدما ظواہر اور حقیقت، مشاہدہ اور ادراک میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے ہر حسی تجربے کو سچا سمجھتے تھے۔ مثلاً سورج اگر مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا تھا تو ان کے نزدیک سورج کی یہ گردش نظر کا دھوکا نہ تھی بلکہ عین حقیقت تھی اور عراق کے قدیم باشندوں پر کیا منحصر ہے ہمارے ملک کے کروڑوں باشندوں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے۔ وہ اب تک آسمان کو ایک ٹھوس شے خیال کرتے ہیں۔

معاشرے کے عہدِ طفلی میں انسان اشیا کا تصور مجرّد ذات کے بجائے شخصی اور تصویری

انداز میں کرتا تھا جس طرح ہم آپ اب بھی خواب میں یا ہمارے شاعر اپنی تشبیہوں اور خیالی تصویروں Images میں کرتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ عراق اور مصر کہ کشتی سے سفر کرنے کے عادی تھے، سورج کو بھی کشتی کا مسافر تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سورج صبح سویرے اپنی کشتی پر بیٹھ کر آسمان کے نیلے سمندر میں سفر شروع کر دیتا ہے اور شام کے وقت بحرِ ظلمات میں چلا جاتا ہے جو مغرب میں تھا۔ اس کے برعکس وسطی ایشیا کے میدانوں میں گھوڑے دوڑانے والے آریاؤں کا سورج دیوتا شہہ سوار تھا۔ وہ گنگا جمنی تھ میں سوار ہاتھ میں سنہری کرنوں کا بھالا اٹھائے اس شان سے سفر کرتا تھا کہ اس کی رتھ کے گھوڑوں کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔

دوسری پرانی قوموں کی مانند اہلِ عراق بھی کسی واقعے یا حادثے کا سبب تلاش کرتے وقت یہ نہیں پوچھتے تھے کہ یہ واقعہ یا حادثہ کیوں اور کیسے ہوا بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس ''واقعے یا حادثے کو کس نے کیا''۔ ان کے نزدیک ہر واقعے کے پیچھے کوئی نہ کوئی فعّال اور صاحبِ ارادہ شخصیت ہوتی تھی۔ کسی ذات کے ارادے اور عمل کے بغیر کوئی شے نہ وجود میں آسکتی تھی اور نہ فنا ہوسکتی تھی۔

اب اگر زندگی اور موت، بہار اور خزاں، بارش اور خشک سالی، بیماری اور تندرستی، افزائش اور قحط، فتح اور شکست سب کی اپنی اپنی فعّال، صاحب ارادہ شخصیتیں تھیں تو انسان ان شخصیتوں کے عمل اور ارادے پر بھی قابو پاسکتا تھا۔ انہیں اپنی مرضی اور خواہش کا پابند بھی بنا سکتا تھا۔ یہ تھا پرانے زمانے کے انسان کا طرزِ استدلال۔ اسی بات کو ہم آج کل کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قدیم انسان مظاہرِ قدرت سے بالکل خائف نہیں تھا بلکہ وہ ان مظاہر کو تسخیر کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ یہ تدبیریں عملی بھی ہوتی تھیں اور نفسیاتی بھی۔ سحر ابتدائی انسان کی نفسیاتی تدبیروں کا دوسرا نام ہے۔ سحر کا بنیادی مقصد مظاہرِ قدرت کو تسخیر کرنا اور ان کو اپنی مرضی اور خواہش کا پابند بنانا تھا۔ یہ سحر مثبت بھی ہوتا تھا اور منفی بھی۔ یعنی اس سے تخلیق و تسخیر کا کام بھی لیا جاتا تھا اور تخریب کا بھی۔

طریقہء کار کے اعتبار سے سحر کی دو قسمیں تھیں۔ اوّل تمثیلی یا ہومیوپیتھک Imitative

دوئم اِتصالی Contagious۔ تمثیلی جادو کا نظریہ وہی تھا جو ہومیو پیتھک میں علاج بالمثل کا ہے۔ یعنی ہم جنس ہم جنس کو پیدا یا متاثر کرتا ہے یا سبب اور مسبب، عِلّت و معلول میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ اِتصالی جادو میں عِلّت و معلول کے درمیان لمسی رشتے کا ہونا لازمی ہے۔ (مثلاً دشمن کے سر کے بال کو جلانے سے دشمن کو گزند پہنچے گا۔) ایشیا اور افریقہ کی پس ماندہ قومیں اب تک جادو میں یقین رکھتی ہیں اور جادو کی رسمیں مناتی رہتی ہیں۔ مثلاً برطانوی کولمبیا کے باشندوں کی گزربسر مچھلیوں کے شکار پر ہوتی ہے مگر کبھی کبھار دریا میں مچھلیوں کی پیداوار گھٹ جاتی ہے یا کسی وجہ سے مچھلیاں اس علاقے کا رخ نہیں کرتیں تب یہ لوگ تیرتی ہوئی مچھلی کی ایک مورت بناتے ہیں اور اس مورت کو پانی میں بہا دیتے ہیں اور انہیں مچھلیوں کی فراوانی کا یقین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جزیرہ نیاس کے شکاریوں کو جب جنگلی سُوَر ہاتھ آتا ہے تو وہ اسے مار کر زمین پر لٹا دیتے ہیں پھر ایک آدمی زمین پر سے نو پتے چُن کر لاتا ہے اور ان پتوں کو سُوَر کے جسم سے چُھواتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح پتیاں درخت سے زمین پر گر پڑیں اسی طرح نو عدد سُوَر بھی ان کے گڑھوں میں گر پڑیں گے۔

سحر کے اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم دوبارہ حاملہ عورت کی مورتیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ پرانی قومیں عملِ تولید اور پودوں کے نامیاتی عمل کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں۔ چنانچہ بعض پس ماندہ قومیں اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً جزائر نکوبار (بحرِ ہند) کے باشندوں کا اعتقاد ہے کہ اگر حاملہ عورت کھیت میں بیج بوئے تو فصل بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس قسم کے خیالات یورپ کے کاشت کاروں میں بھی رائج ہیں۔ مثلاً جنوبی اٹلی کے کاشت کاروں کا عقیدہ ہے کہ حاملہ عورت اگر بیج بوئے یا درخت لگائے تو فصل اچھی ہوتی ہے۔[۲] اور چند صدی پیش تر روما اور یونان کے توہم پرست لوگ اناج اور زمین کی دیوی کو حاملہ عورت کی قربانی پیش کرتے تھے۔ بعض پرانی قوموں میں تو یہ عقیدہ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تمام پودے اور درخت عورت کی فرج سے اُگتے ہیں۔ مثلاً مرکندیہ پران میں پیداوار کی دیوی یوں خطاب کرتی ہے:

''اس کے بعد اے دیوتاؤ میں ساری دنیا کو حیات بخش سبزیوں سے نوازوں

گی۔ یہ سبزیاں تیز بارش میں میرے جسم سے اُگیں گی۔ (آ تما دیہہ سمئے بھولے) اور میں زمین پر سکمبھری کہلاؤں گی"۔ (ہریالی پیدا کرنے والی)

دیوی کا یہ دعویٰ علامتی یا شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ اس کی تصدیق ہڑپہ کی مہریں کرتی ہیں۔ یہ مہریں کم از کم ساڑھے تین ہزار برس پرانی ہیں۔ ایک مہر میں برہنہ عورت سر کے بل کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں پھٹے ہوئے ہیں اور اس کی فرج سے ایک پودا اُگ رہا ہے۔ مہر میں دو برہنہ شکلیں اور بھی ہیں اور درمیانی جگہ میں کوئی تحریر کھدی ہوئی ہے۔ اس مہر میں یقیناً کسی ساحرانہ رسم کی نقش گری کی گئی ہے۔ دوسری مہر بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اس میں ایک پودا زمین سے اُگ رہا ہے۔ ایک برہنہ عورت پودے کے پاس کھڑی ہے اور دوسری گھٹنوں کے بل بیٹھی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ پودے کی شاخ کو چھو رہے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک بیل کھڑا عورتوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس مہر کی ساحرانہ نوعیت بالکل واضح ہے۔

پہلی مہر پر تبصرہ کرتے ہوئے سرجان مارشل لکھتا ہے کہ:

> "جہاں تک مجھے معلوم ہے مادرِ ارض کی یہ بے مثال مورت ہے۔ مگر عورت کی فرج میں سے پودے کا اُگنا اس زمانے کے لوگوں کے لیے حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ چنانچہ اُتر پردیش میں بٹیا کے مقام پر گپتا عہد کی ایک مورتی ملی ہے۔ اس مورتی کی فرج کے بجائے گردن سے کنول کا ایک پودا نکلا ہوا ہے۔"

ان مثالوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ زراعت کے ابتدائی دور میں عراق میں بھی اُموی نظام رائج تھا۔ کھیتی باڑی عورتیں کرتی تھیں اور کھیتی باڑی کی رسموں میں حاملہ عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ حاملہ عورت کی تخلیقی صلاحیت اور زمین کی زرخیزی میں بہت گہرا تعلق ہے۔ حاملہ عورت کی مورتیاں اسی عقیدے کا مظہر تھیں۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ ابتدائی انسان ان مورتیوں کی پوجا کرتا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حاملہ عورت کی مورتیاں رسومِ سحر میں استعمال ہوتی تھیں۔ پرستش یا عبادت کا محرک رضا جوئی کا جذبہ ہوتا تھا۔ یعنی انسان کسی مافوق الفطرت قوت سے امداد و اعانت کی التجا کرتا

ہے۔اس کے برعکس سحر کا محرک تسخیر قدرت کا جذبہ ہوتا ہے۔اسی بنا پر فریزر نے سحر کو ''ساقط سائنس اور ناقص آرٹ'' سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ لغاتِ عرب میں سحر کے معنی قلبِ ماہیت کے ہیں۔یعنی کسی شے میں ایسی تبدیلی کر دینا کہ اس کی اصل حقیقت میں فرق آ جائے۔ مثلاً سحرۃ الفِدت کے معنی چاندی پر کسی اور دھات کا پانی چڑھانے کے ہوتے ہیں۔پس سحر کے معنی مادّے میں تبدیلی کے ہوتے ہیں اور یہی سائنس کا بھی عمل ہے اور سحرہ، بکلامہ کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی باتوں سے سننے والے کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کا ہم خیال ہو گیا۔[۳]

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ابتدائی انسان کسی مافوق الفطرت قوت کا شعور نہ رکھتا تھا۔وہ ساری کائنات کو ایک وحدت تصور کرتا تھا اور یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کائنات سے پرے کوئی اور ہستی بھی ہے جس نے کائنات کو خلق کیا ہے۔آگے چل کر جب اس ذہن نے دیوی دیوتا خلق کیے تب بھی اس کے نزدیک ان دیوی دیوتاؤں کی حیثیت مظاہرِ قدرت کی شخصی تشکیل سے زیادہ نہ تھی۔اس کے ذہن میں تو پرستش کا مفہوم وہ بھی نہیں تھا جو ہمارے ذہن میں ہے۔وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کی عبادت اس معنی میں نہیں کرتا تھا جس معنی میں ہم خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں۔ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ دیوی دیوتا دراصل اس کے قومی ہیرو تھے جن کو اس نے دیوی دیوتاؤں کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

مگر ہمارے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ ابتدائی انسان حاملہ عورت کی مورتی کی باقاعدہ پوجا نہیں کرتا تھا بلکہ ان کو رسومِ سحر میں استعمال کرتا تھا۔اس مسئلے سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر بریفالٹ اپنی کتاب ''مائیں'' میں لکھتا ہے کہ:

> ''دنیا کی تمام غیر مہذب (پس ماندہ) قوموں کی نگاہ میں زراعت کے فن کا بیش تر دارومدار قوتِ سحر پر ہوتا ہے۔وہ اپنے ہنر اور جسمانی محنت سے زیادہ سحر کی قوت پر اعتماد کرتی ہیں''۔

بریفالٹ نے اس دعوے کی تائید میں بہ کثرت مثالیں پیش کی ہیں مثلاً وہ لکھتا ہے کہ یورپ سے امریکہ ہجرت کرنے والے فرنگیوں نے جب وہاں کھیتی باڑی شروع کی تو امریکہ کے پرانے باشندوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ نو آباد کار لوگ جوار اور مکئی کی کاشت کرتے

وقت نہ کوئی منتر پڑھتے ہیں اور نہ ساحرانہ رسمیں ادا کرتے ہیں۔ شمالی بورنیو کے جزیرے میں رہنے والی ڈائنک قوم کاشت کے وقت متعدد رسمیں مناتی ہے۔ قدیم میکسیکو میں تو ہر زرعی کام کے آغاز سے پہلے افزائش کی دیوی کی رسمیں منائی جاتی تھیں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی پس ماندہ قومیں اب تک زرعی کاموں کا آغاز جادو کی رسموں سے کرتی ہیں۔ یہی کیفیت افریقہ کی ہے۔ وہاں سیرالیون میں رروبا قوم کی عورتیں جادو کے منتر پڑھ کر ایک سفوف تیار کرتی ہیں اور اس سفوف کو چاول کے کھیتوں میں چھڑکتی ہیں تا کہ فصل اچھی ہو۔

فریزر نے ایک پس ماندہ قوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی عورتیں حلقہ بنا کر رقص کرتی ہیں۔ رقص کی سرغنہ کے ہاتھ میں مکئی کا ایک بھٹہ ہوتا ہے۔ اس بھٹے میں ایک لکڑی پیوست کر دی جاتی ہے اور وہ عورت اس لکڑی کو ہاتھ میں اٹھا کر ناچتی ہے۔ اسی طرح ہداستہ قوم کی عورتیں مکئی، لوکی، کدو اور تربوز کو لکڑیوں میں پیوست کر کے ناچتی ہوئی ایک خاص مقام تک جاتی ہیں وہاں پہنچ کر عورتیں اپنے سب کپڑے اتار دیتی ہیں اور تب قبیلے کا بزرگ آدمی ان کے سروں پر اور پھلوں پر پھُنکا ہوا پانی چھڑکتا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ لوک ناچوں اور لوک گیتوں کا تعلق ہر ملک میں زراعت ہی کی کسی نہ کسی رسم سے رہا ہے بلکہ علما کا خیال تو یہ ہے کہ ناچ اور گانے کی ابتدا ہی زراعت کی رسموں سے ہوئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پرانی قوموں کے سبھی تیوہار کھیتی باڑی ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

غرضیکہ پرانی قوموں کے زرعی رسوم اور دورِ حاضرہ کی پس ماندہ قوموں کے طرزِ معاشرت کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مادرِ ارض کی جو مورتیاں جرمو اور حلاف سے نکلی ہیں ان کا تعلق زرعی افزائش کی ساحرانہ رسموں سے تھا۔

اور جب افسوں طرازی کا دور آیا تو مادرِ ارض کو اہلِ عراق نے نن ہُورسگ کا لقب دیا۔ سومیری اور عکادی گیتوں اور بھجنوں میں اس کے متعدد نام ملتے ہیں۔ وہ نن تو ہے جو "سب کو جنتی ہے" اور وہ "نگ۔زی۔گال۔دم۔می" ہے۔ یعنی ہر اس چیز کو جنم دینے والی ہے جس میں جان ہے۔ یوں تو سومیری اور عکادی داستانوں میں نن ہورسگ کا ذکر بار بار آتا ہے مگر ان میں

سب سے معنی خیز داستان نن ہورسگ اوران کے معاشقے کی ہے جو میٹھے پانی کا دیوتا بھی تھا اور دانائی، فراست اور علوم وفنون کا بھی۔ جادو منتر کرنے والے اس کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ اس داستان کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انجیل میں آدم وحوا کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ نن ہورسگ کی داستان سے بہت مِلتا جُلتا ہے۔ مگر یہ داستان اس عہد کی تصنیف معلوم ہوتی ہے جب اہل عراق عورت مرد کی مباشرت اور تخلیق کے عمل میں جو رشتہ پایا جاتا ہے اس سے آگاہ ہو چکے تھے ورنہ وہ ہرگز یہ نہ کہتے کہ نن ہورسگ (زمین) اور اِنکی (پانی) کے میل سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

نن ہورسگ کی داستان کا محلِ وقوع دِلمون کی سرزمین ہے۔ دِلمون جہاں فراوانی اور فراغت ہے، جوانی اور تندرستی ہے، امن اور سکون ہے۔ اس لحاظ سے دلمون جنت سے کم نہیں۔

دِلمون جو پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے۔
جو روشن اور منّور ہے۔
جہاں اِنکی اپنی زوجہ کے ساتھ رہتا تھا
جہاں کوّوں کی کائیں کائیں نہیں سنائی دیتی۔
جہاں طائرِ موت کی آواز نہیں آتی۔
جہاں شیر کسی کو پھاڑ کر نہیں کھاتا۔
نہ بھیڑیا کسی بھیڑ کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔
جہاں ہلوان کو ہضم کر جانے والا کتا نہیں ہوتا
جہاں بیوائیں نہیں ہوتیں۔
جہاں فاختہ دُکھ سے اپنا سر نہیں جھکاتی۔
جہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ میری آنکھیں دُکھتی ہیں۔
اور نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔
اور نہ کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔
اور نہ کوئی مرد یہ کہتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

جہاں کنواری عورت کو (حیض کے باعث) نہانا نہیں پڑتا۔

جہاں گوئیے کو کسی کا مرثیہ نہیں پڑھنا پڑتا۔

نہ پروہت کو دیوتا کے گرد گھوم گھوم کر آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

اور نہ کسی شخص کو شہر کی دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر فریاد کرنی پڑتی ہے

دِلمون میں میٹھے چشموں کی افراط اور اناج کی بہتات ہے۔ مگر اِنکی وہاں اکیلا رہتا ہے۔ تب نن ہورسگ وہاں نمودار ہوتی ہے اور اِنکی اس کے ساتھ مباشرت کرتا ہے۔

''اِنکی نے اپنی منی نن ہورسگ کے رحم میں انڈیل دی

اور نن ہورسگ نے اس منی کو قبول کر لیا۔ انکی کی منی کو

اور ایک مہینہ ایک دن ہو گیا

اور دو مہینے دو دن ہو گئے

اور تین مہینے تین دن ہو گئے

اور چار مہینے چار دن ہو گئے

اور پانچ مہینے پانچ دن ہو گئے

اور چھ مہینے چھ دن ہو گئے

اور سات مہینے سات دن ہو گئے

اور آٹھ مہینے آٹھ دن ہو گئے

اور نو مہینے نو دن ہو گئے

اور نویں دن وہ ماں بن گئی۔

اور اس نے دریا کے کنارے نن مُو کو جنا''۔

اور جب نن مو جوان ہوئی تو انکی نے اس کے ساتھ بھی مباشرت کی اور نن مُو حاملہ ہو گئی اور نو مہینے کے بعد اس کے پیٹ سے نن کرا پیدا ہوئی اور جب نن کرا جوان ہوئی تو اِنکی نے اس کے ساتھ بھی مباشرت کی اور نن کرّا بھی حاملہ ہوئی اور اس کے پیٹ سے اِتُّو پیدا ہوئی۔ تب نن ہورسگ نے اُتُّو سے کہا کہ دیکھ اِنکی تیری گھات میں دلدل میں چھپا بیٹھا ہے اور تیرے ساتھ

سونے کے لیے بے چین ہے لیکن جب تک وہ کھیرے، سیب اور انگور تجھے لا کر نہ دے تو اس کے ساتھ ہرگز نہ سونا۔ اُتُو نے نن ہورسگ کی ہدایت پر عمل کیا اور جب اِنکی اس کے پاس آیا اور اس کو پیار کرنا چاہا تو اُتو نے کہا کہ جب تک تم میرے لیے کھیرے، سیب اور انگور نہیں لاؤ گے میں تمہاری خواہش پوری نہ کروں گی۔ تب اِنکی باغبان کے پاس گیا اور اس سے کہا اگر تو مجھے اپنے باغ کے پھل دے تو میں تیرے کھیت سیراب کردوں گا۔ باغبان نے ان کی شرط مان لی اور پھل اِنکی کے حوالے کیے۔ اِنکی پھلوں کا ٹوکرا لے کر اُتو کے دروازے پر آیا۔

اُتُو نے خوشی خوشی اپنے گھر کا دروازہ کھولا
اور اِنکی نے حسین عورت کو کھیرے دیے
سیب دیے اور انگور دیے
اور اِنکی نے اُتُو کے ساتھ اپنی آرزو پوری کی
اس نے اُتُو کو لپٹایا اور اس کی گود میں لیٹ گیا
اِنکی نے اُتُو کے رحم میں اپنی منی انڈیل دی"۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُتُو حاملہ نہیں ہوئی بلکہ نن ہورسگ نے اِنکی کے بیج سے آٹھ پودے پیدا کیے۔ ایک شہد کا پودا تھا، دوسرا املتاس کا پودا تھا، تیسرا کسی خار دار درخت کا پودا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اِنکی نے اپنے دلدلی مسکن سے یہ پودے اُگتے ہوئے دیکھے تو اپنے وزیر اِزی مُود Isimud سے پوچھا کہ اِزی مُود بتا یہ کیا پودے ہیں اور کس کام آتے ہیں۔ اِزی مُود نے جواب دیا کہ میرے آقا ان پودوں کو کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔ پس اِنکی نے ان پودوں کو کاٹ کر کھایا۔ نن ہورسگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اِنکی نے پودوں کو کھالیا ہے تو وہ بہت خفا ہوئی اور اس نے اِنکی کو سراپ دیا کہ:

جب تک تو مرے گا نہیں میں تجھ کو
زندگی کی آنکھوں سے نہ دیکھوں گی

یہ کہہ کر مادرِ کائنات غائب ہوگئی۔ نن ہورسگ کی خفگی سے دیوتاؤں کی مجلس میں کھلبلی مچ گئی مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مادرِ کائنات کو کیسے منایا جائے اور اِنکی کو جو سراپ کا مارا ہوا

درد سے تڑپ رہا تھا کیسے شفا دی جائے۔تب لومڑی نے عرض کی کہ اگر میں نن ہورسگ کو منالاؤں تو مجھے کیا انعام ملے گا۔ ہوااور طوفان کے دیوتا اِن لیل نے جو سب دیوتاؤں کا سردار تھا کہا کہ

اگر تو نن ہورسگ کو میرے سامنے لائے
تو میں اپنے شہر نیفر ہو میں
تیرے لیے درخت اور پودے لگاؤں گا
اور سب لوگ تیرے گُن گائیں گے

لومڑی نن ہورسگ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ وہ اُر، ایرک، لارسا، نیفر، غرضیکہ ہر جگہ نن ہورسگ کو ڈھونڈتی پھری اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ جب نن ہورسگ دیوتاؤں کے دربار میں پہنچی تو سب دیوتا اس سے لپٹ گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے کہ اے مادرِ کائنات تو اِنکی کا قصور معاف کردے اور اس کو اپنے سراپ سے نجات دے۔

تب نن ہورسگ نے اپنے رحم کا منہ کھول دیا۔
اور اِنکی کو گود میں بٹھا کر پوچھا:
اے میرے بھائی تیرے کہاں درد ہے
اِنکی نے کہا میرا.............دکھتا ہے
نن ہورسگ بولی: وہاں سے میں ابو دیوتا پیدا کروں گی
اس نے پھر پوچھا: میرے بھائی تیرے کہاں درد ہے۔
اِنکی نے کہا: میرے جبڑے دُکھتے ہیں
''میں وہاں سے نن تُلا کو پیدا کروں گی۔''
میرے بھائی تجھے کہاں درد ہے
میرے دانت دُکھتے ہیں
میں وہاں سے نن سوتو کو پیدا کروں گی۔
میرے بھائی' تیرے کہاں درد ہے

میرا منھ دُکھتا ہے۔
میں وہاں سے نن کاسی کو پیدا کروں گی۔
میرے بھائی! تیرے کہاں درد ہے؟
میرا بازو دُکھتا ہے۔
میں وہاں سے ازیموا کو پیدا کروں گی۔
میرے بھائی! تیرے کہاں درد ہے۔
میری پسلیاں دُکھتی ہیں۔
میں وہاں سے نن تی کو پیدا کروں گی۔
اور اَبُو تمام پودوں کا بادشاہ ہوگا۔

یہ نظم جن لوحوں پر لکھی ہوئی ملی ہے وہ دو ہزار قبلِ مسیح کی تحریر ہیں لیکن ان کا مزاج اور ماحول بلاشبہ چار پانچ ہزار قبل مسیح کا ہے جب کہ اہلِ عراق زراعت کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے اور ان کے معاشرے میں اُموی نظام رائج تھا۔ چنانچہ نظم کو حشو و زوائد سے پاک کر کے بغور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس داستان کی ہیروئن دراصل مادرِ کائنات ہے۔ وہی درختوں اور پودوں کو پیدا کرتی ہے اور وہی دیوی دیوتاؤں کو بھی جنم دیتی ہے اور بڑے سے بڑا دیوتا بھی اگر اس کے اُمورِ افزائش و نمو میں مداخلت کی جسارت کرتا ہے تو مادرِ کائنات اسے سزا دیتی ہے۔

عِشتار

اسی دور کی دو دیویاں اور بھی ہیں۔ ایک محبت اور افزائش کی دیوی عِشتار اور دوسری موت اور ظلمات کی دیوی اریش کی گل۔ عِشتار موسمِ بہار کی نمائندہ ہے جس میں سبزہ ہرا ہوتا ہے، درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اناج کے پودوں میں بالیاں نکلتی ہیں۔ اس کے برعکس اریش کی گل موسمِ سرما کی نمائندہ ہے۔ جن ملکوں میں کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے وہاں سردی کے موسم میں پتیاں جھڑ جاتی ہیں اور درخت ٹُنڈ مُنڈ ہو جاتے ہیں اور زمین پر ہریالی کا نام و نشان باقی نہیں رہ جاتا۔ زراعت کے ابتدائی دنوں میں جب لوگ موسمی تغیرات کے اصل سبب سے واقف نہ تھے تو خزاں و بہار کی یہ آمد و رفت بڑی حیرت انگیز معمہ رہی ہوگی۔ چنانچہ ان تبدیلیوں

کی توجیہ اس طرح کی گئی کہ بہار کو تو حسن اور افزائش کی دیوی سے تعبیر کیا گیا اور خزاں کو موت اور ظلمات کی دیوی سے۔ان کے عقیدے میں ظلمات کی دنیا زمین کے نیچے تھی۔

عِشتار کی شخصیت جتنی دلکش اور رنگین ہے اتنی ہی آفاقی بھی ہے۔ وہ سومیری دیو مالا میں اِنانا ہے۔ عکاّدی اور اشوری دیو مالا میں عِشتار ہے، فونیقی دیو مالا میں اشیراۃ ہے، مصر میں اِزیس، تحوت، اور حتور ہے، فلسطین میں اَنات، اشیراۃ اور عشردت ہے۔ایرن میں شالا، اناہیتا اور نانیا ہے، ہندوستان میں دُرگا، گوری، اُما، اُشا، سرسوتی اور رتی ہے اور یونان میں ایفرودتی اور آرٹے میس ہے۔ عربوں کی زہرہ اور مشتری بھی وہی ہے جس نے ہاروت اور ماروت کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر کے ان سے اسم اعظم کا راز معلوم کیا تھا اور ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی تھی۔۵

سلطنتِ بابل کا ایک شاعر سولھویں صدی قبلِ مسیح میں عِشتار کی ثنا و صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”تعریف اس دیوی کی جو سب دیویوں سے افضل ہے
لائقِ احترام ہے وہ ذات جو سب لوگوں کی ملکہ ہے
جو خداوندِ افلاک میں سب سے عظیم ہے
ستائش کے قابل ہے عِشتار
محبت اور شادمانی اس کا لباس ہے
وہ دلکشی، قوّت اور شہوت سے بھرپور ہے
اس کے ہونٹ میٹھے ہیں
اس کے منھ میں زندگی ہے
اسے دیکھ کر سب کی باچھیں کھل جاتی ہیں
اس کا جسم دلآویز ہے
اور اس کی آنکھیں روشن ہیں
دیویاں اس سے مشورہ کرتی ہیں

اور ہر چیز کی قسمت اس کے ہاتھ میں ہے
اس کی ایک نگاہ سے خوشی پیدا ہوتی ہے
وہ سب کی محافظ اور سرپرست ہے
شفقت اور مہربانی اس کا مسکن ہے
اور وہ سب کی رکھوالی ہے
خواہ وہ کنیز ہو، آزاد دوشیزہ ہو یا کسی کی ماں ہو
سب اسی کو پکارتے ہیں جو عورتوں میں یکتا ہے۔
اس کی عظمت کا کون ثانی ہے؟
اس کے فیصلے عمدہ، اعلیٰ اور پائیدار ہوتے ہیں۔
عِشتار! کون تیری ہمسری کر سکتا ہے
دیوتاؤں میں سب سے زیادہ مانگ اس کی ہے
اس کا رتبہ اعلیٰ ہے
سب اس کے حکم کی عزت کرتے ہیں
اس کا حکم سب پر بالا ہے
عورت اور مرد سب اس کا احترام کرتے ہیں
سب اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں
سب اس کے سامنے جھک جاتے ہیں
سب اس سے روشنی پاتے ہیں
وہ سب کی ملکہ ہے"۔

یوں تو عراقی دیو مالا میں عِشتار کا تذکرہ بار بار آتا ہے لیکن عِشتار کے متعلق دو داستانیں ایسی ہیں جن سے عِشتار کے افزائشی کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی داستان میں عِشتار تموند سے شادی کرتی ہے جو گڈریا ہے۔ دوسری داستان میں وہ اپنے جواں مرگ شوہر تموز کی تلاش میں ظلمات کا سفر کرتی ہے اور بڑی بڑی سختیاں جھیلنے کے بعد آخر کار کامیاب واپس آتی ہے۔

دراصل تموز کی موت اور واپسی موسموں کی تبدیلی کی علامت ہے۔ سردی میں جب گھاس پات پھل پھول سب سوکھ جاتے ہیں اور زمین پر مُردنی چھا جاتی ہے تو اہلِ عراق اس خزاں کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ افزائش و نمود کی دیوی عِشتار اپنے شوہر کی تلاش میں پاتال چلی گئی ہے اور جب بہار کا موسم آتا ہے تو اس کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ عِشتار اپنے شوہر کے ہمراہ سفر سے خوش و خرم واپس آ گئی ہے۔ چنانچہ مشرقِ قریب کے ہر ملک میں بہار کی آمد پر نوروز کا تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس موقعے پر عِشتار اور تموز کی شادی، تموز کی موت اور پھر تموز کے احیا کے قصوں کو ڈرامائی انداز میں ہر سال پیش کیا جاتا تھا۔

وادیِ دجلہ و فرات کا داستان گو عِشتار کی شادی کا قصہ متھ کی زبان میں یوں بیان کرتا ہے کہ ایک بار اتُو (سورج) نے اپنی بہن عِشتار سے کہا کہ تو تموز گڈریے سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ عِشتار نے اتُو کی تجویز بڑی حقارت سے رد کر دی اور کہا کہ میں تو اِن کمدو دہقان سے شادی کروں گی۔ تموز کو خبر ہوئی تو وہ عِشتار کے پاس گیا اور آخر کار بڑی منت سماجت کے بعد اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ واپسی پر اس کی مڈبھیر اِن کمدو سے ہو گئی۔ تموز نے ان کمدو کو عِشتار کے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بہت خفا ہوا لیکن تموز نے سمجھا بجھا کر اسے بھی راضی کر لیا۔ چنانچہ اِن کمدو اس بات پر تیار ہو گیا کہ تموز، اِن کمدو کی چراگاہ میں جہاں چاہے اپنے مویشی چرائے۔

یہ داستان نیفر کی کھدائی میں تین تختیوں پر کندہ ملی ہے اور ڈھائی ہزار برس قبلِ مسیح کی تحریر ہے۔ اس داستان میں اور ہابیل قابیل کے قصے میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ انجیل کی کتابِ پیدائش کے مطابق قابیل (قائن) دہقان تھا اور ہابیل گڈریا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہابیل اپنے بھیڑ بکریوں کا ہدیہ خداوند کے روبرو لے کر گیا تو خداوند نے اس کا ہدیہ قبول کر لیا مگر جب قابیل اپنے کھیت کی فصل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا تو خداوند نے اس کا ہدیہ رد کر دیا اس لیے قابیل نہایت غضب ناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو قابیل نے ہابیل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ پھر وہاں سے بھاگ گیا اور عدن کے مشرق میں نود کے علاقے میں جا بسا۔

قیاس کہتا ہے کہ فلسطینی یہودیوں نے یہ داستان بابل کی اسیری کے زمانے میں سنی ہوگی اوراس کے مرکزی خیال سے ہابیل قابیل کا قصہ تیار کیا ہوگا۔عراقی کہانی میں گو خون نہیں بہتا لیکن اس کی فضا بھی جارحانہ ہےاوراس میں بھی ردّوقبول کا وہی عنصر موجود ہے جس کے باعث قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔

گڈریےاورکاشت کار کا مناظرہ

اِنانا کا بھائی اتو جو بہادراور جنگ جُو ہے
پاکیزہ اور طاہر اِنانا سے کہتا ہے:
"اے میری بہن تو گڈریے سے شادی کیوں نہیں کرلیتی۔
اس کا مکھن عمدہ ہے
اس کا ہاتھ جس چیز کو چھودیتا ہے وہ چمک اُٹھتی ہے۔
اِنانا! گڈریے تموز سے بیاہ کرلے
تو رضامند کیوں نہیں ہوتی
وہ تیرے ساتھ بیٹھ کر مکھن کھائے گا۔"
"نہیں، میں گڈریے سے شادی نہیں کروں گی
وہ مجھے اپنا نیالباس نہیں پہنائے گا۔
میں تو کاشت کار سے شادی کروں گی
کاشت کار، جو پودوں کی افزائش کرتا ہے۔
کاشت کار، جواناج کی افزائش کرتا ہے۔"
تموز انانا کے پاس جاتا ہےاور کہتا ہے کہ:
"کاشت کار کے پاس مجھ سے زیادہ کیا چیز ہے
اِن کمیدو تو خندق، بنداور ہل کا آدمی ہے
اس کے پاس مجھ سے زیادہ کیا چیز ہے؟

اگر وہ مجھے اپنا کالا کپڑا دے سکتا ہے
تو میں اسے اپنی کالی بھیڑ دے سکتا ہوں
اگر وہ مجھے اپنا سفید کپڑا دے سکتا ہے
تو میں اسے اپنی سفید بھیڑ دے سکتا ہوں
اگر وہ میرے لیے کھجور کی نہایت عمدہ شراب انڈیل سکتا ہے
تو میں اس کے لے کسم کا دودھ انڈیل سکتا ہوں
اگر وہ مجھے عمدہ روٹی کھلا سکتا ہے
تو میں اس کو شہد آمیز پنیر کھلا سکتا ہوں
اس کے پاس مجھ سے زیادہ کیا چیز ہے''؟

تموز کی یہ دلیلیں سن کر اِنانا لاجواب ہوجاتی ہے اور اس سے شادی کا وعدہ کر لیتی ہے۔ تموز خوش خوش واپس آتا ہے اور اپنے بھیڑ بکریوں کو دریا کے کنارے چرانے لے جاتا ہے۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ کاشت کار ان کمیدو سے ہوتی ہے اور وہ ان کمیدو سے جھگڑا کرنے پر تُل جاتا ہے مگر اِن کمیدو بڑا صلح پسند انسان ہے وہ ایک عورت کی خاطر خون خرابہ نہیں کرنا چاہتا۔

''اے گڈریے! میں تیرا دشمن نہیں ہوں
میں تجھ سے کیوں لڑوں
تیری بھیڑیں ساحل پر اُگی ہوئی گھاس شوق سے چریں
اور میری چراگاہ میں شوق سے گھومیں
اور اِریک کے چمکیلے کھیتوں میں دانے شوق سے کھائیں
اور تیرے ہلوان میری نہر اُنوں میں شوق سے پانی پیں۔''

تموز کاشت کار کی باتوں سے خوش ہوجاتا ہے اور اسے اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔

''اے کاشت کار۔ تو میری شادی میں دوست بن کر آ''

اور اِن کمیدو کہتا ہے کہ:

''میں تیرے لیے گیہوں لاؤں گا۔

میں تیرے لیے واپس لاؤں گا"۔

عِشتار کا سفرِ ظلمات

عِشتار اور اریشؔ کی گل سگی بہنیں ہیں۔ عِشتار ملکہء فلک ہے اور اریشؔ کی گل ملکہء ظلمات، اریشؔ کی گل عِشتار کی جانی دشمن ہے۔ عِشتار کا محبوب شوہر تموز ظلمات میں قید ہے:

وہ اندھیرا گھر
جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا
وہ راستہ جس سے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں
وہ مکان جس میں روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا
جہاں لوگ دُھول پھانکتے اور کیچڑ کھاتے ہیں
جہاں کی پوشاک پرندوں کی سی ہوتی ہے
اور جہاں دروازوں اور تالوں پر گرد جمی رہتی ہے۔

ایک دن عِشتار کے دل میں خیال آیا کہ چل کر ظلمات کی سیر کرنی چاہیے۔ شاید تموز سے ملاقات ہو جائے۔ اس نے ساتوں سنگار کیے۔ ہیروں کا تاج سر پر رکھا، ماتھے پر جھومر لگایا، گلے میں موتیوں کا ہار پہنا، کان میں بندے ڈالے، چھاتیوں کو سینے بند سے کسا، انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنیں، آنکھوں میں سرمہ لگایا، شاہی لباس زیبِ تن کیا اور لاجوردی عصا ہاتھ میں لے کر ظلمات کو روانہ ہوئی۔ البتہ چلتے وقت اپنے وزیر ننشوبر سے کہتی گئی کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آتی ہے۔ تم ذرا خبردار رہنا اور اگر میں تین دن کے اندر ظلمات سے واپس نہ آؤں تو:

اپنی نالہ وزاری سے آسمان سر پر اٹھا لینا
میرے لیے اپنی آنکھیں نوچنا۔ میرے لیے اپنا منھ نوچنا
اور فریادیوں کی مانند فقط ایک کپڑا پہن کر
میرے باپ اِن لِیل کے دربار میں جانا
اور کہنا کہ اپنی بیٹی کو ظلمات میں ہلاکت سے بچا۔

تیری اچھی دھات پاتال کی دُھول سے ڈھکنے نہ پائے۔

تیرا اصلی لاجورد پتھر پھوڑوں کے ہاتھوں میں ریزہ ریزہ ہونے نہ پائے

اور اگر اِن لیل تیری فریاد نہ سنے تو ننا (چاند دیوتا) کے پاس اُر جائیو جہاں اس کا بڑا امندر ہے اور اگر ننا بھی تیری فریاد نہ سنے تو اُریدو جائیو اور اِنکی سے فریاد کیجیو:

اِنکی جو دانائی کا آقا ہے

جو زندگی کی خوراک سے واقف ہے

جو زندگی کے پانی سے واقف ہے

وہ ضرور مجھے زندہ واپس لائے گا

وزیر کو یہ ہدایت دے کر عِشتار نے ظلمات کی راہ لی اور اریش کی گل کے قصرِ ظلمات کے سامنے پہنچ کر آواز دی کہ:

پھاٹک کھولو ورنہ میں دروازوں کو توڑ ڈالوں گی

ان کی چولیں اکھاڑ دوں گی

اور مُردوں کو زندہ کر دوں گی

یہاں تک کہ ان کی تعداد زندوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔

دربان نے پوچھا کہ تو کون ہے جو بن بلائے یہاں آنا چاہتی ہے۔ عِشتار نے جواب دیا کہ میں عِشتار ہوں اور وہاں سے آئی ہوں جہاں سورج چمکتا ہے۔ دربان نے کہا کہ اگر تو عِشتار ہے اور وہاں سے آئی ہے جہاں سورج چمکتا ہے تو یہاں کیوں آئی ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں جاتا۔ عِشتار نے کہا کہ میری بڑی بہن اریش کی گل کا شوہر گوگل آنا مارا گیا ہے اور میں اس کے جنازے میں شریک ہونے آئی ہوں۔ دربان نے کہا اچھا تو انتظار کر۔ میں ذرا ملکہ سے پوچھ آؤں۔ پس دربان ملکہ کے پاس گیا اور سارا ماجرا اس سے بیان کیا:

اریش کی گل کا چہرہ زرد ہو گیا اور ہونٹ کالے ہو گئے۔

اس نے دل میں سوچا کہ عِشتار یہاں کیا کرنے آئی ہے

کیا مجھے اب روٹی کی جگہ چکنی مٹی

اور شراب کی جگہ گدلا پانی پینا پڑے گا
کیا مجھے اب ان لوگوں کا ماتم کرنا ہوگا
جو اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ کر یہاں آئے ہیں
کیا مجھے اب ان نازک اندام بچوں کے لیے آنسو بہانے ہوں گے
جن کو وقت سے پہلے یہاں بھیجا گیا تھا۔

اس نے دربان کو حکم دیا کہ جا کر دروازہ کھول دے۔

دربان واپس آیا اور عِشتار سے کہا چل تجھے ملکہ بلاتی ہے۔ جب عِشتار پہلے پھاٹک میں داخل ہوئی تو دربان نے تاج اس کے سر سے اتار لیا۔ عِشتار خفا ہونے لگی تو دربان نے کہا کہ خفا مت ہو۔ یہاں کا دستور ہی یہ ہے۔ جب عِشتار دوسرے پھاٹک میں داخل ہوئی تو دربان نے لاجوردی عصا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسی طرح دربان نے تیسرے پھاٹک پر گلے کا ہار، چوتھے پھاٹک پر کانوں کے بندے، پانچویں پھاٹک پر ہاتھ کی انگوٹھیاں، چھٹے پھاٹک پر سینہ بند اور ساتویں پھاٹک پر بدن کی پوشاک اتار لی۔ اب عِشتار بالکل برہنہ تھی۔

دربان عِشتار کو اسی حالت میں اِریش کی گل کے روبرو لے آیا۔ اریش کی گل اس وقت دربار میں تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ عِشتار کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی اور اپنے وزیر نمتار سے یوں مخاطب ہوئی۔

نمتار! اسے میرے محل میں لے جا کر بند کر دے
اور ساٹھوں بلاؤں کو اس پر چھوڑ دے:
آنکھ کی بلا کو آنکھوں پر
کوٹھے کی بلا کو کوٹھوں پر
دل کی بلا کو دل
پاؤں کی بلا کو پاؤں پر
سر کی بلا کو سر پر
اس کے جسم کے ہر حصے پر ایک بلا چھوڑ دے

قضا کے ساتوں حاکم وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھیں عِشتار کے چہرے میں پیوست کر دیں۔ ان کی آواز پر عِشتار کا دَم نکل آیا اور اس کی لاش ایک لکڑی سے لٹکا دی گئی۔

جب تین دن اور تین راتیں گزر گئیں اور عِشتار واپس نہ آئی تو اس کا وزیر بَن شوبر بہت گھبرایا:

کیوں کہ بیلوں نے گایوں پر سوار ہونا ترک کر دیا تھا
گدھوں نے گدھیوں کو نطفہ دینا ترک کر دیا تھا
مرد نے عورت کو حمل دینا ترک کر دیا تھا
مرد اپنے کمرے میں سوتا تھا اور عورت اپنے کمرے میں

پس وہ بھاگا ہوا نیفر پہنچا اور اِن لیل سے فریاد کی لیکن ملکۂ ظلمات کے خوف سے اِن لیل نے اس کی فریاد رسی سے انکار کر دیا۔ وہ اُرگیا اور ننّا سے فریاد کی لیکن ننّا نے بھی اس کی فریاد نہ سنی تب وہ اِنکی کے پاس اریدو گیا جب انکی نے یہ سنا کہ عِشتار پاتال سے واپس نہیں آئی ہے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے ناخن سے تھوڑی سی میل نکالی اور اس سے کرگارّو ایک پرندہ بنایا۔ پھر اپنے حنا آلودہ ہاتھ کے ناخن سے تھوڑی سی میل نکالی اور اس سے ایک اور پرندہ کلاتورّو بنایا۔ کرگارّو کو اس نے غذائے حیات دی اور کلاتورّو کو آبِ حیات دیا اور ان سے کہا کہ فوراً ظلمات میں جاؤ اور یہ چیزیں عِشتار کی لاش پر ساٹھ بار چھڑکو۔ عِشتار زندہ ہو جائے گی۔

پرندے جب ظلمات میں پہنچے تو اریش کی گل انہیں دیکھ کر بہت ناراض ہوئی لیکن خداوند انکی کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے پرندوں کو سراپ دیا کہ:

شہر کی گندی نالیاں تمہاری غذا ہوگی
پرنالوں کا پانی تمہاری پیاس بجھائے گا
دیوار کا سایہ تمہارا مسکن ہوگا
گھر کی چوکھٹ تمہاری خواب گاہ بنے گی
اور ننگے بھوکے تمہارے گالوں پر طمانچہ ماریں گے

تب اریش کی گل نے اپنے وزیر نمتار سے کہا کہ:

عِشتار کے عہدِ شباب کے عاشق تموز کو
پاک پانی سے نہلاؤ اور میٹھا تیل اس کے جسم پر ملو۔
اور سرخ لباس پہناؤ
اور اس کے ہاتھ میں لاجورد کی بانسری دو
تا کہ وہ یہاں سے بانسری بجاتا ہوا جائے۔

تموز کی یہی داستان شام اور فونیقیا کے راستے ایشیائے کوچک پہنچی اور وہاں سے یونان منتقل ہوئی۔ چنانچہ یونانی دیو مالا میں محبت کی دیوی الفرودتی اپنے جواں مرگ عاشق آرفیس کی تلاش میں ظلمات کا سفر کرتی ہے اور آرفیس بانسری بجاتا ہوا واپس آتا ہے۔ مصر میں اس داستان نے اِزیس اور اُزریس کی شکل اختیار کر لی۔

کہتے ہیں کہ اُزریس زمین کے دیوتا گیبؔ اور ملکہءِ فلک نوت کی ناجائز اولاد تھی۔ جب سورج دیوتا رعؔ کو پتہ چلا کہ اس کی بیوی نوت نے بے وفائی کی ہے تو اس نے اُزریس کو سراپ دیا۔ ملکہءِ فلک نے اُزریس کی ولادت کے دوسرے دن حورسؔ کو جنم دیا۔ تیسرے دن ساتتؔ کو چوتھے دن اُزریسؔ کو اور پانچویں دن نفتیسؔ کو۔ بڑے ہو کر ساتت نے اپنی بہن نفتیس سے شادی کی اور اُزریس نے اِزیس سے۔

جس وقت اُزریس کو مصر کی بادشاہت تفویض ہوئی اس وقت مصر کے باشندے بالکل جنگلی، وحشی اور آدم خور تھے لیکن اُزریس نے جو اور گیہوں کے جنگلی پودے تلاش کیے اور اہل مصر کو کاشت کاری کا فن سکھایا۔ تب ان لوگوں نے آدم خوری ترک کر دی اور اناج پیدا کرنے لگے۔ اُزریس نے انہیں درختوں کا پھل کھانا اور انگور کی شراب بنانا بھی سکھایا۔ اُزریس کی آرزو تھی کہ دنیا کے سب لوگ تہذیب کی ان برکتوں سے واقف ہو جائیں لہٰذا اس نے اپنی بہن اور بیوی اِزیس کو مصر کے تخت پر بٹھایا اور خود دنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب وہ اس طویل سفر سے بنی نوعِ انسان کی نذروں اور دعاؤں سے لدا ہوا وطن واپس آیا تو اہلِ مصر نے اس کا شاندار خیر مقدم کیا اور اسے دیوتا کا لقب دیا لیکن اس کے بھائی ساتتؔ نے اس کے خلاف سازش کی۔ اس نے کسی طرح اُزریس کے بدن کی ناپ حاصل کی اور اس کے مطابق ایک نہایت حسین تابوت

بنوایا۔ ایک روز جبکہ شراب کا دور چل رہا تھا اور سب لوگ مدہوش ہو رہے تھے تو سا تت نے ہنس کر کہا کہ یہ تابوت میں اس کو دوں گا جس کو یہ پورا ہوگا۔ سب لوگ باری باری تابوت میں اترے مگر کسی کو تابوت پورا نہ اترا۔ سب سے آخر میں اُزریس تابوت میں لیٹا۔ سازشی اسی کے منتظر تھے۔ انھوں نے دوڑ کر تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اس کے پٹ پر پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا اور تابوت کو دریائے نیل میں بہا دیا۔

جب اِزلیس کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی زلفیں کاٹ ڈالیں، ماتمی لباس پہنا اور اپنے شوہر کی لاش کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

ادھر اُزریس کا تابوت بہتے بہتے بحیرۂ روم میں پہنچا اور بحیرۂ روم کی موجیں اسے ببلوس کے ساحل پر لے آئیں اور جس جگہ وہ آ کر رکا وہاں دفعتاً ایک درخت اُگ آیا اور اس نے تابوت کو اپنے تنے میں چھپا لیا اور جب ببلوس کے بادشاہ نے اس درخت کو دیکھا تو اسے یہ درخت بہت پسند آیا اور اس نے درخت کو کٹوا کر اس کے تنے کو اپنے محل میں لگوا لیا۔ اِزلیس کو جب خبر ملی کہ اس کے شوہر کا تابوت ببلوس پہنچ گیا ہے تو اس نے غریب عورت کا بھیس بدلا اور ببلوس روانہ ہو گئی۔ ببلوس پہنچ کر وہ شاہی کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ یہ کنواں اب تو سوکھا پڑا ہے لیکن میرا گائڈ مجھے ببلوس کے فونیقی کھنڈروں میں گھماتا ہوا جب اس کنوئیں پر پہنچا تو کہنے لگا کہ میں ۳۵ سال سے یہاں سیاحوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی ملازمت کا وہ زمانہ یاد ہے جب ببلوس کی عورتیں اس کنوئیں پر پانی بھرنے آتی تھیں مگر اب تو ببلوس کے ہر گھر میں نل لگ گیا ہے۔ میں دیر تک کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا یہی سوچتا رہا کہ کبھی اِزلیس یہاں بیٹھی زار و قطار روئی ہوگی اور یہیں کہیں بادشاہ ملکاندر کا محل ہوگا اور محل کی عورتیں اِزلیس کے پاس آئی ہوں گی اور اِزلیس نے ان کی زلفیں سنواری ہوں گی اور اپنے مقدس جسم کی خوشبو سے ان کے بالوں کو مہکایا ہوگا اور جب ملکہ نے اپنے خواصوں کے سنورے ہوئے بال دیکھے ہوں گے اور ان کے بالوں کی خوشبو سونگھی ہوگی تو اِزلیس کو اپنے بیٹے کی آیا مقرر کیا ہوگا۔

اِزلیس نے شہزادے کو چھاتی سے دودھ نہیں پلایا بلکہ وہ اپنی انگلیاں بچے کو چسا دیتی تھی اور وہ آسودہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن ملکہ نے بچے کو اِزلیس کی انگلیاں چوستے دیکھ لیا تب اِزلیس نے

ملکہ سے سارا ماجرا بیان کر دیا اور درخواست کی کہ لکڑی کا وہ کھمبا جو محل میں لگا ہے مجھے دے دیا جائے۔ اس کے اندر میرے شوہر اُزریس کی لاش پوشیدہ ہے۔ بادشاہ نے کھمبا اِزیس کے حوالے کر دیا۔ اِزیس نے اس کے اندر سے اُزریس کا تابوت نکالا اور کشتی میں بیٹھ کر مصر روانہ ہوگئی۔ مصر پہنچ کر اس نے کشتی کو بوتو کے مقام پر دریائے نیل کے کنارے چھوڑا اور خود اپنے بیٹے حوریس کو دیکھنے چلی گئی۔ قضارا ساتت کا گزر ادھر سے ہوا اور چاندنی رات میں اس نے تابوت کو پہچان لیا اور اُزریس کی لاش کے چودہ ٹکڑے کیے اور ٹکڑوں کو دور دور پھینک دیا۔ اِزیس جب واپس آئی اور لاش کو نہ پایا تو اس نے دیوتاؤں سے فریاد کی اور سورج دیوتا نے اس کی فریاد سن لی اور اِزیس اپنے شوہر کے ٹکڑوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ البتہ اُزریس کا عضوِ تناسل لاپتہ ہوگیا تب اِزیس اور اس کی بہن نفتیس اُزریس کی لاش پر یوں بین کرنے لگیں۔

اپنے گھر واپس آ

دیوتا، تو اپنے گھر واپس آ
تیرا کوئی دشمن نہیں ہے
او حسین نوجوان مجھے دیکھنے واپس آ
میں تیری بہن ہوں تو مجھ سے جدا نہ ہو
میرا دل تیرے لیے بے قرار ہے
اور میری آنکھیں تجھ کو ڈھونڈ رہی ہیں
اس کے پاس آ جو تجھ سے محبت کرتی ہے
اپنی بہن کے پاس آ، اپنی بیوی کے پاس آ
دیوتا اور انسان سب تیرے لیے رو رہے ہیں
میں اتنے زور زور سے پکا کر رہی ہوں
کہ میری آواز عرش تک جاتی ہے
مگر تو نہیں سنتا
میں تیری بہن ہوں جس سے تو محبت کرتا تھا۔

واپس آ جا۔

یہ بین سن کر خداوند رعؔ کو اِزیس پر رحم آیا اور اس نے اُنوبیسؔ دیوتا کو زمین پر بھیجا۔ اُنوبیسؔ نے اِزیسؔ، نفتیسؔ اور حوریسؔ کی مدد سے جسم کے ٹکڑوں کو جوڑا اور اِزیس نے اپنے پروں سے ٹھنڈی لاش کو ہوا دی اور اُزریس دوبارہ زندہ ہوگیا البتہ خداوند رعؔ نے اسے پاتال کی بادشاہت عطا کی جہاں وہ مُردوں کے اعمال کو میزان میں تولتا ہے۔

اس سے ملتی جلتی دی متر (Demeter) اور پرسی فونے (Persephone) کی یونانی داستان ہے۔ البتہ اس داستان کے دونوں کردار نسوانی ہیں اور ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ جوان پرسی فونے چشمے کے کنارے گلاب اور نرگس کے پھول چنتی ہوتی ہے کہ موت کا دیوتا پلوٹوؔ اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے اغوا کر کے ظلمات میں لے جاتا ہے۔ مادرِارض دی متر کو خبر ہوتی ہے تو وہ عہد کرتی ہے کہ جب تک اس کی بیٹی اسے واپس نہیں مل جاتی وہ نہ اناج اُگائے گی اور نہ زمین کو ہریالی بخشے گی۔ چنانچہ زمین بنجر ہو جاتی ہے، فصلیں سوکھ جاتی ہیں اور جانور اور آدمی خشک سالی کی وجہ سے بھوکے مرنے لگتے ہیں تب خداوند زیوسؔ، پلوٹوؔ کو طلب کرتا ہے اور یہ حکم صادر کرتا ہے کہ آئندہ سے پرسیؔ فونے سال کے آٹھ مہینے اپنی ماں کے ساتھ گزارے گی اور چار مہینے اپنے شوہر پلوٹو کے ہمراہ پاتال میں بسر کرے گی۔

ملکِ شام کی مادرِارض سی بیلی (Cybele) اور اس کے بیٹے ایڈونس (Adonis) کی داستان کی نوعیت بھی یہی تھی۔۔ یہ داستان ایشیائے کوچک میں پہنچ کر سی بیل اور اٹمیس کی داستان بن گئی۔ ہندوستان میں گوری اور شیو کی کہانی کے محرکات بھی وہی تھے جو عشتار اور اِزیس کی داستانوں کے تھے۔

غرضیکہ دنیا کی سبھی پرانی تہذیبوں میں زراعت کے ابتدائی عہد میں مادرِ کائنات موسمِ بہار یعنی فصلوں، درختوں اور پھول پتوں کی افزائش و نمو کی علامت تھی۔ لوگ بہار کی آمد پر نوروز کا جشن مناتے تھے اور بہار و خزاں کی ابدی آویزش کو ڈرامے کے رنگ میں پیش کرتے تھے اس ڈرامے میں آخر کار فتح بہار کی ہوتی تھی۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ Lyall, Quoted by Lo Kay Ala, p. 237

۲۔ بریفالٹ ص۔۵۵

۳۔ Holy Quran, translated by M.Mohd Ali, p. 45

۴۔ نیفر اوادیٔ فرات کا نہایت مقدس شہر تھا۔ اِن لیل دیوتا کا سب سے بڑا مندر وہیں تھا۔ اسی مندر میں سومیری ریاستوں کے بادشاہوں کی رسمِ تاج پوشی منائی جاتی تھی۔

۵۔ زہرہ یا مشتری اور ہاروت ماروت کی داستان میں اور اِزلیس اور سورج دیوتا راعؔ کی داستان میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مصر میں ازلیس نامی ایک نہایت چرب زبان عورت تھی مگر وہ انسانوں کی دنیا سے سخت بے زار تھی اور دیوتاؤں کی دنیا میں جانے کی بڑی آرزو رکھتی تھی۔ ایک بار اس نے سوچا کہ اگر مجھے خداوند راعؔ کا اسمِ اعظم معلوم ہو جائے تو میں بھی اس کی مانند زمین اور آسمان پر حکومت کرنے لگوں۔ خداوند راعؔ کے یوں تو بہت سے نام تھے اور لوگ ان ناموں سے واقف تھے لیکن اس کا ایک نام ایسا تھا جو سوائے راعؔ کے کسی دیوتا یا انسان کو معلوم نہ تھا پس ایسا ہوا کہ راعؔ بہت بوڑھا ہو گیا اور اس کے منہ سے ضعف کے باعث رال ٹپکنے لگی اور زہرہ نے اس رال کو جمع کیا اور اس سے مٹی گوندھی اور ایک سانپ بنایا اور سانپ کو راعؔ کے راستے میں رکھ دیا اور جب راعؔ اُدھر سے گزرا تو سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ درد سے تڑپنے لگا تب دیوتاؤں نے اس سے پوچھا کہ اے خداوند تجھے کیا ہوا جو تو اس طرح چیخ رہا ہے لیکن راعؔ جواب نہ دے سکا کیونکہ زہر کے باعث اس کی زبان لکنت کرنے لگی تھی اور اس کا جبڑا زور زور سے ہل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب راعؔ کا دل سنبھلا تو اس نے دیوتاؤں کو اپنے گرد جمع کیا اور کہا کہ میرے بچو! میں شہزادہ ہوں اور شہزادے کا بیٹا ہوں۔ میں دیوتا کے تخم سے پیدا ہوا ہوں۔ میرے باپ اور ماں نے میرا نام رکھا تھا اور یہ نام میری پیدائش کے وقت سے اب تک میرے جسم میں پوشیدہ تھا تا کہ کوئی جادوگر مجھ پر جادو نہ کر سکے۔ میں نے جو کچھ خلق کیا تھا اسے دیکھنے جا رہا تھا کہ کسی چیز نے مجھے ڈس لیا لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز تھی۔ کیا وہ آگ تھی کیا وہ پانی تھا میرے سینے میں آگ لگی ہے۔ میرا بدن کانپ رہا ہے اور میرا جوڑ جوڑ ہل رہا ہے جلد کسی دیوتا

کولاؤ جو مجھے شفا دے سکے۔ پس دیوتا کسی ایسے دیوتا کو تلاش کرنے لگے جو اس زہر کا تریاق جانتا ہو لیکن وہ ناکام واپس آئے تب اِزیس وہاں گئی۔ اس کے منہ میں زندگی کی سانس تھی اور اس کا سحر درد کو دور کر دیتا تھا اور اس کے کلام سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے۔ اس نے راعؔ سے کہا کہ مقدس باپ آپ کو کیا ہوا ہے۔ راعؔ نے جواب دیا سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں پانی سے زیادہ سرد اور آگ سے زیادہ گرم ہوتا جا رہا ہوں۔ میرے جسم سے پسینہ چھوٹ رہا ہے اور میری پتلیاں گھومی جا رہی ہیں۔ مجھے آسمان بھی نظر نہیں آتا۔ تب اِزیس نے کہا کہ مقدس باپ مجھے اپنا نام بتا کیونکہ جس شخص کو اس کے نام سے پکارا جائے وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ راعؔ نے جواب دیا کہ میں وہ ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور پہاڑوں کو قائم کیا اور وسیع سمندر بنائے۔ میں وہ ہوں جو آنکھیں کھولتا ہوں تو روشنی ہو جاتی ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میرے حکم سے نیل کا پانی بڑھتا ہے لیکن دیوتا بھی میرے نام سے واقف نہیں۔ میں صبح کے وقت کھیپرا ہوں، دوپہر کے وقت راعؔ ہوں اور شام کے وقت توم ہوں لیکن راعؔ کا زہر نہ اترا بلکہ اور اندر گھستا گیا اور وہ چلنے سے بھی معذور ہو گیا۔ تب اِزیس نے کہا کہ خداوند تو نے جو نام بتائے وہ تیرے اصلی نام نہ تھے اصلی نام بتا تا کہ تیرا زہر اتر جائے۔ تب راعؔ نے کہا کہ میں اجازت دیتا ہوں کہ اِزیس میرے جسم کی تلاشی لے تا کہ میرا نام میرے سینے سے اس کی سینے میں اتر جائے۔ راعؔ نے اپنے کو سب دیوتاؤں سے پوشیدہ کر لیا اور اِزیس کو اپنا نام بتا دیا تب اِزیس نے زہر کو حکم دیا کہ تو اب خداوند کے جسم سے باہر نکل آ کیونکہ اسم اعظم اس سے لے لیا گیا ہے اور اِزیس آسمان کی دیوی بن گئی۔

پانچواں باب

انسان جو خدا بن گئے

قصص الانبیا کا مصنف نمرود کی خدائی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نمرود کنعان بن آدم بن سام بن نوحؑ کا بیٹا تھا اور زبان اس کی عربی تھی۔ اس نے اپنے لشکر کی مدد سے ملکِ شام اور ترکستان کو فتح کیا۔ بعدہٗ ہندوستان اور روم کو بھی قبضے میں لایا اور مشرق سے مغرب تک تمام جہان پر اس کی حکومت تھی اور بابل اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس نے ایک ہزار سات سو برس بادشاہت کی۔ وہ بڑا متکبر تھا اور کہتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ آسمان کا خدا کیا چیز ہے۔ تب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو پیدا کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی مگر نمرود نے یہ دعوت ٹھکرا دی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَ اُمِيْتُ

کیا تم نہیں جانتے کہ اس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں بحث کی وہی جس نے اس کو بادشاہت عطا کی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو حیات اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا کہ میں بھی حیات اور موت دیتا ہوں (سورۂ بقرہ: ۲۵۸)

جب حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کا چرچا عام ہوا اور نمرود کو خبر پہنچی کہ ابراہیمؑ دیوتاؤں کی پرستش کی مخالفت کرتا ہے تو وہ بہت برہم ہوا اور اس کے مصاحبوں نے اس کو مشورہ دیا کہ

حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ

اگر تو کچھ کرنا چاہتا ہے تو ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دے اور اپنے خداؤں کی نصرت کر۔ (سورۂ انبیا۔ ۶۸)

اور نمرود نے حکم دیا کہ ایک چہار دیواری ایسی بناؤ کہ احاطہ اس کا بارہ کوس کا ہو، اونچائی

اس کی سوگز کی اور منادی کروادی کہ جتنے ہمارے دوست ہیں وہ لکڑی کاٹ کر لائیں اور اس احاطے میں ڈال دیں اور احاطہ لکڑیوں سے بھر گیا تو نمرود نے ان میں آگ لگوادی اور جب آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے تو حضرت ابراہیمؑ کو گوپھن میں رکھ کر آگ میں پھینک دیا گیا مگر اسی وقت غیب سے آواز آئی۔

قُلنَا یَا نَارُ کُونِی بَرَدً وَّ سَلَامُ عَلیٰ اِبرَاھِیمُ

ہم نے کہا کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا ابراہیم پر۔

اور وہ آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے گلشنِ حیات بن گئی۔ تب نمرود نے ابراہیمؑ کے خدا سے آسمان پر لڑنے کا عزم کیا۔ طبری کہتا ہے کہ نمرود نے گدھ کے چار بچے پالے اور جب وہ گوشت اور شراب پی پی کر خوب موٹے ہو گئے تو ان کو اپنے تخت کے چاروں پایوں سے باندھا اور چاروں کونوں پر ایک ایک نیزہ نصب کیا اور نیزے کی انی پر گوشت لپیٹ دیا گیا تا کہ گدھ گوشت کی لالچ میں اوپر ہی کی طرف پرواز کرتے رہیں اور خود تیر کمان لے کر تخت پر بیٹھا اور گدھ نمرود کو لے کر آسمان کی طرف اُڑنے لگے اور نمرود اتنی اونچائی پر پہنچ گیا کہ پہاڑ مٹی کا ڈھیر نظر آنے لگے اور کرۂ ارض سمندر میں جہاز کی مانند دکھائی دینے لگا تب نمرود نے آسمان پر تیر چلایا لیکن تیر واپس آ گیا اور نمرود اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ آخر کار خدا کے حکم سے ایک کیڑا اس کی ناک میں گھس گیا اور نمرود چار سو برس تک اذّیت اٹھاتا رہا اور ہلاک ہوا۔

قرآن شریف میں خدائی کا دعویٰ کرنے والے اس بادشاہ کا نام نہیں آتا البتہ انجیل کے پرانے عہد نامے میں نمرود کا ذکر موجود ہے (کتابِ پیدائش باب ۱۰) اور یہود کی ابتدائی کتابوں میں بھی نمرود کے قصے تفصیل سے ملتے ہیں۔ عرب مفسر اور مورّخ غالباً ان روایتوں سے واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے بادشاہ کو متفقہ طور پر نمرود لکھا ہے اور قرآن شریف کی آیتوں کی تشریح میں اس بادشاہ سے وہ سب داستانیں منسوب کر دی ہیں جو یہود میں رائج تھیں لیکن عراق کے آثارِ قدیمہ سے اب تک ایسی کوئی لوح برآمد نہیں ہوئی ہے جس سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہو۔ حتیٰ کہ بادشاہوں کی جو فہرستیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں بھی نمرود نام کے کسی آدمی کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں موصل سے ۲۲ میل کے فاصلے پر اشور نصیر پال

(۸۸۳۔۸۵۹ق۔م) نے جس مقام پر اپنا محل اور نیا دارالسلطنت تعمیر کیا تھا اسے ضرور نمیرود کہتے ہیں۔ اشور نصیر پال بڑا جنگ جو اور فاتح فرماں روا گزرا ہے۔ عین ممکن ہے کہ شہر نمیرود کے اس بادشاہ کی (یا اس کے جانشینوں کی جنھوں نے یہودیوں کو اسیر کیا تھا) داستانیں یہودی روایتوں میں منتقل ہو کر نمرود بادشاہ کی داستانیں بن گئی ہوں۔

گو نمرود کی شخصیت کا اب تک سراغ نہیں مل سکا ہے لیکن گِدھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر آسمان پر جانے کا قصہ قدیم بابلی (بیسویں صدی قبل مسیح) اشوری اور نو اشوری عہد کے کئی نوشتوں میں ملا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گِدھ کی داستان بہت پرانی ہے۔ سومیر کی فہرستِ شاہاں میں کیش کے ایک بادشاہ اِتانا کا ذکر آیا ہے جو گڈریا تھا اور آسمان پر گیا تھا۔ قدیم عکادی عہد کی ایسی کارتوسی مہریں بھی ملی ہیں جن پر ایک گڈریے کی تصویر کندہ ہے اور وہ گِدھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر آسمان پر پرواز کر رہا ہے البتہ اِتانا کی داستان میں سفر کے جو محرکات درج ہیں وہ نمرود کے سفر سے بالکل مختلف ہیں۔ اِتانا بے چارہ تولا ولد تھا اس لیے وہ آسمان پر شجرِ تولید لانے گیا تھا نہ کہ خدائے عرش کا مقابلہ کرنے۔

کہتے ہیں کہ اِتانا بڑا طاقت ور بادشاہ تھا۔ اس کا خزانہ ہیرے جواہرات سے بھرا تھا لیکن اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ بہت مغموم رہتا تھا۔ ایک دن وہ شہر سے دور جنگلوں میں گھوم رہا تھا کہ اس نے کسی پرندے کے کراہنے کی آواز سنی۔ بادشاہ آواز کی سمت چل پڑا اور جب آواز کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک زخمی گِدھ کنوئیں کے اندر پڑا کراہ رہا ہے۔ اِتانا نے پرندے سے پوچھا کہ اے پرند تو اس کنوئیں میں کیسے گرا اور تجھے کس نے زخمی کیا۔ گِدھ نے کہا کہ اے بادشاہ میں بڑا پاپی ہوں۔ ایک سانپ میرا دوست تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بدعہدی کی اب سزا بھگت رہا ہوں۔ اے اِتانا اگر تو مجھے اس قید سے نجات دلوائے تو میں تیرے دل کی مراد پوری کر دوں اور تیری ملکہ کی گود نو مہینے میں ہری ہو جائے۔ بادشاہ نے گِدھ کو کنوئیں سے نکالا اور جب اس کے پر سوکھ گئے تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ تو میری پیٹھ پر بیٹھ جا۔ میں تجھے اُڑا کر وہاں لے جاؤں گا جہاں شجرِ تولید اُگتا ہے لیکن خبردار راستے میں آنکھیں نہ کھولنا۔ بادشاہ نے گِدھ کی ہدایتوں پر عمل کیا اور گِدھ کی مدد سے شجرِ تولید حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

قدیم داستان گو نے تمہید میں خدائے عرش اَنو کے دربار کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قصہ اتنا پرانا ہے کہ اس وقت تک عراق میں بادشاہت بھی نازل نہیں ہوئی تھی۔

گِدھ کی کہانی

عظیم دیوتا اَنو اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔
وہی جو قسمت کا فیصلہ کرتا ہے
اور دوسرے دیوتاؤں سے زمین کے بارے میں مشورہ کر رہا تھا
ان دیوتاؤں سے جنھوں نے چاروں کونے پیدا کیے۔
وہ سب انسان کے خلاف تھے
پس انھوں نے انسان کے لیے وقت مقرر کر دیا تھا
اس وقت تک کالے بال والوں نے کسی کو بادشاہ نہیں بنایا تھا
اس وقت تک کسی کے سر پر تاج بھی نہیں رکھا گیا تھا۔
نہ کلغی باندھی گئی تھی
اور نہ عصائے شاہی میں لاجوردی کا جڑاؤ کام بنا تھا۔
دیوتاؤں کے مندر بھی تعمیر نہیں ہوئے تھے
ساتوں دیوتاؤں نے آبادکاروں پر پھاٹک بند کر دیے تھے۔
اور عصائے شاہی، تاج، کلغی اور گڈریے کا آنکر
(بادشاہت کی تمام علامتیں)
سب عرش پر اَنو کے پاس جمع تھے۔
کیونکہ اس وقت تک زمین کے باشندوں کے بارے میں
دیوتاؤں نے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا
تب بادشاہت آسمان سے اتری

اس تمہید کے بعد قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک گدھ کسی پیڑ پر رہتا تھا۔ وہیں ایک سانپ نے بھی اپنا بلِ بنا رکھی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد سانپ اور گدھ میں دوستی ہوگئی اور انھوں نے عہد کیا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

انھوں نے بہادر شمس کے روبرو قسم کھائی کہ
جو کوئی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرے
شمس اسے جلاّد کے حوالے کردے
اور وہ راستہ بھول کر بھٹکتا پھرے
اور پہاڑ اپنے درّوں کو اس پر بند کردے
اور شمس کا جال اسے پکڑ لے اور گرادے

....

جب گِدھ جنگلی بیل یا جنگلی گدھے کا شکار کرتا
تو سانپ اس میں حصہ لگاتا اور کھا کر اپنے بچوں کو بھرانے چلا جاتا
جب سانپ پہاڑی بکرے یا ہرن کو مارتا
تو گِدھ اس میں حصہ لگانے آجاتا اور کھا کر اپنے بچوں کو بھرانے چلا جاتا۔
اس طرح بہت دن گزر گئے
اور گِدھ کے بچے عمر اور وزن میں خوب بڑھ گئے
تب گِدھ کے دل میں بدی نے گھر کیا۔
اور اس نے اپنے دوست کے چھوٹے بچوں کو کھانے کا تہیہ کیا۔
اس نے منھ کھولا اور اپنے بچے سے کہا
میں سنپولوں کو کھاؤں گا۔
اور آسمان پر اُڑ جاؤں گا
اور درخت کی چوٹی پر اتر کر اس کے پھل سے پیٹ بھر لیا کروں گا۔
مگر اس کا بچہ بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔

باپ......ایسا ہرگز نہ کرنا۔
ورنہ شمس کا جال تجھے پکڑ لے گا
شمس کا سراپ تجھے ہلاک کر دے گا۔
لیکن گِدھ نے بیٹے کی بات نہ مانی
وہ نیچے اترا اور سنپولوں کو کھا گیا۔
دوپہر میں جب سانپ اپنے بچوں کے لیے کھانا لے کر لوٹا اور بل میں گیا تو
اس کے بچے غائب تھے۔ اس نے ہر جگہ ڈھونڈا مگر بچوں کو نہ پایا۔
تب وہ شمس کے روبرو گیا۔
اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
اور اس نے رو رو کر شمس سے فریاد کی!
''بہادر شمس میں نے تجھ پر بھروسہ کیا۔
میں نے گِدھ کو اپنا دوست بنایا اور اس کی خدمت کی۔
لیکن گِدھ آیا اور میرے بچوں کو کھا گیا۔
اب میرا گھونسلہ ویران ہے۔
میرے بچے مر چکے ہیں
او شمس! گِدھ نے میرے ساتھ جو بدی کی ہے،
اس سے آگاہ ہو
او شمس! بے شک تیرا جال پوری زمین پر پھیلا ہوا ہے۔
اور آسمان بھی اس کے پھندے میں اسیر ہے
پس گدھ تیرے جال سے بچ کر جانے نہ پائے۔
بدکار زُود جو دوستوں کے ساتھ برائی کرتا ہے''۔
جب شمس نے سانپ کی فریاد سنی تو اس نے اپنا منہ کھولا
اور سانپ سے کہا!

تو یہاں سے روانہ ہو جا۔ پہاڑ کو عبور کر
وہاں میں تیرے لیے ایک جنگلی بیل کو باندھ دوں گا۔
تو اس کا پیٹ پھاڑنا اور اس کے اندر چھپ کر بیٹھ جانا
تب ہر قسم کے پرندے آسمان سے بیل کا گوشت کھانے نیچے آئیں گے۔
اور گِدھ بھی آئے گا
کیونکہ اس کو اپنا خراب انجام معلوم نہیں ہے۔
مگر وہ بڑی احتیاط سے آئے گا
اور پیٹ کے اندر گوشت تلاش کرے گا
جب وہ اندر داخل ہو تو اسے پکڑ لینا
اور اس کے پنکھ اور چونچ توڑ دینا۔
اور اُسے ایک گڑھے میں پھینک دینا۔
جہاں وہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔
شمس کے حکم کے مطابق سانپ نے پہاڑ عبور کیا۔
اور جب وہ بیل کے پاس پہنچا
تو اس نے بیل کا پیٹ چاک کیا
اور اس کے اندر اپنا بسیرا بسایا۔
اور ہر طرح کے پرند گوشت کھانے آسمان سے نیچے آئے
اگر گِدھ کو اپنا انجام معلوم ہوتا تو وہ دوسرے
پرندوں کے ساتھ گوشت کھانے کبھی نہ آتا۔
گِدھ نے منہ کھولا اور اپنے بچے سے کہا:
آؤ نیچے بیل کا گوشت کھانے چلیں
لیکن بچہ بہت ہوشیار تھا۔ اس نے باپ سے کہا:
"باپ نیچے مت اترو۔ شاید بیل کے اندر سانپ چھپا بیٹھا ہو"۔

مگر گِدھ نہ مانا۔ اس نے کہا

''میں تو نیچے گوشت کھانے ضرور جاؤں گا۔

سانپ بھلا مجھے کیسے کھا سکتا ہے''۔

اور وہ نیچے اترا اور بیل کے پاس گیا۔

اس نے بیل کا اگلا حصہ غور سے دیکھا۔

اس نے بیل کا پچھلا حصہ غور سے دیکھا۔

پھر اس نے بیل کے پیٹ میں جھانک کر دیکھا

اور جب وہ اندر داخل ہوا تو سانپ نے اسے پروں سے پکڑ لیا۔

گِدھ نے اپنا منھ کھولا اور سانپ سے کہا:

''مجھ پر رحم کھا۔ میں تجھے ایسا تحفہ دوں گا

جو شادی میں دولھا کو دیا جاتا ہے''۔

سانپ نے اپنا منھ کھولا اور گدھ سے کہا:

''اگر میں تجھے چھوڑ دوں تو شمس کو کیا جواب دوں گا۔

وہ الٹی مجھی کو سزا دے گا''۔

پس اس نے گِدھ کے پنکھ اور چونچ توڑ ڈالے اور اس کے پر نوچ لیے۔

اور اسے گڈھے میں پھینک دیا۔

تا کہ وہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائے۔

اور گِدھ روز شمس سے فریاد کرتا:

''کیا میں گڈھے میں پڑا پڑا جان دے دوں

خداوند میری جان بخشی کر دے۔

میں ابد تک تیرے گُن گاتا رہوں گا''۔

شمس نے اپنا منھ کھولا اور گِدھ سے کہا:

''تو بدکار ہے اور تو نے مجھے بہت دکھ دیا ہے

دیوتاؤں نے جس چیز کو منع کیا تھا
تو نے وہ چیز کھائی
اب تو لاکھ وعدے کرے
میں تیرے پاس نہ آؤں گا
البتہ میں تیرے پاس ایک آدمی بھیجوں گا
وہ تیرا ہاتھ پکڑے گا"۔

....

اتانا شمس سے روز التجا کرتا
"شمس دیوتا! میں نے اپنی سب سے موٹی بھیڑیں تجھے کھلائیں۔
زمین میرے ہلوانوں کا خون پیتی ہے۔
میں دیوتاؤں کی عزت کرتا ہوں۔
ندائے غیب کی محافظ دیوداسیوں نے ہر طرح کی مدد کی
خداوند۔ اب تو اپنے منھ سے مژدہ سنا۔
مجھے شجرِ تولید کی زیارت نصیب کر۔
میرا بوجھ ہلکا کر اور میرا ایک نام لیوا پیدا کر"۔
شمس نے اپنا منھ کھولا اور اِتانا سے کہا۔
"تو سفر پر روانہ ہو اور پہاڑ کو عبور کر
وہاں تجھے ایک گڑھا ملے گا
گڑھے کے اندر جھانک کر دیکھ
وہاں ایک گدھ زخمی پڑا ہے۔
وہی تجھے شجر تولید کی زیارت کروائے گا"۔
اِتانا، شمس کے حکم سے سفر پر روانہ ہوا۔
اس نے پہاڑ عبور کیا

اور جب وہ گڈھے کے پاس پہنچا
اور اس کے اندر جھانکا
تو وہاں ایک گِدھ پھنسا پڑا تھا
گِدھ نے اپنا منہ کھولا اور اِتانا سے کہا
''بتا تو یہاں کیوں آیا ہے''۔
اِتانا نے منہ کھولا اور کہا
''میرے دوست مجھے شجر تولید کا راستہ دکھا
مجھے شجرِ تولید بخش دے۔
میرا بوجھ ہلکا کردے تاکہ دنیا میں میرا نام چلے''۔
گِدھ نے اِتانا کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور کہا:
''تو بے شک اِتانا ہے۔
تو مجھے اس گڈھے سے نکال
پھر میں تجھے اولاد دوں گا
اور ابد تک تیرے گُن گاتا رہوں گے''۔

اِتانا نے بڑی مشکل سے گِدھ کو گڈھے سے نکالا۔ تب گِدھ نے اتانا سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں اور تم خداوند انو، ان لِیل اور ایا کے محل کے پھاٹک کے سامنے کھڑے ہیں اور ہم نے تعظیم سے اپنے سر جھکا لیے ہیں۔ پھر ہم قمر، شمس، ادادا اور عشتار کے پھاٹک پر پہنچے ہیں۔ میں نے پھاٹک کھولا اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک سنہرے تخت پر عشتار بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ وہ چمکیلے زیورات سے لدی ہوئی تھی اور اس کے تخت کے پایوں کے پاس شیر لیٹے سو رہے تھے۔ میں تخت کے قریب پہنچا تو شیر جاگ اٹھے اور خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ عشتار کی زیارت اس بات کی علامت تھی کہ اِتانا کی آرزو پوری ہوگی۔ اس تمہید کے بعد گِدھ نے اِتانا سے کہا کہ:

میں تجھے اَنو کے دربار میں لے جاؤں گا

تو میرے سینے پر اپنا سینہ رکھ لے
اور میرے پروں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لے
اور اپنے بازو میرے بدن کے گرد حمائل کر دے۔
چنانچہ اِتانا نے ایسا ہی کیا اور گِدھ اِتانا کو لے کر عرش کی جانب پرواز کرنے لگا۔
جب وہ ایک کوس اوپر اُڑ چکے
تو گدھ نے اتانا سے کہا:
''میرے دوست ذرا زمین کی طرف دیکھو اور بتاؤ وہ کیسی نظر آتی ہے
اور سمندر اور ایکو پہاڑ پر بھی نظر ڈالو''۔
اِتانا نے جواب دیا کہ ''زمین ایک پہاڑی کی مانند ہے
اور سمندر پانی کا تالاب معلوم ہوتا ہے''۔
اور جب دو کوس اوپر اُڑ چکے تو گِدھ نے پھر وہی سوال کیا۔
اور اِتانا نے کہا کہ ''اب زمین ایک کھیت کی مانند ہے۔
اور سمندر روٹی کی ٹوکری معلوم ہوتا ہے''۔
اور جب وہ تین کوس اڑ چکے تو گِدھ نے پھر وہی سوال کیا۔
اور اِتانا نے کہا کہ ''اب تو مالی کے کنوئیں کی مانند نظر آتی ہے''۔

اور اِتانا ڈر گیا اور اس نے گِدھ سے کہا کہ میرے دوست میں اس سفر سے باز آیا۔ تم مجھے واپس لے چلو مگر گدھ نے دلاسا دیا اور اِتانا کی ڈھارس بندھائی...... وہ اَنو کے عرش پر پہنچے اور اَنو، اِن لیل، اور ایا کے پھاٹک میں داخل ہوئے اور انھوں نے دیوتاؤں کے روبرو تعظیم سے اپنے سر جھکائے۔

بالآخر اِتانا شجرِ تولید حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور گدھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر وطن واپس آیا اور اس کے اولاد ہوئی اور اس کا نام دنیا میں باقی رہا۔

عجیب بات ہے کہ عکاّدی اور اشوری نوشتوں میں کسی ایسے بادشاہ کا تذکرہ نہیں ملتا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا ہو، یا جسے رعایا دیوتا سمجھ کر پوجتی رہی ہو بلکہ عکاّدی اور اشوری فرماں روا تو

دیوتاؤں کی خدمت کرنا اوران کے لیے عالی شان معبد تعمیر کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتے تھے۔ وادیِ دجلہ وفرات کی داستانوں میں فقط ایک ہیرو......گِل، گامش...... ایسا گزرا ہے جس کی خداوندی صفات کا ذکر کیا گیا ہے مگر وہ بھی فقط ''تین چوتھائی دیوتا تھا اور ایک چوتھائی انسان کیونکہ حیاتِ ابدی اس کی قسمت میں نہیں لکھی تھی''۔

لیکن مصر کے فراعنہ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں دیوتا اور دیوتا کی اولاد خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شاہی رسم کے مطابق شادی کے بعد فرعون کی ملکہ خدائے مصر آمون رع کے مندر میں جاتی تھی اور آمون کی خواب گاہ میں رات بسر کرتی تھی اور آمون رع فرعون کے بھیس میں خواب گاہ میں آتا تھا اور ملکہ کے ساتھ مباشرت کرتا تھا۔ یہ رسم اس وقت تک جاری رہتی جب تک ملکہ واقعی حاملہ نہ ہو جاتی (اس مباشرت کا منظر دیر البحری اور لکسر کے قدیم معبدوں میں دیواروں پر بڑی چابک دستی سے کندہ کیا گیا ہے اور اس کی رنگین تصویریں بھی بنائی گئی ہیں۔ تصویروں کے اندر حیر وغلافی خطوط میں اس منظر کی تفصیل بھی لکھ دی گئی ہے) اسی بنا پر مصر کے بادشاہ آمون رع کے اوتار تصور ہوتے تھے اور ان کی ذات اتنی ہی واجب الاحترام اور سزاوارِ اطاعت وستائش تھی جتنی آمون رع کی۔ مصری عقیدے میں بادشاہ کبھی مرتا نہ تھا بلکہ آمون رع کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس عقیدے کے سیاسی مقاصد اور محرکات تو معمولی عقل کے انسان کی بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں لیکن ہماری بحث کا موضوع ملوکیت کے روحانی حربے نہیں ہیں بلکہ ہم تو یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں میں دیوتاؤں اور خداؤں کا تصور کب کیوں اور کیسے پیدا ہوا۔

پچھلے باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ زراعت عورتوں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ زراعت کے ابتدائی دور میں ہر جگہ اُموی نظام قائم تھا اور یہی وجہ ہے کہ زرعی پیداوار کی افزائش کی تمام ساحرانہ رسمیں جگ ماتا یا مادرِ ارض کی مورتیوں کے گرد گھومتی ہیں لیکن جب انسان نے بھاری بھاری ہل ایجاد کیے تو اُموی نظام کے لیے اجل کا پیغام آ گیا۔ کیونکہ ہل اور بیل کی مدد سے کاشت کاری کے لیے جس جسمانی قوت کی ضرورت تھی وہ فقط مردوں کو حاصل تھی۔ ہل کے ذریعے کھیتی باڑی کرنے سے زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی اور فاضل پیداوار کی خرید وفروخت کا

رواج پڑا۔ پیداوار اور تجارتی لین دین میں جس نسبت سے اضافہ ہوتا گیا عورت کا اثر واقتدار معاشرے میں اسی نسبت سے گھٹتا گیا یہاں تک کہ دنیا کے اکثر وبیش تر خطوں میں اُموی نظام قریب قریب معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ ابوی نظام نے فروغ پایا۔

اس سماجی انقلاب کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑا۔ مثلاً اُموی نظام میں سحر کی تمام رسمیں عورتیں ادا کرتی تھیں لیکن ابوی نظام کے تسلّط کے بعد سحر کا سارا کاروبار عورتوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ عہدِ ماضی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اگرچہ اِکاّ دُکاّ جادوگرنیاں اَبوی نظام میں بھی باقی رہیں لیکن اب ان کی حیثیت بالکل ثانوی تھی۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ وادیِ دجلہ وفرات میں اُموی نظام کی جگہ اُبوی نظام کب رائج ہوا۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اُموی نظام وہاں شہری ریاستوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے ذہن نے دیوتاؤں کی تخلیق اَبوی نظام ہی کے زمانے میں کی خواہ یہ ابوی نظام گیا ہستانی اور گلہ بانی کے دور کا ہو (آریاؤں کے دیوتا) یا ہل اور کانسے کی تہذیب کے دور کا (مصر، عراق وغیرہ)۔ البتہ یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسانی معاشرے کو ان دیوتاؤں کی ضرورت کیوں پیش آئی اور ذہنی شعور کی کس منزل پر پہنچ کر انسان نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔

ان سوالوں کے جواب میں علمائے آثار، قدما کے اندازِ فکر سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر فرینک فرٹ اور جیکب سن نے اپنی تصنیف فلسفے سے پہلے (Before Philosophy) میں قدما کے اندازِ فکر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ قدرت کے تمام مظاہر کو فعّال اور صاحبِ ارادہ شخصیتیں تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بعض شخصیتیں بڑی مشفق اور مہربان تھیں جیسے زمین، سورج اور چاند کی شخصیتیں۔ بعض شخصیتیں بڑی طاقت ور تھیں جیسے آندھی، بجلی اور طوفان، بعض شخصیتیں بڑی پُراسرار اور پیچیدہ تھیں جیسے پانی کی شخصیت کہ خوش ہو تو کھیتیاں لہلہائیں اور چراگاہیں سرسبز ہو جائیں اور ناخوش ہو تو پانی کا بہاؤ انسانوں، فصلوں اور مویشیوں سب کو فنا کر دے، بعض شخصیتیں بڑی ڈراؤنی تھیں جیسے بیماری اور موت کی شخصیتیں۔ قدیم انسان ان شخصیتوں کے لیے دیوتا کی اصطلاح استعمال کرتا تھا مگر وہ ان دیوتاؤں کو فوق الفطرت یا

ماورائے حقیقت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس نے توان دیوتاؤں کو انسانی شکلیں، صورتیں، عادتیں اور خصلتیں بھی عطا کردی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دیوی اور دیوتا انسان کے مانند کھاتے پیتے اور آرام کرتے ہیں۔ انسانوں ہی کی مانندان کی شادی ہوتی ہے اور انسانوں کی مانند وہ اولاد پیدا کرتے ہیں۔ یہ دیوی دیوتا عشق کی لذتوں اور ہوس کی بے شرمیوں سے بھی آشنا تھے۔ ان سے نیکیاں بھی سرزد ہوتی تھیں اور بدیاں بھی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں بھی کرتے رہتے تھے اور روتے بھی تھے اور غصہ بھی کرتے تھے۔ بیماریاں انہیں بھی ستاتی تھیں اور لافانی ہونے کے باوجود کبھی کبھی ملکہ ظلمات کا دستِ دراز انہیں بھی موت کے مزے چکھا دیا کرتا تھا۔ غرضیکہ ان دیوتاؤں کا رہن سہن انسانی معاشرے کا پرتو تھا۔ اسی بنا پر یونان کے مشہور مورخ زینوفون (۴۳۰۔۳۵۵ق۔م) نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ اگر گھوڑے، بیل اور شیر بھی دیوتاؤں کو مانتے ہوتے توان دیوتاؤں کی شکلیں اور خصلتیں گھوڑے، بیل اور شیر سے مشابہ ہوتیں اور ارسطو نے اپنی کتاب ''سیاسیات'' میں لکھا تھا کہ انسان فقط اپنے دیوتاؤں کی شکلوں کا قیاس اپنی شکلوں سے نہیں کرتا بلکہ ان کی زندگی کے طور طریقوں کو بھی اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

مگر بعض علمائے عمرانیات (ہربرٹ اسپنسر اور گرانٹ ایلن وغیرہ) اس نظریے کو نہیں مانتے اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ مظاہرِ قدرت کو دیوی دیوتا کا روپ دینے کے لیے جو ذہنی شعور درکار ہوتا ہے ابتدائی انسان اس سے محروم تھا۔ وہ اگر شعور رکھتا تھا تو فقط اپنے اسلاف کا۔ وہ اسلاف ہی کے حقیقی اور فرضی کارناموں سے واقف تھا اور ان کو یاد کرتا رہتا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان اسلاف کی اصلی شخصیتیں روایتوں کے انبار تلے دب گئیں۔ رفتہ رفتہ حقیقت پر خرافات کی اتنی تہیں جم گئیں کہ لوگ اسلاف کی اصل شخصیتوں کو بھول گئے اور افسانوی شخصیتوں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرنے لگے۔ اگر کسی شخص کے کارنامے قبیلے تک محدود رہے تو وہ قبیلے کا دیوتا کہلایا، اگر کسی شخص کو قومی سورما کا رتبہ نصیب ہوا تو وہ پوری قوم کا دیوتا قرار پایا اور اگر اس کے کارناموں نے پورے ملک کی زندگی کو متاثر کیا تو وہ پورے ملک کا دیوتا تسلیم کرلیا گیا۔ ان عالموں نے قدیم مصر، یونان، چین، رومۃ الکبریٰ اور ہندوستان کی تاریخوں سے

اسلاف پرستی کی بہ کثرت شہادتیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح بعض نامور بادشاہوں یا ہیروؤں کوان کے مرنے کے بعد دیوتا کا مرتبہ حاصل ہوا۔ مثلاً رگ وید کا سب سے بڑا دیوتا اِندر دراصل ان آریہ قبیلوں کا ہیرو تھا جنھوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو تاراج کیا۔ اسی طرح رام چندر اور کرشن مہاراج وادیٔ گنگ و جمن کے قدیم ہیرو تھے جن کو دیوتا کا رتبہ مل گیا۔ ان دانش وروں نے دورِ حاضر کی ان پس ماندہ قوموں کی اسلاف پرستی کی بھی بہ کثرت مثالیں دی ہیں جو اب تک ہر مرنے والے کو دیوتا سمجھتی ہیں اور فقط انہیں کی پرستش کرتی ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر تو اپنے دعوے میں یہاں تک مبالغہ کرتا ہے کہ تمام دیوی دیوتا خواہ وہ مصر کے ہوں یا چین اور یونان کے عراق کے ہوں یا ہندوستان اور میکسیکو کے ابتدا میں دراصل نامور اسلاف ہی تھے۔

دانایانِ آثار و عمرانیات نے دیوتاؤں کے ضمن میں خدائے واحد کے تصور سے بھی بحث کی ہے۔ وہ علمائے مذہب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابتدائی انسان ایک خدا کو مانتا تھا اور اسی کی عبادت کرتا تھا یا یہ کہ شرک کی بدعتیں وحدانیت کے بعد نمودار ہوئیں تب وحدانیت کی تبلیغ کرنے والے پیغمبر آئے اور انھوں نے وحدانیت کو شرک کے بتوں سے پاک صاف کیا۔ علمائے عمرانیات کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ انسان ابتدا ہی سے وحدانیت پرست تھا۔ یہ تو درست ہے کہ شرک اور بت پرستی کا قلع قمع خدائے واحد پر ایمان لانے والے مذہب نے کیا لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ابتدائی انسان بھی موحد تھا۔ گرانٹ ایلن نے تو یہودیوں کے خدائے واحد یہوواہ سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہودی حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے سینکڑوں برس بعد تک متعدد مقامی اور قومی دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتے تھے اور ان کا خدائے واحد کا تصور پانچویں چھٹی صدی قبلِ مسیح سے پہلے مکمل نہیں ہوا تھا لیکن خدائے واحد کی بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ دجلہ و فرات یا نیل کی وادی میں بسنے والی پرانی قومیں خدائے واحد کے تصور سے کبھی آشنا نہیں ہوئیں۔ مصر کے فقط ایک فرعون ــــ اخناطون ــــ (۱۳۷۵ـ۱۳۵۸ق۔م) نے وحدانیت کا سکّہ بٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ وحدانیت بھی سورج دیوتا اَطون کی تھی اور پروہتوں نے اس کوشش کو بھی ناکام بنادیا تھا۔

بہرحال اسلاف کی عظمتوں کے افسانوں نے دیوتا کا روپ اختیار کیا ہو یا مظاہرِ قدرت کی نقالی اور صاحبِ ارادہ شخصیتوں کا تصور دیوتاؤں کے پیکر میں ڈھل گیا ہو یہ حقیقت ہے کہ دیوتاؤں کی تخلیق ذہنِ انسانی ہی کی مرہونِ منّت ہے مگر تخلیق کا یہ عمل کئی مدارج سے گزرا ہے اور یہ وہی مدارج ہیں جہاں پہنچ کر انسان کی سماجی زندگی میں اہم تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ سر جیمس فریزر ان مدارج کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ پہلا دور وہ تھا جس میں سحر کو فروغ ہوا۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک تھا۔ چنانچہ انسان خوراک کی فراہمی کے لیے اپنی جسمانی طاقت کے علاوہ اعمالِ سحر سے بھی کام لیتا تھا۔ ابتدا میں تو پورا قبیلہ ان رسموں میں برابر کا شریک ہوتا تھا لیکن معاشرے میں جب تقسیم کار نے رواج پایا تو جادو منتر کے فرائض قبیلے کے سب سے تجربہ کار اور ذی فہم فرد کے سپرد کر دیے گئے۔ وہ فراہمی خوراک کی ذمے داریوں سے آزاد ہو گیا اور اس کی ساری قوت اور وقت ساحرانہ عمل کو موثر سے موثر تر بنانے پر صرف ہونے لگا۔ یہی شخص قبیلے کا حکیم اور طبیب بھی ہوتا تھا۔ وہ علاج معالجے کے لیے دھاتیں اور جڑی بوٹیاں تلاش کرتا اور ان کی تاثیر معلوم کرتا تھا۔ موسم کی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتا اور ان تبدیلیوں کا جو اثر حیوانات اور نباتات پر ہوتا ہے اس سے آگاہی بھی جادوگری کے فرائض میں داخل تھی اور قبیلے کو پورا یقین ہوتا تھا کہ ہماری شکاری ہمیں اس شخص کی ساحرانہ طاقتوں کی بدولت کامیاب ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے تو آسمان سے پانی برسنے لگتا ہے اور جب چاہتا ہے تو ہوا کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے جادو کے زور سے شکار میں زخمی ہونے والوں کو اچھا کر دیتا ہے اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑ دیتا ہے۔ وہی مویشیوں کی نسل بڑھاتا ہے اور اناج کی فصلیں اگاتا ہے۔ جس شخص میں اتنے اوصاف ہوں وہ ظاہر ہے کہ قبیلے کا سب سے صاحبِ اثر و اختیار شخص ہوگا۔ رفتہ رفتہ جب انفرادی ملکیت نے طاقت پکڑی تو ان ساحروں کی دولت اور قوت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ بادشاہ بن گئے اور بادشاہوں کے لیے خدائی کا دعویٰ کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ چنانچہ سر جیمس فریزر دورِ حاضر کی پس ماندہ قوموں سے مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جنوب مشرقی افریقہ کی زمباز قوم فقط اپنے راجہ کو دیوتا مانتی ہے اور اسی کی پوجا کرتی ہے۔ یہ راجہ بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ بارش اسی کے حکم سے ہوتی ہے اور اگر بادل کبھی حکم عدولی

کرتے ہیں تو وہ آسمان میں تیر مار کر بادلوں کو سزا دیتا ہے گرمی اور سردی کے موسم بھی اسی کی مرضی سے آتے جاتے ہیں۔

اسی طرح وسطی افریقہ کی باگاندہ قوم کا ایمان ہے کہ ان کا ساحر دیوتا جھیل نیانزا کے کنارے پہاڑوں میں رہتا ہے۔ اس دیوتا سے بادشاہ اور رعایا دونوں خوف کھاتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ اس میں بیمار کو اچھا کرنے اور تندرست کو بیمار بنانے کی صلاحیت ہے۔ وہ چاہے تو بارش ہو اور نہ چاہے تو زمین کو پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہو۔ اُروار (Uruar) قوم کا سردار بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ وہ کئی کئی دن کچھ کھاتا نہ تھا اور ڈینگ مارتا تھا کہ میں خدا ہوں مجھ کو غذا کی کیا ضرورت ہے۔ میں تفریحاً کبھی کبھار کچھ کھالیتا ہوں اور اواقوم کے سردار نے انگریز افسروں سے جنہوں نے نائیجیریا پر حملہ کیا تھا کہا تھا کہ خدا نے مجھے اپنا ہم شکل بنایا ہے اور میں خود بھی خدا ہوں۔ سیام کا بادشاہ بھی دیوتا کی مانند پوجا جاتا تھا۔ اس کی رعایا کو بادشاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ جب وہ سڑک پر گزرتا تو لوگ سربسجدہ ہو جاتے تھے۔ اس کے لیے چند الفاظ مخصوص تھے اور یہ الفاظ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے سر کے بالوں، پاؤں کے تلوؤں، حتیٰ کہ اس کی سانس کے لیے بھی الفاظ مخصوص تھے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جاپان کے موجودہ بادشاہ ہیروہیٹو کو جاپانی قوم سورج دیوتا کا بیٹا اور دیوتا سمجھتی تھی۔ ان عقائد پر ہم کو حیرت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مسلمان بھی گزشتہ تیرہ سو سال سے ہر بادشاہ کو ظلِ اللہ اور ظلِ سبحانی کہہ کر پکارتے رہے ہیں حالانکہ اسلام تمام مذاہب سے زیادہ وحدانیت کی تلقین کرتا ہے اور ملوکیت کے بجائے جمہوریت کا علم بردار ہے۔

وادیٔ دجلہ و فرات کے دیوتاؤں کے ظہور و نمود کے بارے میں ہماری معلومات ہنوز بہت ناقص ہیں۔ چنانچہ وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اِن لیل، آیا، آنو اور دوسرے دیوتا دراصل ساحر یا بادشاہ تھے جن کو لوگوں نے دیوتا بنا دیا یا مظاہرِ قدرت کو شخصی پیکر دینے کے باعث یہ صورت پیدا ہوئی۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ دیوتاؤں کی آڑ میں ان کے پروہتوں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں اور دلوں پر کئی ہزار برس تک حکومت کی۔ یہ پروہت پرانے زمانے کے ساحر ہی تھے جنہوں نے شخصی ملکیت کے دور میں ہر بڑے شہر میں اپنے اپنے مرکز قائم کر لیے

تھے۔ وہی ان شہروں کے اوّلین سیاسی سربراہ بھی تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہر کے بانی یا سربراہ کو آنے والی نسلوں نے دیوتاؤں کا مرتبہ دے دیا ہو اور سحر کے مرکز مذہبی معبدوں میں تبدیل ہو گئے ہوں کیونکہ ان مرکزوں میں دولت کی فراوانی کا تقاضا یہی تھا کہ لوگوں کو اطاعت، عقیدت اور عبادت کی طرف مائل کیا جائے۔

عراقی دیو مالا کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وادیِ فرات کے دیوتاؤں کے خدوخال شہری ریاستوں کے دور میں ابھرے۔ چنانچہ انسان نے دیوتاؤں کے معاشرے کا جو نقشہ بنایا وہ اس کے اپنے معاشرے ہی کا عکس تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہتیں ہنوز قائم نہیں ہوئی تھیں بلکہ ریاستوں کا نظم ونسق جمہوری طریقوں پر چلتا تھا اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ عراقی دیو مالا میں کائنات کے تمام اہم مسائل دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں طے پاتے ہیں۔ کائنات پر کسی ایک دیوتا کی فرماں روائی نہیں ہے بلکہ جو فیصلہ بھی ہوتا ہے وہ باہمی صلاح ومشورے سے ہوتا ہے۔ مجلسِ شوریٰ ہی یہ فیصلہ بھی کرتی ہے کہ اس کے احکام کو نافذ کرنے کا فرض کس دیوتا کے سپرد کیا جائے۔

جس طرح جمہوری ریاستوں کے اندر سب لوگ برابر نہ تھے بلکہ کوئی دولت مند تھا، کوئی محتاج، کوئی آقا تھا اور کوئی غلام۔ اسی طرح دیوتاؤں کی آسمانی ریاست میں بھی سب کے مرتبے مساوی نہ تھے بلکہ وہاں بھی چھوٹے بڑے کی تمیز ہوتی تھی اور انسان نے ان کے مرتبے کا معیار ان کی طاقت قرار دیا تھا۔ جو دیوتا جتنا طاقت ور تھا مجلسِ شوریٰ میں مساوات کے باوجود اس کا اثر واقتدار اتنا ہی زیادہ تھا۔ یہی طاقت ور دیوتا مجلسِ شوریٰ اور کابینہ کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سب سے ممتاز مندرجہ ذیل دیوتا تھے۔

۱۔ اَنو

۲۔ اِن لیل (ایا) جو ہوا اور طوفان کا دیوتا اور اَنو کا بیٹا تھا۔

۳۔ اِن کی۔ زمین اور میٹھے پانی کا دیوتا۔

۴۔ نِورتا۔ جنگ کا دیوتا۔

۵۔ نن ہورسگ۔ مادرِ ارض یا مادرِ کائنات۔

۶۔ اِنانا (عِشتار) محبت اور افزائشِ نسل کی دیوی۔ اِن لیل کی بہن۔

۷۔ ارش حی گل۔ ملکہ ظلمات۔ موت کی دیوی۔ اِنانا کی بہن۔

۸۔ ننّا (سین) چاند دیوتا۔

۹۔ اُتو (شمس) سورج دیوتا۔

اُنو — کے لفظی معنی آسمان کی وسعتوں کے ہیں۔ یہ وسعتیں زمین، سورج، چاند سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور سب سے زیادہ بسیط اور کشادہ ہیں اس لیے دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں اُنو کی شخصیت سب سے زیادہ لائقِ احترام ہے۔ اُنو دیوتاؤں کے قبیلے کا سب سے بزرگ، سب سے سنجیدہ، سب سے متحمل مزاج اور باوقار فرد ہے۔ وہ قاعدے قانون سے کبھی انحراف نہیں کرتا اور نہ کبھی جانب داری دکھاتا ہے۔ وہ نہایت نیک، رحم دل اور خطا پوش ہے۔ ایک روایت کے مطابق کائنات کا خالق اُنو ہی ہے۔

اُنو نے سب سے پہلے آسمان پیدا کیا۔
تب آسمان نے زمین کو پیدا کیا۔
اور زمین نے دریاؤں کو پیدا کیا۔
اور دریاؤں نے نہروں کو پیدا کیا۔
اور نہروں نے دلدل کو پیدا کیا۔
اور دلدل نے کیڑوں کو پیدا کیا۔ (دانت کے درد کا منتر)

دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ طلب کرنا اُنو کا فرض تھا۔ البتہ وہ عام طور پر اظہارِ رائے سے گریز کرتا تھا۔ موجوداتِ عالم کی تقدیر کا فیصلہ ایک لوح پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اس لوح کا محافظ اِن لیل تھا۔

اِن لیل یا اِیا — اِن لیل کے لفظی معنی طوفان کے آقا کے ہیں۔ عراقی دیو مالا میں اِن لیل سب سے زیادہ صاحبِ جلال اور طاقت ور دیوتا شمار ہوتا تھا۔ وہ اُنو کی قوت تھا، اُنو کی طاقت کا مظہر تھا۔ اور مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں پر عمل درآمد کا فرض عام طور پر اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان اسی کا راج تھا۔ اسی نے زمین کو آسمان سے الگ کیا تھا ورنہ

ابتدا میں دونوں آپس میں جُڑے ہوئے تھے۔ مجلسِ شوریٰ میں بھی اکثر اسی کی بات مانی جاتی تھی۔ مثلاً گل گامش کی داستان میں ثورِ فلک اور جمبابا کی ہلاکت کے بعد جب مجلس شوریٰ میں اَنو یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ گلِ گامش اور اِن کدو میں سے ایک کو مرنا ہوگا تو اِن لیل بڑے تحکمانہ انداز میں یہ فیصلہ صادر کرتا ہے کہ اِن کدو کو مرنا ہوگا گل گامش نہیں مرے گا۔ شمس دیوتا دونوں کی وکالت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اِن کدو اور گلِ گامش نے ثورِ فلک اور جمبابا کو میری اجازت سے ہلاک کیا تھا لہٰذا وہ بے قصور ہیں مگر اِن لیل اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیتا ہے کہ تم روزانہ ان کے پاس جاتے ہو اور انھیں میں گھل مل گئے ہو اسی لیے ان کی وکالت کر رہے ہو۔ بے چارہ شمس خاموش ہو جاتا ہے اور اِن لیل کی بات مان لی جاتی ہے۔

اِن لیل کی اس ہیبت اور طاقت کی وجہ سے نِفر جہاں اِن لیل کا بڑا مندر تھا وادی کا سب سے مقدس شہر خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بابل کے عروج سے پیش تر سومیر اور عکاد کے بادشاہوں کی رسمِ تاج پوشی اِن لیل کے مندر ہی میں ادا کی جاتی تھی اور وادی کا ہر بادشاہ اپنا وقار بڑھانے کی خاطر نِفر کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

سومیری اور عکادی زبانوں میں سب سے زیادہ بھجن اور گیت اِن لیل ہی کی تعریف میں ہیں اور جن لوگوں نے عراق میں آندھیوں کے جھکڑوں اور ریت کے بگولوں کی حشر سامانیاں دیکھی ہیں وہ بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ وہاں کے قدیم باشندے اس جلالی قوت سے کیوں خوف کھاتے تھے اور اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی کیوں فکر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک گیت میں اِن لیل کی حمد و ثنا ان لفظوں میں کی گئی ہے۔

اِن لیل، کوہِ عظیم کے بغیر
کوئی شہر نہیں بن سکتا، کوئی بستی نہیں بن سکتی۔
کوئی دکان نہیں چل سکتی۔ بھیڑوں کا باڑہ نہیں بن سکتا۔
کوئی بادشاہ پیدا نہیں ہو سکتا، کوئی مہاپروہت پیدا نہیں ہو سکتا۔
دریاؤں میں سیلاب کا پانی چڑھ نہیں سکتا۔
سمندر کی مچھلیاں بید کی جھاڑیوں میں انڈے نہیں دے سکتیں

پرندے زمین میں گھونسلے نہیں بنا سکتے۔
آسمان میں گشت لگانے والے بادلوں سے نمی نہیں برس سکتی۔
پودے اور جھاڑیاں جو میدانوں کی رونق ہیں پنپ نہیں سکتیں۔
کھیتوں اور مرغزاروں میں اناج کی بالیاں پھوٹ نہیں سکتیں۔
پہاڑی جنگلوں کے درختوں میں پھل نہیں آ سکتے۔

سومیر و عکاد کے مشہور زمزمہ ءتخلیق کا ہیرو بھی اِن لیل ہی ہے۔ البتہ ۱۹ ویں صدی قبلِ مسیح میں جب بابل کو فروغ ہوا تو وہاں کے پروہتوں نے اس نظم میں تحریف کر کے اِن لیل کے بجائے اپنے شہر کے دیوتا مُردک کو داستان کا ہیرو بنا دیا۔

اِنکی ــــ اِنکی کے لفظی معنی آقائے ارض کے ہیں۔ اس دیوتا کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ وہ بیک وقت خشکی کا دیوتا ہے اور میٹھے پانی کا بھی۔ سامی لوگ اسے آیا کہتے تھے۔ یعنی پانی کا گھر۔ کسی ایک دیوتا میں خشکی اور تری کا امتزاج بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تصّور دراصل اُس تجربے کا پرتو ہے جو دجلہ اور فرات کے ڈیلٹا میں رہنے والوں کو ہر روز ہوتا ہے۔ وہاں دلدل اور ندی نالے اس کثرت سے ہیں کہ خشکی اور تری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا لازمی جزو ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اِنکی شہر اریدو کا جو اس خطے کی سب سے قدیم بستی ہے خاص دیوتا تھا۔

اِنکی دانائی اور فراست کا دیوتا تھا۔ وہ معلّم اعظم بھی تھا اور علوم وفنون کا محافظ بھی۔ جادو منتر کرنے والے بھی اسی سے دعا کرتے تھے۔ وہ

دیوتاؤں کا بڑا بھائی ہے جو خوش حالی لاتا ہے۔
جو کائنات کا حساب داں ہے۔
اور ساری دنیا کا دماغ اور کان۔

ننا ــــ چاند اور سورج کی تابانی نے دنیا کی سبھی پرانی قوموں کو متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان، ایران، مصر اور یونان غرضیکہ ہر ملک میں چاند اور سورج کو رُتبہ حاصل تھا۔ رگ وید اور پارسیوں کی مقدس کتاب گاتھا میں تو چاند سورج کی ثنا وصفت میں بہ کثرت گیت اور بھجن

موجود ہیں۔ یہی صورتِ حال وادیٔ دجلہ وفرات میں بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ مصر، ہند، ایران اور یونان کے برعکس اہلِ عراق چاند کو سورج پر فضیلت دیتے تھے۔ ان کے عقیدے میں اُتو یا شمس دراصل ننا یا سین کا بیٹا تھا۔ اسی طرح فلسطین اور شام کی پرانی قوموں کا بڑا دیوتا چاند تھا جسے وہ ایلات کہتے تھے۔

چاند کی افضلیت کا سبب غالباً ان علاقوں کا موسم تھا۔ وہاں سورج کی تمازت اتنی تیز ہوتی ہے کہ لوگ دھوپ سے بچنے کے لیے پناہ کے گوشے تلاش کرتے ہیں البتہ جب رات آتی ہے اور چاند کی خنک روشنی سے صحرا اور ریگ زار منور ہوجاتے ہیں تو لوگوں کی جان میں جان آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں اُر اور ماری (حریری) کی بادشاہتیں بہت دن قائم رہیں اور ان دونوں شہروں کا بڑا دیوتا چاند (سین) ہی تھا۔

جس طرح ہندو ایکادشی اور پورن ماشی کا تیوہار مناتے ہیں اسی طرح عراق کے لوگ ''سوایل لا'' کا تیوہار مناتے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ ہندو چاند کی پہلی تاریخ اور چودھویں تاریخ کو مقدس مانتے ہیں اور اہلِ عراق ''تیسویں تاریخ کو''۔ ''سوایل لا'' کے معنی ہاتھ اٹھانے کے ہیں۔ غالباً چاند کی تیسویں تاریخ کو جب رات اندھیری ہوتی تھی تو لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دیوتا سے واپس آنے کی دعا کیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک دعا اشور بنی پال کے کتب خانے کی لوحوں پر لکھی ہوئی برآمد ہوئی ہے۔

اے سین! اے ننار تو جو منور ہے
تو جو اپنے بندوں کے لیے روشنی فراہم کرتا ہے
تیری مشعل آگ کی مانند چمکتی ہے
تو مسافروں کی رہنمائی کرتا ہے
تو نے زمین اور آسمان کو روشنی سے بھر دیا ہے
تجھے دیکھ کر لوگوں کی ڈھارس بندھتی ہے
تیری روشنی شمس کی مانند ہے
جو تیرا پہلوٹھی کا بیٹا ہے

عظیم دیوتا تیرے آگے سر جھکاتے ہیں
اور زمین کے فیصلے تیرے رُوبرو رکھے جاتے ہیں
جب عظیم دیوتا تجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں
تو تو انہیں نیک مشورہ دیتا ہے۔
وہ مجلسِ شوریٰ میں تیرے سائے میں بیٹھتے ہیں۔
آج تیسویں تاریخ کو تجھے گہن لگ گیا ہے
پس میں نے تیرے اعجاز میں لوبان اور بخور جلائے ہیں۔
اور سب سے شیریں شراب نذر کی ہے

ایک گیت میں تنار کی ماورائی صفات بیان کرنے کے بعد شاعر اس کا رشتہ زمین سے ان لفظوں میں جوڑتا ہے۔

تو وہ ہے کہ جب تیرا کلام زمین پر نازل ہوتا ہے
تو ہریالی اور سبزیاں اُگتی ہیں
اور بھیڑیں بکریاں موٹی ہوتی ہیں۔
اور ان کی نسل بڑھتی ہے۔
اور صداقت و انصاف کا ظہور ہوتا ہے
اور لوگ سچ بولتے ہیں
تیرا کلام دَورِ آسمان میں اور زمین کے نیچے پوشیدہ ہے
تیرا کلام کون سمجھ سکتا ہے۔
کون اس کی ہمسری کر سکتا ہے
زمین اور آسمان میں تیرا کوئی ثانی نہیں۔

اُتو یا شمس ـــ یہ درست ہے کہ اہلِ عراق چاند کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور اس کی ٹھنڈی اور پُراسرار روشنی ان کے جسم کو آرام پہنچاتی تھی مگر وہ جانتے تھے کہ زندگی کی ساری رونق سورج ہی کے دم سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کے عقیدے میں شمس کو وہ مقام

حاصل ہو گیا جو مصر میں آمون رع کو حاصل تھا چنانچہ سورج سے وہ تمام صفات منسوب کر دی گئیں جو بعد میں خدا کی ذات سے منسوب ہوئیں۔ وہ جہاں بیں اور دانائے راز قرار پایا جس کی نگاہیں ہر نیکی بدی کو دیکھ لیتی تھیں۔ انسان کی کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں تھی اور نہ کائنات کا کوئی گوشہ اس سے چھپا ہوا تھا لیکن اس ہمہ گیر قوت کے باوجود وہ نہایت شفیق، ستارِ عیوب اور رحم دل دیوتا تھا۔ وہ مشکل کے وقت ہر حاجت مند کے کام آتا تھا وہ انصاف اور صداقت کا پیکر تھا۔ وہ بدلوگوں کو سزا دیتا تھا اور نیک لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ چنانچہ ایک شاعر شمس دیوتا کی تعریف ان لفظوں میں کرتا ہے:

تو جو تاریکی کو روشنی میں بدل دیتا ہے
اور زمین و آسمان کی بدیوں کو کچل دیتا ہے
تیری شعاعیں سمندر کی لہروں اور پہاڑ کی اونچی چوٹیوں کو
اپنے جال میں گرفتار کر لیتی ہیں۔
سب لوگ تیرے ظہور پر خوش ہوتے ہیں۔
تو دنیا کے سب لوگوں کا نگاہ بان ہے۔
خداوند ایا نے جتنی مخلوقات پیدا کی ہیں
تو ان سب کی نگرانی کرتا ہے
اور جن کو زندگی عطا ہوئی ہے تو ان کا بھی پاسبان ہے
بے شک تو زمین اور آسمان کی سب مخلوقات کا گڈریا ہے۔
تو روزانہ بڑی مستعدی سے زمین کے اوپر سے گزرتا ہے۔
تیری شعاعیں اس گہرائی میں پہنچ جاتی ہیں۔
جس کا علم عظیم دیوتاؤں کو بھی نہیں ہے۔
سمندر کے اژدہے بھی تیری روشنی کے منتظر رہتے ہیں
دن کے وقت تیرا چہرہ تردّد سے تاریک نہیں ہوتا۔
اور رات کے وقت تو آسودہ اور مطمئن آرام کرتا ہے

تو کتنی دیر تک جاگتا رہتا ہے
تو دن کے وقت سفر کرتا رہتا ہے۔
اور رات کے وقت واپس جاتا ہے۔
تیرے سوا کسی دیوتا کو اتنی فکر نہیں
کہ ہمارے لیے اپنے کو تھکائے اور ہلکان کرے۔
اس کے باوجود کوئی دیوتا اتنا تاباں وشاداں نہیں جتنا تو ہے۔
تو ان تمام ملکوں کے منصوبوں سے بھی واقف ہے۔
جن کی زبانیں ہم سے مختلف ہیں۔
اے شمس! ساری دنیا تیری روشنی کے لیے بے تاب رہتی ہے
تو خشکی کے اس مسافر کا رفیق ہے
جس کی راہ کٹھن ہے
اور تری کے اس مسافر کی ہمّت بڑھاتا ہے
جو پانی سے ڈرتا ہے۔
تو انجان راہوں میں شکاری کی رہبری کرتا ہے۔
اور وہ سورج کی مانند اونچی سے اونچی جگہوں کو آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔
تو سوداگر اور اس کی تھیلی کو سیلاب سے بچاتا ہے۔
تیرا وسیع جال اس آدمی کو گرفتار کر لیتا ہے۔
جس نے اپنے دوست کی بیوی پر بری نگاہ ڈالی۔
تو بدی کرنے والوں کے سینگ توڑ دیتا ہے۔
اور جو شخص حساب میں بد دیانتی کرتا ہے۔
تو اس کی بنیاد گرا دیتا ہے
بے ایمان حاکم کو تو بندی خانے کی راہ دکھاتا ہے
اور رشوت لینے والے کو سزا دلواتا ہے

اور جو شخص رشوت نہیں لیتا
بلکہ کمزوروں اور مظلوموں کی وکالت کرتا ہے
تو اس کو خوشی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے
اور وہ حاکم جو سچا فیصلہ کرتا ہے
شاہی محل کا مستحق قرار پاتا ہے۔
اور وہ ساہوکار جو بھاری سود لیتا ہے
اور ناجائز نفع کماتا ہے
آخرکار تیرے حکم سے تھیلی کا بوجھ کھو دیتا ہے
اور وہ جو تین شیکل پر ایک شیکل نفع کماتا ہے۔
تیرا پسندیدہ ہوتا ہے
اور وہ جو تولتے وقت ڈنڈی مارتا ہے
یا غلط بٹے استعمال کرتا ہے
آخرکار تیرے حکم سے اپنی تھیلی کا بوجھ کھو دیتا ہے
نیک کام کرنے والوں کو تو
جیسے چشمۂ حیات کی مانند اچھے پھل عطا کرتا ہے
کمزور انسان اپنی کھوکھلی آواز سے
تجھی کو پکارتا ہے
اور مفلس، مظلوم، ضعیف اور بدسلوکیوں کا شکار
تجھی سے فریاد کرتے ہیں۔

یہ تھے صفِ اوّل کے دیوتا جن کو اَنو اور اِن لیل کا قرب حاصل تھا مگر ان کے علاوہ قدرت کے تمام مظاہر اور اوصاف کے الگ الگ دیوتا بھی تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی وہ حیثیت تو نہ تھی جو اَنو کے ارکانِ وزارت کی تھی لیکن وادی دجلہ و فرات کے باشندے ان کی بھی پوجا کرتے تھے اور ان کے بت مندروں میں رکھتے تھے۔ مثلاً جو کا دیوتا اشنان تھا اور

مویشیوں کا دیوتا شموفان تھا اور بچوں کی ولادت کی دیوی گولا تھی اور نزسل کی دیوی ندابا تھی اور سفر کا دیوتا پاسگ تھا۔ چنانچہ علمائے آثار کا تخمینہ ہے کہ عراق میں کم از کم تین ہزار دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔

ان خداؤں کے علاوہ ہر خاندان بلکہ ہر گھر کا ایک ذاتی معبود بھی ہوتا تھا۔ اس معبود کا نام نہ تھا اور نہ اس کا کوئی بت بنایا جاتا تھا البتہ اس کے لیے ہر گھر میں ایک چھوٹا سا حجرہ یا گوشہ ضرور مخصوص ہوتا تھا اور خاندان کا بزرگ اس حجرے میں بیٹھ کر اپنے انفرادی دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ اس معبود سے گھر والوں کے تعلقات بالکل ذاتی ہوتے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ وہ گھر کا ایک فرد ہوتا تھا۔

قیاس کہتا ہے کہ اٹھارھویں صدی قبلِ مسیح میں جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آبائی وطن ار کو خیر باد کہا اور حاران ہوتے ہوئے فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اپنے اسی بے نام معبود کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور یہی وہ معبود تھا جس کو انجیل ابراہیم اور اسحاق کا خدا کہتی ہے کیونکہ وہ ابراہیم کا ذاتی خدا تھا جو سفر اور حضر میں ابراہیم کے ساتھ رہتا تھا۔

چھٹا باب

اہلِ بابل کا عقیدہ تخلیق

افلاطون بیان کرتا ہے کہ ایک روز میں اور دوسرے شاگرد حکیم سقراط کی خدمت میں حاضر تھے کہ اٹلی کا مشہور فلسفی تماؤس استاد سے ملنے آیا۔ تماؤس حکیم فیثا غورث کا شاگرد تھا۔ اُس کو علمِ نجوم میں کمال حاصل تھا اور کائنات کی ماہیت کے بارے میں بھی اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ سقراط، تماؤس سے بڑے تپاک اور خلوص سے ملا۔ رسمی مزاج پُرسی کے بعد وہ دونوں پرانی صحبتوں کا ذکر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد موقع پا کر ہم لوگوں نے تماؤس سے درخواست کی کہ اے حکیم! ہمیں کائنات کے رازہائے سربستہ سے آگاہ کر اور بتا کہ سورج، چاند، زمین، آسمان اور حیوان کب اور کیسے ظہور میں آئے۔ کیا موجواتِ عالم خود بخود عدم سے وجود میں آگئے یا کسی خالق نے انھیں خلق کیا۔ تماؤس نے ہماری درخواست منظور کر لی اور تخلیقِ کائنات کے موضوع پر مسلسل کئی گھنٹے تک بولتا رہا۔ ہم لوگ تو خیر مبتدی تھے، سقراط جیسا منطقی بھی تماؤس کی دلیلیوں سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ بالآخر جب یہ دلچسپ محفل برخاست ہوئی تو میں نے گھر آ کر تماؤس کے خیالات کو قلم بند کر لیا۔

افلاطون کی تصنیف ''تماؤس'' کو ڈھائی ہزار برس ہو چکے ہیں لیکن ابتدائے آفرینش کا مسئلہ ہنوز بحث و تحقیق کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اہل خرد موجوداتِ عالم کی اصل حقیقت کی تلاش میں اب تک سرگرداں ہیں۔ اس اثنا میں مذہبی صحیفے اپنے معتقدین کے ذوقِ جستجو کی تسکین کی خاطر تخلیقِ کائنات کا قصہ بڑے وثوق اور اعتماد سے اور بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کرتے رہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکی مزاج انسان کی تشفی نہیں ہو سکی اور اب تک یہی محسوس کرتا ہے کہ کتابِ ہستی کا پہلا ورق اس کی نگاہوں سے اب تک پوشیدہ ہے۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

البتہ جب سائنس کو فروغ ملا دور بینیں اور خورد بینیں ایجاد ہوئیں اور انسان نے ذرّے کا جگر چیر کر ایٹم کا راز معلوم کر لیا اور تحقیق و تجربے کی نگاہوں نے مادّے کی حرکت اور تغیّر کے قانون دریافت کر لیے تو فلسفیانہ قیاس آرائیوں کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن کائنات کا سائنسی تصور ابھی تک عام نہیں ہوا ہے اور لوگوں کے ذہنوں پر اب تک قدیم عقائد کا غلبہ ہے۔

تکوینِ کائنات کے مروّجہ عقیدوں میں جزئیات سے قطع نظر تخلیقِ کائنات کا عقیدہ مشترک ہے۔ چنانچہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا پارسی اور یہودی سب اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کو کسی طاقت نے پیدا کیا ہے۔ وہ خود بخود عدم سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ خلق کی گئی ہے۔

وادیِ دجلہ و فرات، وادیِ سندھ، مصر، اناطولیہ، یونان، شام و فلسطین اور ایران کی پرانی قومیں بھی تخلیق کی قائل تھیں۔ لیکن ان کے نزدیک تخلیق ایک مسلسل عمل تھا۔ یہ عمل ہر سال موسمِ بہار میں شروع ہوتا تھا اور موسمِ سرما کے آغاز پر ختم ہو جاتا تھا۔ تب کائنات پر تخریب اور موت کی طاقتیں غالب آ جاتی تھیں۔ وہ دیکھتے تھے کہ سبزہ، پھل پھول اور اناج کے پودے موسمِ بہار کی آمد پر نمودار ہوتے ہیں اور جب سردیاں آتی ہیں تو کائنات پر مردنی چھا جاتی ہے۔ گویا تخلیق اور تخریب کی طاقتوں میں مسلسل پیکار رہتی ہے۔ قدیم انسان نے تخلیق کی طاقتوں کو خیر سے تعبیر کیا اور تخریب کی طاقتوں کو شر سے مگر خیر و شر کا یہ تصور سماجی تھا اخلاقی نہ تھا۔ یعنی جن طاقتوں سے انسان کو اپنی سماجی زندگی کی بقا اور ترقی میں مدد ملتی تھی انسان نے ان کو خیر قرار دیا اور جن طاقتوں سے اس کی سماجی زندگی میں خلل پڑتا تھا ان کو شر کا نام دیا۔ چنانچہ جب بہار کا موسم آتا تھا اور زندگی موت کی گرفت سے آزاد ہوتی تھی تو یہ لوگ خوشی کے ناچ ناچتے تھے، خوشی کے گیت گاتے تھے اور خوشی کے تیوہار مناتے تھے۔ ان کے تمام رسوم و رواج اور جادو منتر تخلیق کے اسی بنیادی تصور کے گرد گھومتے تھے۔ ان کا عقیدۂ تخلیق افزائشِ نسل و فصل کے سماجی محرکات کا عکس تھا۔

مگر قدیم انسان تخلیق اور تخریب کے ازلی پیکار کا فقط تماشائی نہ تھا بلکہ وہ اس جنگ میں

تن من دھن سے شریک ہوتا تھا۔ وہ اس ڈرامے کا اہم کردار تھا۔ وہ اپنے ناچ گانوں، رمسوں اور لیلاؤں، جادو منتروں اور بھجوں کے ذریعے تخلیق کی طاقتوں کی حمایت کرتا تھا اور تخریب کی طاقتوں کو شکست دینے کی تدبیریں اختیار کرتا تھا۔

ہم حجری دور کے شکاری انسان کا ذکر کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ فراہمیٔ غذا کی تدبیروں میں جادو کی کیا اہمیت تھی۔ دراصل شکاری دور کے انسان کی سبھی رسمیں فراہمیٔ غذا سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ ان کے رمی ناچوں کی نوعیت بھی یہی تھی۔ مثلاً قبیلے کا جادوگر یا آزمودہ کار شکاری ہرن، بارہ سنگھے یا کسی پرند کی کھال اوڑھ کر ان کی حرکتوں کی نقل کرتا تھا۔ قبیلے کے شکاری اُس کے گرد کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ جنگلی جانوروں کی مانند ان پر حملہ کرتا تھا اور غصے میں آ کر جانوروں کی سی آوازیں نکالتا تھا۔ شکاریوں کے جذبات بھی برانگیختہ ہو جاتے تھے اور وہ بھی اچھل کود کر کبھی سوانگیے پر حملہ کرتے تھے کبھی اس کی زد سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس قسم کی رسمیں عام طور پر شکاری مہم کے آغاز کے وقت ادا کی جاتی تھیں۔ اس طرح شکاریوں کو پورا پورا یقین ہو جاتا تھا کہ اب وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

اسی طرح زرعی دور کے سب تیوہار فصلوں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً بسنت کا تیوہار جاڑے کے اختتام پر منایا جاتا ہے۔ جب سردی گھٹنے اور سرسوں پھولنے لگتی ہے۔ ہولی کا تیوہار آمدِ بہار کا مژدہ سناتا ہے۔ بیساکھی کا تیوہار فصل کٹنے پر منعقد ہوتا ہے۔ غرضیکہ سبھی تیوہار زرعی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا جذباتی مظہر ہوتے ہیں۔

زرعی زندگی میں زمین کی زرخیزی، موسموں کی تبدیلی اور بارش کی کمی یا کثرت ایسی ارضی اور سماوی حقیقتیں ہیں جو کھیتی باڑی کرنے والوں کے جذبات اور احساسات کو شدت سے متاثر کرتی ہیں۔ فصلوں کی نشو ونما اور سلامتی پر ان کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ بیج بونے اور فصل کاٹنے کے درمیان یوں تو فقط چند ماہ کا وقفہ ہوتا ہے لیکن اس مختصر مدت میں بھی کاشت کار کئی بار مرتا اور کئی بار جیتا ہے۔ اس نے کھیت کو کئی بار جوتا اور ہموار کیا لیکن بیج بوتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور بیج بہہ گیا۔ اس آفت سے بچے تو اناج کے پودوں میں کیڑے لگ گئے یا وقت پر بارش نہ ہوئی اور پودے سوکھ گئے۔ یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزرا اور

بالیاں پکنے لگیں تو اولے پڑ گئے یا پالے نے فصل برباد کر دی یا ٹڈیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ منزل بھی طے ہوئی اور اناج کھلیان میں لا کر رکھا گیا تو آگ لگ گئی یا بارش ہو گئی۔ غرضیکہ کاشت کار کو تمام وقت اور قدم قدم پر ارضی اور سماوی آفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرعی عہد کے ابتدائی دور کا کاشت کار فصل کے ہر نازک موڑ پر اپنے جذباتی تناؤ کو فصلی تیوہاروں کی شکل میں ظاہر کرتا تھا۔ ان فصلی تیوہاروں کی غرض و غایت بھی وہی تھی جو سرکاری رسموں کی تھی۔ یہ تیوہار تفریح کی خاطر نہیں منائے جاتے تھے بلکہ اس موقعے پر نہایت اہم اور سنجیدہ افزائشی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ ان رسموں کا مقصد قدرت کے ناقابلِ اعتبار عناصر کو منتروں، ناچ گانوں، بھجنوں، رہسوں اور لیلاؤں کے ذریعے قابو میں لانا ہوتا تھا۔

فصلی یا موسمی تیوہاروں کی سماجی افادیت ہم مدت گزری فراموش کر چکے ہیں اب تو فصلی سن کا رواج بھی آہستہ آہستہ اٹھتا جا رہا ہے کیونکہ صنعتی شہروں کے باشندوں کی زندگی موسم کے تغیرات سے چنداں متاثر نہیں ہوتی اور نہ ان کے حسّی اور جذباتی تجربوں کو سردی کے جانے اور بہار کے آنے سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ شہر کے لوگ تو گرمی سے پناہ مانگتے ہیں اور سردی کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ سردی کی لمبی اندھیری اور ٹھٹھرتی راتیں ان دیہاتیوں پر کیا قیامت ڈھاتی ہیں جن کو نہ گرم کپڑے میسر ہوتے ہیں نہ آگ جلانے کے لیے ایندھن اور نہ روشنی کے لیے تیل اور بجلی۔ انھیں کیا خبر کہ جب دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہونے لگتی ہیں اور بسنت رُت آنے لگتی ہے تو دیہات کے لوگ کیا محسوس کرتے ہیں۔ کراچی کے رہنے والوں کو تو چاندنی میں بھی کوئی دلچسپی نظر نہ آتی ہوگی مگر اس چاندنی کا لطف عرب کے صحرانشینوں سے پوچھیے۔

قدیم زمانے میں سب سے اہم موسمی تیوہار نوروز کا تھا۔ یہ تیوہار ہر جگہ موسمِ بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس موقعے پر پرانی قومیں افزائشی رسمیں ادا کرتی تھیں۔ تخلیقِ کائنات کا عقیدہ دراصل انھیں رسموں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

سماجی رسموں کے دو عنصر ہوتے ہیں خواہ یہ رسمیں افزائشی ہوں یا مذہبی یا شادی بیاہ کی۔ ایک عنصر چند مخصوص حرکات و اعمال پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرا الفاظ پر۔ حرکات و اعمال کے عنصر کو اہلِ یونان Dromenon ڈراما کہتے تھے اور ان حرکات کے دوران میں جو الفاظ بولے،

پڑھے یا گائے جاتے تھے وہ انھیں Muthos یعنی متھ یا افسوں کہتے تھے۔ رسموں کے دوران میں اداکار جن واقعات کی نقل اپنی حرکات سے پیش کرتے تھے افسوں خوان انھیں واقعات کو لفظوں کی زبان میں گا کر بیان کرتے جاتے تھے۔ جن لوگوں نے رام لیلا دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ رام لیلا کے موقعے پر ایک طرف پنڈت چوکی پر بیٹھے رامائن کے اشلوک مخصوص دُھن میں پڑھتے ہیں اور دوسری طرف اداکار رامائن کے کرداروں کا روپ دھار کر منھ پر مصنوعی چہرہ باندھے (Mask) انھیں واقعات کی نقل کرتے ہیں جو اشلوک میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح دُرگا پوجا کے زمانے میں ہر مندر میں ایک طرف پنڈت ویدوں کے اشلوک گاتا ہے دوسری طرف لڑکیاں دُرگا کی مورتی کے سامنے بھاؤ بتا بتا کر ناچتی رہتی ہیں۔

مگر یہ رسمیں ہندوؤں تک مخصوص نہیں ہیں بلکہ دوسرے مذاہب کی رسموں میں بھی یہ دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً حج کی رسم جس میں حاجیوں کو کعبے کا طواف کرنا پڑتا ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا پڑتا ہے۔ مِنیٰ کے مقام پر پتھر پھینکنے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور معلّموں کے ہمراہ یا از خود مخصوص آیتیں اور دعائیں پڑھنی ہوتی ہیں۔

اسی طرح افزائشی رسموں کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک حرکاتی یا عملی اور دوسرا کلماتی۔ رسموں کی ادائیگی کے سلسلے میں جو کہانی بیان کی جاتی اور کھیلی جاتی تھی قدیم انسان اس کی صداقت اور اثر انگیزی پر سچے دل سے یقین رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس موقعے پر گائے جانے والے منتروں، بھجنوں، گیتوں اور اشلوکوں میں بڑی طاقت ہے اور ان کی تکرار سے وہ حالات[1] ضرور پیدا ہوں گے جن کا ذکر کہانی میں ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کہانی کے واقعات تاریخی اعتبار سے صحیح تھے یا نہیں کیونکہ افسوں کا مقصد لوگوں کے علم میں اضافہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کو اُس تخلیقی عمل پر آمادہ کرنا تھا جو پوری قوم کے وجود کے لیے نہایت اہم تھا۔

تخلیقِ کائنات کی داستانیں ہر پرانی قوم میں رائج تھیں۔ ان داستانوں کی تشریح کرتے ہوئے بعض دانش وروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قدیم انسان مظاہر قدرت کو بڑی حیرت اور استعجاب سے دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے اور ان کو کس نے پیدا کیا۔ چنانچہ ان سوالوں کے جواب میں ہر قوم نے تخلیقِ کائنات کے متعلق اپنی ایک داستان

تصنیف کر لی لیکن دانش وروں کی اس قیاس آرائی کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اولاً قدیم انسان کا شعور اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ وہ تکوینِ کائنات کے باریک نکات کے بارے میں غور و فکر کرتا یا یہ سوچتا کہ چاند، سورج اور زمین و آسمان کب اور کیسے وجود میں آئے لہٰذا اس کے وجود کے تقاضوں میں ان فلسفیانہ موشگافیوں کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ دوئم تاریخ شاہد ہے کہ یہ داستانیں انسانوں کے ذوقِ جستجو کی تسکین کی خاطر وضع نہیں کی گئی تھیں بلکہ یہ ان افزائشی رسموں کا جز تھیں جو نوروز اور دوسرے تیوہاروں کے موقعے پر ناٹک، رہس یا لیلا کے طور پر کھیلی اور بھجن اور زمزموں کے انداز میں گائی جاتی تھیں۔ سوئم ان داستانوں کے اندر تخلیق کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مظاہرِ قدرت کے مطالعے سے دور کا بھی رشتہ ہوگا۔ چنانچہ برطانیہ کا مشہور فلسفی پروفیسر کارن فورڈ یونان اور بابل کی داستانِ تخلیق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> "تخلیق کی داستان مظاہرِ قدرت کے مطالعے کا نتیجہ نہیں ہے۔ تاروں بھرے آسمان اور دور دور تک پھیلی ہوئی زمین کا مشاہدہ کرنے کے بعد فقط ایک دیوانہ ہی وہ بھی حشیش پی کر یہ نظریہ پیش کرسکتا ہے کہ زمین اور آسمان کو اژدہے کے پیٹ اور پیٹھ سے بنایا گیا ہے۔ مگر فرض کرو کہ کہیں پر کوئی ایسی ڈرامائی رسم ادا کی جارہی ہو جس میں شر اور تخریب کی قوتوں کی نمائندگی ایک پروہت اداکار اژدہے کا چہرہ منھ پر لگا کر کرے اور خیر اور تخلیق کی نمائندگی بادشاہ کر رہا ہو اور مقصد اس ڈرامے کا قدرت اور سماج کا ساحرانہ احیا ہو ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ ایک بھجن یا گیت ایسا لکھا جائے جس میں دیوتاؤں کے بادشاہ اور سمندر کے اژدہے میں زبردست جنگ کا بیان ہو۔ یہ بھجن ہر اس موقعے پر گایا جائے گا جب یہ ڈرامہ کھیلا جائے گا"۔

جب تک یہ رسوم اور مناسک ادا ہوتے رہے تخلیقِ کائنات کی داستان ڈرامے کا جز بنی رہی۔ ڈرامہ دیکھنے اور بھجن سننے والے اس داستان کو جشن نوروز کا ایک حصہ سمجھتے رہے اور اس کی علامتی اہمیت ان پر بخوبی روشن رہی۔ البتہ جب یہ ڈرامائی رسمیں ختم ہوگئیں اور نوروز کا جشن

موقوف ہو گیا تو داستانوں کی اصل نوعیت بھی نظروں سے پوشیدہ ہو گئی اور صدیاں گزر جانے کے بعد جب دانش وروں نے ان داستانوں کو رسوم سے الگ کر کے فقط ادبی تخلیق کے طور پر پڑھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قدیم انسان نے تخلیقِ کائنات کی دیو مالائی تشریح کی ہے۔ حالانکہ قدیم انسان اس کہانی کی مدد سے نسل و فصل کی افزائش کا سالانہ احیا کیا کرتا تھا۔ اسے ابتدائے آفرینش کا سراغ لگانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اب ہم تخلیق کائنات کی ان قدیم داستانوں کا جائزہ لیں گے جو وادیِ دجلہ و فرات، مصر و اناطولیہ، یونان وغیرہ میں جشنِ نوروز اور دوسرے موسمی تیوہاروں کے موقعے پر ڈرامائی انداز میں بطور رسوم پیش کی جاتی تھیں۔

وادیِ دجلہ و فرات میں تین موسمی تیوہار بڑی عقیدت اور جوش سے منائے جاتے تھے۔ اوّل تو نوروز کا تیوہار جسے اہل عکاد و سومیر ''اکی تو'' کہتے تھے۔ اکی تو ان کا سب سے بڑا تیوہار تھا جو سردیوں کی بارش کے بعد اپریل (ماہِ نسان) میں منایا جاتا تھا دوسرا تموز کا تیوہار تھا جو سال کے چوتھے مہینے (جولائی) میں گرمیوں میں منایا جاتا تھا جبکہ سبزہ و گیاہ ناپید ہو جاتے تھے۔ تموز دراصل غم کا تیوہار تھا اور اس موقعے پر تموز کی موت اور عشتار کے سفر ظلمات کی داستان پڑھی اور کھیلی جاتی تھی۔ تیسرا تیوہار تشری تھا جو ستمبر میں فصل کاٹنے پر منایا جاتا تھا۔

شہری ریاستوں کے سومیری دور میں اکی تو اور تشری دونوں نوروز کے تیوہار سمجھے جاتے تھے۔ کسی جگہ لوگ اکی تو کو نوروز کے طور پر مناتے تھے اور کسی جگہ تشری کو۔ اُر اور اریک میں تو نوروز کا جشن سال میں دو بار منایا جاتا تھا۔ البتہ جب بابل میں پہلی سلطنت قائم ہوئی تو اکی تو کو سرکاری طور پر نوروز کا تیوہار قرار دیا گیا اور تب سارے ملک میں نوروز کا تیوہار نسان یعنی موسم بہار میں منایا جانے لگا۔

نوروز کے تیوہار کے تین اہم عنصر تھے۔ اوّل تخلیقِ کائنات کا ڈرامہ جس میں بادشاہ ہیرو کا کردار ادا کرتے تھے۔ دوسرے بادشاہ کی ازسرِ نو تاج پوشی اور تیسرے سب سے بڑے دیوتا مردُک اور اس کی بیوی کی شادی۔ اس رسم میں بھی بادشاہ مردُک کی نمائندگی کرتا تھا اور اس کی شادی ملکہ یا کسی مندر کی باوقار دیوداسی سے رچائی جاتی تھی۔

وادیِ دجلہ وفرات کے قدیم نوشتوں میں تخلیقِ کائنات کی کئی داستانوں کا سراغ ملتا ہے لیکن ان میں سب سے جامع، مفصل اور مربوط وہ نظم ہے جو سلطنتِ بابل کے ابتدائی دنوں میں مرتب کی گئی تھی۔ اس نظم کے نسخے نینوا، اشور اور کیش کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ گو یہ لوحیں ایک ہزار قبل مسیح کی تحریر ہیں لیکن علمائے آثار کا خیال ہے کہ اصل نظم دو ہزار سال قبلِ مسیح میں تصنیف ہوئی تھی۔ یہ نظم نوروز کے چوتھے دن بڑے خشوع وخضوع سے پڑھی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس ڈرامائی نظم کا ہیرو اِن لیل (ایا) تھا لیکن بابل کے عہدِ اقتدار میں اِن لیل کا رتبہ مردُک (بعل) کو مل گیا جو شہر بابل کا قدیم دیوتا تھا۔

یوں تو نوروز کا تیوہار پورے ملک میں منایا جاتا تھا لیکن بابل کے جشنِ نوروز کی شان و شوکت کا کوئی جواب نہ تھا۔ کیونکہ مردُک کا سب سے بڑا معبد جسے ایساغ اِلہٰ کہتے تھے بابل ہی میں تھا اور بادشاہ اس تیوہار کی رسموں میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوتا تھا۔

نوروز کا تیوہار ماہِ نسان میں گیارہ دن تک منایا جاتا تھا۔ ابتدائی آٹھ دن سوگ کے ہوتے تھے کیونکہ عکادی عقیدے کے مطابق شر اور تخریب کی طاقتیں انھیں تاریخوں میں مردُک پر غالب آ ئی تھیں اور اسے اسیر کر کے پاتال میں لے گئی تھیں اور تب مردُک کا بیٹا نیبو Nebo باپ کو چھڑا کر لایا تھا۔ دوسری تاریخ کو جب دو گھڑی رات باقی رہتی تھی تو اُری گلو (مہاپروہت) اٹھ کر دریائے فرات کے پانی سے غسل کرتا اور نیا لباس پہن کر بعل دیوتا کے روبرو کھڑا ہوتا اور یہ دعا مانگتا تھا۔

بعل جس کا جلال بے مثال ہے
بعل جو رحیم اور مالکِ ارض ہے
جس کے طفیل عظیم دیوتا ہم پر مہربان ہیں
بعل جس کی ایک نگاہ طاقت وروں کو خاک میں ملادیتی ہے۔
جو بادشاہوں کا آقا، قسمتوں کا تعیُّن کرنے والا اور بنی نوعِ انسان کے لیے نور کا مینار ہے۔
بعل! تیرا تخت بابل میں ہے اور تیرا تاج بورسیپا میں۔

وسیع آسمان تیرا جگر ہے۔
تو بصیرِ کائنات ہے
تیری ندائے غیب، غیب دانوں پر غالب ہوتی ہے
تیرا ہر اشارہ فرمان ہے۔
تیرے بازو سورماؤں کو کچل دیتے ہیں۔
دنیا کے مالک جو سب پر کرم کرتا ہے
کون ہے جو تیری ثنا نہ کرے گا؟
کون ہے جو تیری عظمت کا اعتراف نہ کرے گا؟
کون ہے جو تیری شوکت وحشمت کے گیت نہ گائے گا؟
کون ہے جو تیری بادشاہت کی تعریف نہ کرے گا؟
دنیا کے مالک جو ای ادادل میں رہتا ہے
جو گرے ہوؤں کو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا ہے
اپنے شہر بابل پر رحم کر۔
اپنا منہ اپنے معبد ایساغ اِلہٰ کی طرف پھیر دے
بابل کے بچوں کی آزادی برقرار رکھ
وہ تیری حفاظت میں رہیں
اس دعا کی ۲۱ سطریں ہیں
یہ عددِ ایساغ اِلہٰ کا راز ہے
اور ایکوا کے اُری گلو کے علاوہ کوئی شخص اسے نہ دیکھے

یہ دعا پڑھنے کے بعد اُری گلو مندر کا دروازہ کھول دیتا ہے اور باہر بیٹھے ہوئے پروہت ادب سے کھڑے ہو جاتے اور بعل اور بعلت کی مقررہ رسمیں ادا کرتے تھے۔

نِسان کے تیسرے دن مہا پروہت دوسرے دن کے مانند دو گھڑی رات رہے اٹھتا اور نہا دھو کر بعل کی عبادت کرتا پھر کالو پروہت اور اس کے ساتھی دیوتا کے روبرو کھڑے ہو کر گاتے

بجاتے۔ تین گھڑی دن چڑھے مہاپروہت اپنے کاری گروں کو بلواتا اور مرڈک کے خزانے میں سے چندن کی لکڑی، سونا اور جواہرات ان کو دیتا تا کہ وہ مرڈک اور اس کی زوجہ کی مورتیاں بنالائیں۔ مورتیاں بن کر آتیں تو ان کو انصاف کے دیوتا داعیان کے مندر میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ان کی پوشاک سرخ ہوتی تھی اور ان کی کمر میں کھجور کی پتیوں کی کردھنی پڑی ہوتی تھی۔ ایک مورتی کے بائیں ہاتھ میں چندن کا ایک سانپ بنا ہوتا اور دوسری کے بائیں ہاتھ میں ایک بچھو۔ چھٹے دن جلاد ان مورتیوں کا سرقلم کر کے ان کو آگ میں پھینک دیتا تھا۔

چوتھے دن مہاپروہت سورج نکلنے کے سوا تین گھنٹے پہلے اٹھ کر دریا میں نہاتا۔ پہلے بعل کے حضور میں حاضر ہو کر دعائیں پڑھتا پھر بعلیۃ کی مورتی کی پوجا کرتا۔ ان عبادتوں سے فارغ ہو کر وہ مندر کے بڑے صحن میں داخل ہوتا اور شمال کی طرف منھ کر کے تین بار ایساغ الہٰ کی سلامتی کی دعا مانگتا۔ تب پھاٹک کھولا جاتا اور مندر کے سب پروہت صحن میں جمع ہو کر بھجن گاتے اور ساز بجاتے۔ اسی دن بادشاہ مرڈک کے بیٹے نیبو (Nebo) کو لانے بیرنمرود جاتا جو بابل سے دس میل دور واقع تھا۔

اسی اثنا میں شہر کے لوگ مرڈک کی اسیری اور موت کا سوگ منانے میں مصروف رہتے۔ عقیدت مندوں کی ٹولیاں سڑکوں پر بین کرتیں۔ ایک شاہی مجرم تخریب کے دیوتا کی نقل کرتا اور تماشائیوں کا ہجوم اس کے ہمراہ کوچہ و بازار میں گھومتا رہتا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مرڈک کے نہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں سخت ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ مرڈک کے رتھ کو بلا رتھ بان کے شاہ راہوں پر دوڑایا جاتا۔ غرضیکہ تیوہار کے ابتدائی دنوں میں شہر میں خلفشار اور ہنگامہ برپا رہتا اور یوں محسوس ہوتا گویا شہر کا نظم و نسق بالکل درہم برہم ہو چکا ہے اور ہر طرف طوائف الملو کی پھیلی ہوئی ہے۔

جب چوتھا دن تمام ہونے لگتا تو دن بھر کے بھوکے پیاسے پروہت فاقہ توڑتے اور مہاپروہت مندر میں بیٹھ کر زمزمہء تخلیق ابتدا سے انتہا تک پڑھتا۔ اس دوران میں آنو کا تاج اور ان لیل کا تخت چادروں سے ڈھک دیا جاتا تھا۔

پانچویں دن مہاپروہت طلوع آفتاب سے چار گھنٹے پہلے اٹھتا اور نہا دھو کر عبادت میں

مشغول ہو جاتا۔ اس کے بعد گانے بجانے کا دور شروع ہوتا اور طلوع آفتاب کے دو گھنٹے بعد مُش مُشو پروہت دریائے دجلہ وفرات کا پانی مندر پر چھڑکتا۔ مندر کے وسط میں رکھا ہوا تانبے کا طبل بجاتا، لوبان جلاتا اور بھجن گا کر مینڈھے کی قربانی کرتا۔ مینڈھے کا خون مندر کی دیواروں پر چھڑکتا اور مینڈھے کے سر اور دھڑ کو لے کر دریا کے کنارے جاتا اور پچھم کی طرف منہ کر کے ان کو دریا میں پھینک دیتا تھا۔ اس کے بعد مُش مُشو شہر سے باہر چلا جاتا اور جب تک تیوہار ختم نہ ہو جاتا شہر میں داخل نہ ہوتا۔

اسی دن بادشاہ نبو دیوتا کی مورتی کو کشتی میں رکھ کر بابل واپس آتا لیکن مندر میں داخل ہونے سے پہلے اسے اپنے شاہی نشان — چکر، عصا اور تلوار — مہا پروہت کے حوالے کرنے پڑتے تھے۔ مہا پروہت ان چیزوں کو مرڈک کے بت کے سامنے ایک کرسی پر رکھ دیتا اور پھر بادشاہ کے منہ پر ایک طمانچہ مارتا اور کہتا:

"پروہت بادشاہ کو خداوند بعل کے حضور میں پیش کرے گا۔ وہ بادشاہ کو کان پکڑ کر لائے گا اور اسے زمین پر جھکائے گا اور بادشاہ فقط ایک بار کہے گا:

"خداوند زمین کے مالک میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے تیری خدائی کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھا، میں نے بابل کو نقصان نہیں پہنچایا میں نے اس کو تاراج کرنے کا حکم نہیں دیا میں نے ایساغ اِلہٰ کے رسوم فراموش نہیں کیے، میں نے اپنے ماتحتوں کے گالوں پر گھونسہ نہیں مارا، میں نے انھیں ذلیل نہیں کیا، میں نے بابل کی حفاظت کی، میں نے اس کی دیواریں نہیں توڑیں"۔

تب پروہت بادشاہ کو تسکین دیتا کہ:

"ڈرومت بعل تمہاری التجا قبول کرے گا۔ وہ تمہاری آقائی کے حدود وسیع کرے گا، وہ تمہاری بادشاہت کی شان بڑھائے گا۔ خدا تم پر برکت نازل کرے گا۔ وہ تمہارے دشمنوں کو نیست و نابود کرے گا اور تمہارے حریفوں کو نیچا دکھائے گا"۔

اس کے بعد بادشاہ کو شاہی نشان واپس کر دیے جاتے تھے۔

"پروہت بادشاہ کے گال پر زور سے تھپڑ مارے گا اور اگر بادشاہ کی آنکھوں

سے آنسو بہنے لگیں تو سمجھ لو کہ خداوند بعل اس سے خوش ہے اور اگر آنسو نہ بہیں تو سمجھ لو کہ خدا اس سے ناراض ہو گیا ہے اور دشمن چڑھائی کرنے والا ہے اور بادشاہ کو زوال نصیب ہونے والا ہے''۔

اس رسم کی غرض یہ تھی کہ بابل کے عوام کے دلوں پر اور شاہی خاندان کے دلوں پر بابلی کلیسا کی ہیبت قائم رہے اور وہ ہرگز یہ نہ بھولیں کہ مرڈک کا مندر بڑی مقدس جگہ ہے اور اس کی چوکھٹ پر بادشاہ کو بھی اپنے شاہی نشان سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور مرڈک کے پروہتوں کو اتنا اختیار حاصل ہے کہ بادشاہ کے منہ پر تھپڑ ماریں اور اس کی گوشمالی کریں۔ اس ذلّت آمیز برتاؤ کے عوض وہ بادشاہ کو خداوند مرڈک کی حمایت اور سر پرستی کا تحفہ پیش کرتے ہیں اور عوام پر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ دیکھو بادشاہ پر خداوند مرڈک کا سایہ ہے۔ بادشاہ کی مخالفت خداوند کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا خبردار بادشاہ کے خلاف بغاوت نہ کرنا اور نہ اس کی اطاعت سے منہ موڑنا۔ چند لمحوں کی ذلت کے بدلے اتنی بڑی ضمانت ہر بادشاہ خوشی خوشی برداشت کر لیتا تھا۔

اس کے بعد بادشاہ کو مندر میں داخل ہو کر جشنِ نوروز کی رسموں میں شریک ہونے کی اجازت ملتی تھی۔ اس جشن میں بادشاہ کی شرکت ضروری تھی۔ چنانچہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں جشنِ نوروز ملتوی کر دیا جاتا تھا۔

چھٹے اور ساتویں دن اُر، کوتھا، کیش، نیفر، اریک اور دوسرے قدیم شہروں کے دیوتاؤں کے بت بابل میں جلوس کی شکل میں وارد ہوتے تھے۔ کوئی خشکی کی راہ سے آتا تھا، کوئی تری کے راستے سے۔ اس اثنا میں بادشاہ مرڈک کے مندر میں بیٹھا ہوا مختلف رسوم و مناسک ادا کرتا رہتا تھا تاکہ خداوند مرڈک پاتال سے دوبارہ زمین پر واپس آ جائے۔

آٹھویں تاریخ کو مرڈک کا ظہور ہوتا تھا۔ اس دن بادشاہ مرڈک کے حجرے میں داخل ہوتا اور بت کا ہاتھ چھوتا تھا۔ تب مرڈک کا مجسمہ مندر کے صحن میں لایا جاتا۔ وہاں بادشاہ ایک ایک دیوتا کا تعارف مرڈک سے کرواتا۔ اس محفل میں سب سے پہلے ربِّ عظیم مرڈک کی افضلیت کا اعلان کیا جاتا اور تب زمزمۂ تخلیق دوبارہ گایا جاتا اور دیوتاؤں کا جلوس ترتیب دیا جاتا۔ سب سے آگے مرڈک کا زرّیں رتھ ہوتا جس میں ہیرے جواہرات لگے ہوتے تھے۔ رتھ کی

باگ بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اس کے پیچھے دوسرے دیوی دیوتا حسب مراتب رتھوں میں چلتے تھے۔ جلوس کے آگے آگے نقالوں کا ایک طائفہ داستانِ تخلیق کے مختلف واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا جاتا تھا۔ شاہراہِ جلوس لوبان اور بخور کی خوشبوؤں سے مہکتی اور پروہتوں کے بھجنوں اور نرسنگھوں کی آوازوں سے گونجتی رہتی تھی اور شاہراہ کے دونوں طرف عقیدت مندوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوتے تھے اور لوگ خداوند مرڈک کی سواری کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جاتے تھے۔ بابِ عشتار سے نکل کر یہ جلوس دریائے فرات کے کنارے پہنچتا اور ''بیت اکی تو'' میں داخل ہو جاتا تھا۔

''بیت اکی تو'' ایک باغ تھا۔ جس میں طرح طرح کے درخت اور گل بوٹے لگے تھے اور باغ کے وسط میں ایک مندر تھا۔ وہاں مرڈک اور عشتار کی شادی کی رسم ادا کی جاتی تھی اور سب دیوی دیوتا اور ان کے پروہت تین روز تک وہیں قیام کرتے تھے۔ گیارھویں تاریخ کو جلوس ایساغ اِلہٰ میں واپس آتا اور دیوتاؤں کی دوسری سبھا سجائی جاتی اور ''زمین کی تقدیر'' کا اعلان ہوتا تھا۔ اس موقعے پر نجومی اور غیب دان لوگوں کو سیلاب، گہن، خشک سالی، قحط، وبا، غرضیکہ آنے والے تمام حادثات سے خبردار کرتے تھے۔ جشن کی آخری رات بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ سارے شہر میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ لنگر جاری ہوتے تھے اور شاہی محل میں شان دار ضیافت دی جاتی تھی۔ بارھویں تاریخ کو سب دیوی دیوتا اپنے اپنے شہروں کو واپس چلے جاتے تھے اور پروہت اپنی عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جشن نوروز ختم ہو جاتا تھا۔

یہ ہے دنیا کی سب سے پہلی داستانِ تخلیق کا پس منظر۔ اس داستان کی ابتدائی شکل کیا تھی اور اس کا مصنف کون تھا اور کس عہد میں پیدا ہوا تھا، ان سوالوں کا جواب کوئی نہیں دے سکتا کیونکہ دوسری عوامی تصنیفات کی مانند یہ داستان بھی کسی ایک فرد کی قوتِ تخیل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق میں پوری قوم کی کوشش شامل ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس نظم میں وقتاً فوقتاً اضافے اور ترمیمیں ہوتی رہی ہیں۔

اس داستان کا بنیادی مقصد مرڈک یا اس سے پیش تر اِن لیل کی عظمت قائم کرنا تھا جو سردی اور سیلاب کی تباہ کن طاقتوں کے خلاف جنگ میں وادی دجلہ وفرات کے باشندوں کی

رہنمائی کرتا تھا اور تب انھیں ہر سال بہار کے موسم میں نئی زندگی عطا ہوتی تھی۔ افسانہ طرازوں نے اسی مرکزی خیال کے گرد تخلیق کی پوری داستان مرتب کر ڈالی۔ یہ داستان اپنی ساحرانہ کشش کے باعث دور دراز ملکوں میں اتنی مقبول ہوئی کہ بالآخر بعض مذہبی صحیفوں نے بھی اس کے ڈرامائی اجزا کو اپنے عقائد میں داخل کر لیا۔

زمزمہ تخلیق

جب عالمِ بالا میں آسمان کا نام نہ تھا
اور نہ عالمِ سفلی میں ٹھوس زمین کا نام پڑا تھا اس وقت
فقط تیامت (نمکین پانی) موجود نہ تھی جس نے بعد میں اُن کو جنا
اور اپسو (میٹھا پانی) جو اُن کا باپ تھا۔
اور نمکین اور میٹھے پانی کے دھارے آپس میں ملتے تھے
اس وقت نرسل کی چٹائیوں سے کوئی جھونپڑا ابھی نہیں بنا تھا
اور نہ دلدلی زمین ابھری تھی۔
کسی دیوتا کی بھی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔
اور نہ ان کے نام تھے
اور نہ ان کی تقدیریں متعیّن ہوتی تھیں
تب پانی کی تہوں میں ہیجان اٹھا
اور دیوتاؤں کی تشکیل ہوئی
سب سے پہلے لحمو (نر) اور لحامو (مادہ) ظاہر ہوئے
اور قبل اس کے کہ وہ عمر اور قامت میں بڑے ہوتے
اُن کو نام دیے گئے۔
پھر بہت دنوں کے بعد انشر (نر) اور کی شر (مادہ) کی تشکیل ہوئی۔
ان سے انو (عرش) پیدا ہوا۔ ان کا وارث اور حریف۔

اور اُنو سے ایا (زمین) اور اس کی محبوبہ دکمینہ۔
ایا بڑا دانا، قوی اور صاحبِ فہم تھا
اپنے دادا انشر سے بھی زیادہ۔
اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔
ان سے مردُک (سورج) پیدا ہوا
مردُک کے اعضا بڑے متناسب تھے
اس کی چار آنکھیں اور چار ہاتھ تھے۔
اور اس کی آنکھیں چہار جانب دیکھتی تھیں۔
اس کے چار بڑے بڑے کان تھے۔
وہ منہ کھولتا تھا تو اندر سے شعلے نکلتے تھے۔
اس کا عضوِ تناسل بہت لمبا تھا
اس کا قد سب دیوتاؤں سے اونچا تھا
وہ سب دیوتاؤں سے افضل تھا۔

الپسو اور تیامت قصرِ بحر میں رہتے تھے مگر ان نوزائیدہ دیوتاؤں کے شور و غل نے الپسو کو اتنا تنگ کیا کہ ایک دن اس نے اپنے وزیر ممو سے کہا کہ تیامت کے پاس چلیں اور اس سے شکایت کریں۔

وہ تیامت کے پاس گئے اور اس کے روبرو بیٹھ گئے اور
الپسو نے اپنا منہ کھولا اور تیامت سے کہنے لگا:
کہ مجھے ان دیوتاؤں کے طور طریقے سخت ناپسند ہیں۔
ان کی حرکتوں سے مجھے دن کو چین ملتا ہے نہ رات کو آرام۔
میں ان کو ہلاک کر دوں گا کیونکہ
میں سکون اور آرام چاہتا ہوں
تیامت نے یہ سنا تو اپنے شوہر پر بہت خفا ہوئی اور کہنے لگی کہ
کیا ہم اسے ڈھا دیں جس کو ہم نے بنایا ہے؟

مانا کہ ان کی حرکتیں بُری ہیں
لیکن ہمیں نرمی سے کام لینا چاہیے
لیکن ممّو نے تیامت کا کہنا نہ مانا بلکہ الپسو کو دیوتاؤں کے خلاف اُکسایا کہا کہ:
دیوتاؤں کے باغیانہ طریقوں کو ختم کردے۔
تب تجھے دن کو چین اور رات کو آرام نصیب ہوگا۔

لیکن بدی کی ان طاقتوں کے منصوبوں کا علم دیوتاؤں کو ہوگیا۔ تب دانائے کل اِیا نے ایسے منتر پڑھے کہ الپسو پر نیند طاری ہوگئی اور وہ غافل سوگیا۔ تب اِیا نے الپسو کا تاج اتارا۔ اس کی کمر کی پٹی کھولی۔ اس کے سر کے گرد جو حالہ تھا اس کو ہٹایا اور الپسو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے قتل کردیا اور ممّو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے قید خانے میں ڈال دیا اور جہاں الپسو قتل ہوا تھا اِیا نے وہاں ایک جھونپڑا بنایا اور اس کا نام الپسو رکھا اور اِیا اور اس کی بیوی دمکینہ وہاں آرام سے رہنے لگے۔ مرڈک اسی جگہ پیدا ہوا۔

شرپسند طاقتوں کو جب خبر ملی کہ الپسو ہلاک ہوگیا ہے اور ممّو کو بندی خانے میں ڈال دیا گیا ہے تو وہ چیختی چلاّتی تیامت کے پاس پہنچیں اور اس سے کہا کہ حیف ہو تجھ پر کہ تو نے الپسو کا ساتھ نہ دیا اور نہ ممّو کو رہا کرنے کی کوشش کی۔ تیامت نے کہا کہ آؤ ہم عفریت پیدا کریں اور ایا سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچیں اور انھوں نے دیوتاؤں کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔

تیامت نے اژدہے اور سانپ پیدا کیے
ان کے دانت بہت تیز تھے۔
اور ان کے کھیسوں میں زہر بھرا تھا۔
اور ان کے جسم میں خون کی جگہ ڈِس بھرا تھا
اژدہے چنگھاڑتے تھے اور
اور ان کی ہیبت سے دیکھنے والوں کا دم نکلا جاتا تھا
اس نے پردار دیونی پیدا کی اور شیر اور دیوانہ کتا
اور بچھو جس کا آدھا دھڑ آدمی کا تھا۔

اور ہوا میں اڑنے والا اژدہا۔
اس نے گیارہ قسم کے درندے پیدا کیے۔
اوران کو مہلک ہتھیاروں سے لیس کر دیا۔
اور کنگو کو ان کا سرغنہ بنایا اور کہا کہ
میں نے تیرے حق میں منتر پڑھا ہے۔
اور تجھے سب کا سردار مقرر کیا ہے۔
اور آج سے تو میرا شوہر ہوگا۔
اس نے تقدیر کی لوحیں کنگو کے سینے سے باندھ دیں۔
اور کہا کہ اب کوئی تیری نافرمانی نہیں کر سکے گی۔
اور تیرے حکم سے آگ کے شعلے خاموش ہو جائیں گے۔
جا اور الپسو اور ممّو کا بدلہ لے۔

جب اِیا کو معلوم ہوا کہ تیامت کی فوج قصرِ بحر میں صف آرا ہے اور اس نے دیوتاؤں سے لڑنے کی ٹھانی ہے تو وہ اپنے باپ انشر کے پاس گیا اور سارا ماجرا اس سے بیان کیا۔ انشر نے پریشانی میں اپنی ران پر ہاتھ مارا، اپنے ہونٹ کاٹے اور اِیا سے کہا کہ تو نے الپسو کو ہلاک کیا، تو نے ممّو کو قید کیا۔ اب تو ہی جا کر تیامت کو بھی ہلاک کر۔ مگر اِیا کی ہمت نے جواب دے دیا۔ وہ تیامت کا مقابلہ نہ کر سکا۔

تب انشر نے اپنے بیٹے اَنو کو طلب کیا اور کہا کہ میرے طاقت ور بیٹے جا اور تیامت سے بات کر تا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو اور اس کے دل میں رحم آئے۔ اگر وہ تیرا کہا نہ مانے تو اس سے کہہ کہ مجھے انشر نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اے تیامت تو اپنی حرکتوں سے باز آ جا۔

اَنو تیامت کی تلاش میں نکلا۔ جب وہ تیامت کے مسکن میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوف ناک اژدہا وہاں بیٹھا ہے اور اس کے منھ سے کف نکل رہا ہے اور اس کے دانت بڑے بھیانک ہیں۔ اَنو پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ اژدہے سے بات کیے بغیر واپس چلا آیا۔

تب انشر نے اِیا کے بیٹے مردُک کو بلوایا اور سارا حال اس سے بیان کیا اور کہا کہ جا تیامت

کو اس کی سرکشی کی سزا دے۔ ڈرمت کیونکہ تیامت تجھے زخمی نہ کر سکے گی البتہ تو اس کے سر کو زخمی کرے گا اور اپنے منتروں کی بدولت تو فتح یاب ہوگا۔

مرڈک نے جواب دیا کہ

اگر تو تیامت کو نیست و نابود کرنے کا کام
میرے سپرد کرنا چاہتا ہے۔
اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیامت کو سزا دوں
تا کہ دیوتاؤں کی جان بچے۔
تو دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ طلب کر
اور اعلان کر کہ مرڈک کی قسمت سب سے افضل ہے
اور آئندہ سے تیرے بجائے میرے الفاظ فیصلہ کریں گے
اور جو کچھ میں کہوں گا وہی ہوگا
اور میرے ہونٹوں کا حکم نہ واپس لیا جائے گا۔
نہ بدلا جائے گا۔

انشر نے مرڈک کی شرطیں مان لیں اور دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ طلب کی۔

دیوتا انشر کی ضیافت میں شریک ہوئے۔
انھوں نے دعوت کی روٹی کھائی اور
نلکیوں سے شراب پی
اور تیز مے، نے انھیں بدمست کر دیا۔
اور وہ چہکنے لگے۔
اور انھوں نے مرڈک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔
انھوں نے مرڈک کے لیے شاہانہ تخت نصب کیا۔
اور مرڈک کو اس پر بٹھایا
اور سب دیوتا یک آواز ہو کر بولے:

"دیوتاؤں میں تو سب سے عظیم اور صاحبِ توقیر ہے۔
تیرے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔
تو اَنو کی آواز ہے
آج سے تیرا ہر فرمان اٹل ہوگا۔
تو جسے چاہے عزت دے اور
جسے چاہے ذلت دے۔
جسے چاہے پیدا کرے اور جسے چاہے مارے۔
کوئی دیوتا تیرے کام میں دخل نہ دے گا۔
ہم نے تجھے کائنات کی بادشاہت عطا کردی ہے۔
ہمارے آقا۔ ان کی جان بخشی کر جو تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔
لیکن ان کی جان سلب کرلے جو باغی ہوگئے ہیں"۔

تب مرڈک نے کپڑے کا ایک ٹکڑا لیا اور منتر پڑھا تو کپڑا غائب ہوگیا۔ پھر دوسرا منتر پڑھا تو کپڑا واپس آ گیا اور سب دیوتا سربسجود ہوگئے اور انھوں نے ایک زبان ہو کر کہا "مرڈک ہمارا بادشاہ ہے۔"

انھوں نے مرڈک کو عصائے سلطانی، تختِ شاہی اور لباسِ فاخرہ پیش کیا اور ایسے ہتھیار دیے جس کی دشمن تاب نہ لا سکے اور انھوں نے کہا مرڈک جا اور تیامت سے زندگی چھین لے اور ہوائیں اس کا خون ایسی جگہ چھڑکیں جہاں کوئی نہ پہنچ سکے۔

مرڈک نے تیر کمان بنایا اور کندھے پر ڈالا۔ دائیں ہاتھ میں گُرز لیا اور جسم میں شعلے بھرے۔ برق اس کے جلو میں تھی۔ اس نے کندھے پر جال رکھا جو اس کے باپ اَنو کا تحفہ تھا تاکہ تیامت کو گرفتار کیا جا سکے۔

اور چاروں ہواؤں کو دنیا کے چاروں کونوں پر مامور کیا۔ بادِ شمال کو، بادِ جنوب کو، بادِ مغرب کو اور بادِ مشرق کو اور بادِ شر کو اور بادِ طوفانی کو اور بادِ صرصر کو، سات ہواؤں کو قصرِ بحر میں بھیجا کہ تیامت کے مسکن کو اتھل پتھل کر دیں اور خداوند

مرڈک سیلاب لایا اور طوفان کے ہیبت ناک رتھ پر سوار ہوا۔
رتھ میں چار گھوڑے لگے تھے: ہلاکو، بے درد، حملہ آور اور تیز رفتار۔
ان کے دانت تیز اور زہریلے تھے۔
اور مرڈک کی زبان پر مقدس کلمے تھے۔
اور اس کے ہاتھ میں زہر کے تریاق کا پودا تھا۔
اور سب دیوتا اس کے گرد و پیش صف بستہ چل رہے تھے۔
اور جب مرڈک نے تیامت کے مسکن کے اندر جھانک کر دیکھا تو تیامت
اس زور سے گرجی کہ مرڈک کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا
اور تیامت نے مرڈک کو للکار کر کہا: تیری کیا مجال ہے جو میرا مقابلہ کرے۔
میرے ساتھی تجھ سے کہیں طاقت ور ہیں
تب مرڈک بجلی کی مانند کڑک کر بولا:
تو نے کیوں سرکشی کی ہے۔ تجھے کس بات پر گھمنڈ ہے؟
تو نے اپنے دل کو پیکار پر کیوں آمادہ کیا ہے
باپ بیٹے سے منحرف ہو جاتے ہیں
لیکن تو نے اپنی اولاد کی محبت دل سے کیوں نکال دی ہے
تو نے کنگو کو اپنا خاوند کیوں بنایا ہے۔
اور اسے انو کا مرتبہ کیوں بخشا ہے حالانکہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے۔
تو دیوتاؤں کے بادشاہ انشر کا بُرا چاہتی ہے۔
تو میرے پُرکھوں سے بدی کرنے پر تل گئی ہے۔
آ اور مجھ سے لڑ
تیامت نے یہ باتیں سنیں تو وہ غصّے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس
نے زور سے نعرہ مارا اور اس کے دونوں پاؤں تھرتھر کانپنے لگے۔
وہ منتر پڑھنے لگی تا کہ مرڈک کو اپنے طلسم کے جال میں پھنسا لے

تب مرڈک نے اپنا جال کھولا اور تیامت کے منھ پر بادِ شر کے تھپیڑے مارے۔

تیامت نے اپنا منھ کھول کر مردک کو نگلنا چاہا
مگر اس کا منھ بادِ شر کے جھونکوں سے بھر گیا
اور وہ اپنا منھ بند نہ کر سکی۔
تب مرڈک نے تیر کو کمان میں جوڑا
اور تیر نے تیامت کا پیٹ چاک کر دیا۔
اور وہ گر پڑی
اور خداوند نے اس کی کھوپڑی کچل دی۔

اب مرڈک تیامت کی فوج کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے کنگو کو گرفتار کر کے اگائی (موت کے دیوتا) کے پاس بھیج دیا اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے کنگو سے لوحِ تقدیر چھین لی۔ اس پر اپنی مہر ثبت کی اور اپنے سینے سے باندھ لی۔ اس نے سیپ کی مانند تیامت کے دو ٹکڑے کر دیے۔ بالائی حصے سے اس نے آسمان بنایا اور وہاں چوکیدار مقرر کر دیے تا کہ آبِ فلک نیچے نہ گرنے پائے۔ زیریں حصے سے اس نے زمین بنائی۔ تب اس نے اَنو کا مسکن آسمان پر اور اِیا کا مسکن پانی کی گہرائیوں میں بنایا اور اِن لِیل کا مسکن ہوا میں تھا۔

اس نے دیوتاؤں کو ستاروں کے بُرج میں بٹھایا۔ اس نے سال کا تعیُّن کیا اور بارہ مہینے بنائے اور ان کو دنوں میں تقسیم کیا اور ہر دیوتا کے لیے ایک دن مقرر کیا۔

اس نے چاندی کو ضیا بخشی اور رات کو اس کے حوالے کیا اور ہر مہینے چاند کو ایک نیا تاج پہنانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ پورن ماشی کی شام کو وہ سورج کے بالمقابل کھڑا ہو۔

چھ دن تیری سنگین چمکے گی اور ساتویں دن آدھا تاج بن جائے گی اور پورے چاند کی شام کو تو سورج کے مقابلے میں نمودار ہوگا۔

اس نے اپنے تیر سے کہکشاں بنائی اور اپنے جال سے آسمان پر ستاروں کا جال بچھایا۔

تب مرڈک نے دیوتاؤں کی باتیں سنیں

اور اس نے دل میں کہا کہ میں ایک نئی چیز بناؤں گا۔
اس نے اپنا منہ کھولا اور ایا سے کہا:
میں خون پیدا کروں گا اور ہڈیاں یکجا کروں گا اور ان سے میں
ایک وحشی درندہ خلق کروں گا۔
اور اس کا نام آدمی ہوگا۔
سچ مچ میں ایک ظالم اور جاہل درندہ پیدا کروں گا۔
اور اس کا کام دیوتاؤں کی خدمت کرنا ہوگا۔
ایا نے کہا: دیوتاؤں میں سے ایک کو قربان کرتا کہ اس کے خون سے
آدمی بنے۔ دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ طلب کر اور جو گنہ گار ثابت ہو اس کو قتل کر۔
مرڈک نے دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ طلب کی۔
دیوتا مرڈک کے تخت کے سامنے جمع ہوئے۔
اس نے انون نکی کو مخاطب کر کے کہا:
سچ سچ بتا تیامت کو کس نے بغاوت پر اکسایا؟
کس نے اسے سرکشی کی ترغیب دی اور؟
جنگ پر آمادہ کیا؟
جس نے یہ سازش کی ہے میں اس کو سازش کا مزہ چکھاؤں گا
تا کہ دیوتا چین سے رہیں۔
تب دیوتاؤں کے سردار لوگل دِی مرنا کیہ نے عرض کی کہ
وہ کنگو تھا جس نے سرکشی کا منصوبہ بنایا اور
تیامت کو بغاوت پر آمادہ کیا اور جنگ میں شریک ہوا۔
تب اس نے کنگو کے ہاتھ پاؤں باندھے اور ایا کے روبرو لائے
اس کا جرم اس پر لادا اور
اس کی شہ رگ کاٹی

اور اس کے خون سے انسان بنایا۔
اور ایا نے انسان پر خدمت کا فریضہ عائد کیا۔
اور دیوتاؤں کو آزاد کر دیا
اور مرڈک نے تین سو دیوتا آسمان پر
اور تین سو دیوتا زمین پر مقرر کیے
اور دیوتاؤں نے مرڈک سے عرض کی:
خداوند تو نے ہمیں نجات دلوائی
ہم تجھ کو کیا خراج پیش کریں
ہم تیرے لیے ایک معبد بنائیں گے
جہاں تو رات کے وقت آرام کرے گا
اور جشنِ نوروز کے موقعے پر جب ہم تیری خدمت میں
حاضر ہوں گے تو تو ہمیں اپنے معبد میں پناہ دے گا
مرڈک نے یہ سنا تو اس کا چہرہ دن کی مانند دمک اٹھا۔
عظیم بابل کی عمارتوں کی مانند
اور اس نے حکم دیا کہ بابل کی عمارت اینٹوں سے بنے
اور اس کا نام "ہجرہ" ہو۔
ایک سال تک وہ اینٹیں بناتے رہے۔
اور جب دوسرا سال آیا تو انھوں نے ایساغ اِلہٰ کی چوٹی
الپسُو (آسمان) تک اونچی کر دی۔
اس کا مینار الپسُو کے برابر تھا۔
اور انھوں نے اس کے اندر مرڈک، اِن لیل اور ایا کے مَقدس بنائے
اور جب عمارت تیار ہوگئی تو خداوند مرڈک تخت پر بیٹھا۔
اور سب دیوتا حاضر ہوئے اور اس نے کہا:

یہ بابل نہ ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے۔
یہاں عیش کرو اور آرام سے رہو۔
دیوتاؤں نے ضیافت میں خوب کھایا، خوب پیا، خوب خوش ہوئے۔
اور ایساغ الہ میں رسمیں ادا کیں
تب انشر نے خداوند مرڈک کو سَر الوہی کا لقب دیا اور کہا:
ہمارا عظیم بیٹا، ہمارا انتقام لینے والا سر بلند ہو
اس کی بادشاہت بے مثال ہو۔
وہ اپنے کالے سروالی مخلوق کا گڈریا بنے۔
قیامت تک وہ اس کے راستے پر چلے
وہ اپنے پُرکھوں کو سدا کھانا کھلائے۔
اور لوبان کی خوشبو پھیلائے۔
اور جس طرح آسمان پر ہوا ہے
اسی طرح زمین پر بھی ہو۔
اس کی رعایا اپنے دیوتا کا احترام کرے
اور اپنی دیوی کا بھی
ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کو کھانے کی نذر ملتی رہے۔
ان کی کھیتی ہری بھری رہے اور
ان کے مندر سدا اسلامت رہیں
کالے سروالے دیوتاؤں کی خدمت کرتے رہیں۔
اور مرڈک کو ہم جس نام سے چاہیں پکاریں۔
وہ ہمارا آقا ہے
آؤ ہم اس کے پچاس نام گنوائیں۔

اس نظم کو غور سے پڑھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا تخلیق کی وہ داستانیں جو آج ہمارے عقیدے کا اہم جز خیال کی جاتی ہیں درحقیقت بابل کے قدیم زمزموں ہی کی آوازِ بازگشت ہیں۔

خدااور شیطان کی وہی ازلی پیکار" ظالم اور وحشی" آدم کی وہی داستانِ تخلیق، زمین کو آسمان سے جدا کرنے کا وہی قصہ اور چاند ستاروں کی پیدائش کا ذکر جو مقدس صحیفوں میں درج ہے بابل کے زمزمۂ تخلیق میں بھی ملتا ہے۔

ساتواں باب

قدیم مصریوں کا عقیدہ تخلیق

عراق کی مانند مصری تہذیب بھی بہت پرانی ہے۔ اس تہذیب کا آفتابِ اقبال تقریباً تین ہزار سال تک بڑی آب و تاب سے روشن رہا اور اس کے کارنامے ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ مگر یہ کارنامے اس وقت ہماری بحث سے خارج ہیں۔ ہم تو فقط مصریوں کے عقیدۂ تخلیق کا جائزہ لیں گے اور بتائیں گے کہ تخلیقِ کائنات کی قدیم مصری داستانوں اور اہلِ مصر کے فصلی تیوہاروں میں کیا تعلق ہے۔

مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ یہ بات یوسفؑ کے زمانے میں بھی صحیح تھی اور آج بھی صحیح ہے۔ نیل کا پانی مصریوں کے لیے آبِ بقا سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اس خطے میں بارش نہیں ہوتی اور لوگوں کی زندگی کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ وہ اسی دریا کا پانی پیتے ہیں۔ یہی دریا ان کی زمینوں کو زرخیز بناتا ہے اور آب پاشی کے لیے پانی فراہم کرتا ہے۔ ان کی نقل و حرکت کے لیے سب سے آسان ذریعہ بھی وہی ہے۔ یہ دریا اگر سوکھ جائے تو مصریوں کے لیے جینا محال ہو جائے۔ دوسرے ملکوں میں تو عام طور پر دو بڑے دریا اور کئی چھوٹی باج گزار ندیاں ہوتی ہیں لیکن مصر کا واحد دریا نیل ہے۔

یہ دریا یوگانڈا کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے اور افریقہ کے لق و دق صحرائے اعظم میں ایک آبی لکیر بناتا ہوا بحرِ روم میں گر جاتا ہے۔ مصری سرحد میں داخل ہونے پر دریائے نیل پانچ سو میل تک ایک خشک اور اونچے پلیٹو کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس علاقے میں دریا کا طاس دس بارہ میل سے زیادہ چوڑا نہیں لہٰذا وہاں کے باشندے اسی تنگ وادی میں رہنے پر مجبور ہیں۔ البتہ دریا جس وقت قاہرہ (قدیم ممفیس) کے پاس پہنچتا ہے تو پہاڑیاں دور ہٹ جاتی ہیں اور وادی بہت

کشادہ ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھ کر دریا کی کئی شاخیں بن جاتی ہیں اور دریا کا پانی ان شاخوں میں بٹ کر چار سو میل لمبے قوسی ڈیلٹا کو سیراب کرتا ہے۔ ڈیلٹا کا علاقہ دراصل اس مٹی سے بنا ہے جو دریائے نیل اپنے ساتھ بہا کر لاتا تھا۔ اس مٹی کا رنگ سیاہ ہے اور وہ جنوبی خطے کی بہ نسبت زیادہ زرخیز ہے۔ جب تک مصر میں متحد بادشاہت قائم نہیں ہوئی تھی (۳۴۰۰ ق۔م) جنوبی اور شمالی بادشاہتیں اسی ڈیلٹا کی خاطر اکثر آمادۂ جنگ رہتی تھیں۔

نیل، دجلہ و فرات کے برعکس بڑا شائستہ، قابلِ اعتبار اور نرم رو دریا ہے۔ اگست کے مہینے میں جب وسطی افریقہ کے پہاڑوں پر بارش شروع ہوتی ہے تو دریا آہستہ آہستہ چڑھنے لگتا ہے۔ بارش کا یہ پانی ۱؍ستمبر کو اسوان پہنچتا ہے اور ۱؍اکتوبر کے قریب قاہرہ، اور کیا مجال جو ان معمولات میں کوئی فرق آجائے اور اگر فرق آجائے تو ملک میں قحط پڑ جاتا ہے جس طرح حضرت یوسفؑ کے عہد میں ہوا تھا۔

سیلاب آتا ہے تو دریائے نیل کی ساحلی زمین میلوں تک پانی سے ڈھک جاتی ہے۔ دو تین مہینے کے بعد جب دریا اترتا ہے تو زمین پر اپنے پیچھے مٹی کی نہایت زرخیز ایک تہہ چھوڑ جاتا ہے۔ فلاحین اسی زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ ملک کا بقیہ ۹۷ فیصد علاقہ بے آب و گیاہ ریگستان ہے۔ چنانچہ آج بھی مصر کے ۹۹ فیصد باشندے دریا کے کنارے ہی کنارے آباد ہیں۔ مصر کے لوگ اس دریا کی فیض رسانیوں کا جتنا احسان مانیں کم ہے۔ وہ اگر ابتدا میں دریا کے بہاؤ کی سمت منھ کر کے عبادت کرتے تھے تو ہمیں حیرت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہی دریا ان کا رزّاق تھا۔

دریائے نیل کی پابندیِ اوقات کی بدولت انسان کو تقویم سازی کا ہنر ہاتھ آیا اور اہلِ مصر نے ۴۲۴۱ ق۔م میں دنیا کی پہلی جنتری بنائی۔ اس وقت وہاں کے نجومی اپنے مشاہدے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ستارۂ شعرائی یمانی (Sirius) ہر سال طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے ٹھیک اسی دن افق پر نمودار ہوتا ہے جس دن سیلاب شروع ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے سال کو ۳۶۵ دنوں اور تیس تیس دن کے بارہ مہینوں میں تقسیم کیا۔ جو پانچ دن بچ رہے ان کو جشنِ نوروز کے لیے مخصوص کر دیا۔ ستارہ شعرائے یمانی کو انھوں نے افزائش و محبت کی دیوی اِزِیس سے، دریائے نیل کے پانی کو اِزِیس کے مقتول شوہر اُزِریس کے لہو سے اور سیلاب کو اِزِیس کے آنسوؤں سے تعبیر کیا۔

مصریوں کا نیا سال ۱۹ جولائی سے شروع ہوتا تھا کہ شعرائے یمانی کا یوم طلوع وہی تھا اور اسی دن سیلاب کا آغاز ہوتا تھا۔ نئے سال کی رسموں کی تفصیلات فرعون رامیس سوئم کے معبد کی دیواروں پر اب تک موجود ہیں۔ یہ تیوہار پورے مصر میں منایا جاتا تھا۔

مصری تہذیب کے سب سے قدیم آثار وسطی خطے میں بدری، تاسا اور غرزہ کے کھنڈروں میں ملے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی بستیاں ابتدا میں اسی علاقے میں قائم ہوئیں۔ پھر جوں جوں آبادی کا دباؤ بڑھتا گیا لوگ دریائے نیل کے کنارے کنارے شمال کا رخ کرتے چلے گئے۔ ڈیلٹا کا علاقہ بہت بعد میں آباد ہوا اور وہ بھی لیبیا کی جانب سے آنے والے صحرا نوردوں سے جو کئی اعتبار سے جنوبی مصر کے باشندوں سے مختلف تھے۔

متحدہ بادشاہت سے پہلے وادیٔ نیل کا علاقہ چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ریاست کا اپنا الگ سربراہ ہوتا تھا اور اپنے اپنے دیوی دیوتا۔ ابتدا میں ان دیوتاؤں کی شکلیں جانوروں کی سی ہوتی تھیں۔ یعنی وہ ٹوٹم (Totem) ہوتے تھے۔ فریزر کے بقول ٹوٹم وہ مادّی چیزیں ہیں جن کو وحشی انسان بڑے توہمائی ادب سے دیکھتا ہے اور یہ یقین کرتا ہے کہ اس میں اور اس مخصوص شے کے درمیان ایک مخصوص دوستانہ ربط ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پرانی قوم کا ٹوٹم طاؤس ہوتا تھا، کسی کا خرگوش، کسی کا گھڑیال، کسی کا بیل، کسی کا باز، کسی کا ہرن اور کسی کا دریائی گینڈا۔ ان قوموں کی شناخت ان کے ٹوٹم ہی کے نشان سے ہوتی تھی اور یہی ٹوٹم ان کی ذات بن جاتے تھے۔ چنانچہ مغربی پنجاب کے پرانے باشندوں سے آج بھی اگر سوال کیا جائے کہ تمہاری ذات کیا ہے تو کوئی کہے گا میں ہنس ہوں، کوئی کہے گا میں سیال ہوں، اور کوئی کہے گا کہ لومڑ ہوں۔

رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں ضم ہوتی گئیں۔ یہ اتحاد اگر پُرامن طریقے پر ظہور میں آتا (مثلاً شادی بیاہ کے ذریعے) تو ریاستی دیوتاؤں کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک ریاست کا دیوتا اگر نر ہوتا اور دوسری کا مادہ اور ان کی عمریں بھی برابر ہوتیں تو ان کی شادی کر دی جاتی تھی اور وہ میاں بیوی بن جاتے تھے۔ اگر ان کی عمروں میں فرق ہوتا تو بڑی عمر کا دیوتا چھوٹی عمر کے دیوتا کا باپ بن جاتا تھا۔ اس کے برعکس اگر ایک ریاست دوسری ریاست کو بزورِ شمشیر فتح کرتی تو مقبوضہ ریاست کے دیوی دیوتا معتوب قرار دیے جاتے

تھے اور فاتح قوم انھیں نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی۔

مورخوں کا کہنا ہے کہ ۴۰۰۷ ق۔م کے قریب باز اور گدھ قوم کے لوگ بہت طاقت ور ہو گئے۔ یہ لوگ وسطی مصر میں آباد تھے اور ان کی ریاست کا صدر مقام عبیدوز تھا جو تھیبیز کے قریب واقع تھا۔ عبیدوز بہت متبرک شہر سمجھا جاتا تھا کیونکہ حوریس (باز) دیوتا کا سب سے مقدس مندر وہیں تھا۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ حوریس دراصل باز قوم کا کوئی بادشاہ یا سورما تھا جس کو بعد میں دیوتا بنادیا گیا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو عبیدوز کے بادشاہ نارمر مینیس (Narimer Menes) نے ۳۷۷۷ قبلِ مسیح میں جنوب کے سب علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے بعد شمال کا رخ کیا۔ ڈیلٹا میں اُن دِنوں بوط قوم (سانپ) کی حکومت تھی اور ان کے بادشاہ کا نام غالبًا ساتت (Satet) تھا۔ ساتت نے مینیس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور حوریس قوم کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ مینیس نے ڈیلٹا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح پہلی بار مصر میں ایک متحدہ بادشاہت قائم ہوئی۔ مینیس نے عبیدوز کو خیر باد کہا اور ممفس کے مقام پر اپنا نیا دارالسلطنت بنایا البتہ جب اس نے وفات پائی تو وصیت کے مطابق عبیدوز ہی میں دفن ہوا۔ ڈیلٹا کی تسخیر سے پہلے مینیس کے تاج پر باز کی شکل بنی ہوتی تھی۔ متحدہ سلطنت قائم ہونے پر مصری فرماں رواؤں کے تاج پر سانپ کا اضافہ ہوگیا مگر حوریس دیوتا کی افضلیت میں کمی نہیں آئی بلکہ اس کی عظمت اور شوکت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ پہلے وہ فقط جنوبی خطوں ہی کا مقامی دیوتا تھا۔ اب وہ فراعنہء مصر کی پوری سلطنت کا سب سے بڑا دیوتا سمجھا جانے لگا۔ فراعنہ کے ہر فرمان کا آغاز حوریس کے نام سے ہونے لگا اور انھوں نے حوریس کی اولاد بلکہ ''زندہ حوریس'' کا لقب اختیار کیا۔

شمالی مصر کی تسخیر وادیٔ نیل کی تاریخ کا نہایت اہم اور عہد آفریں واقعہ تھی۔ ظاہر ہے کہ باز کی قوم کو یہ کامیابی حوریس دیوتا ہی کی بدولت نصیب ہوئی تھی۔ چنانچہ حوریس کی مدح وثنا میں بکثرت بھجن، گیت اور ناٹک لکھے گئے اور اس کے کارناموں کو رہسوں اور لیلاؤں کا موضوع بنایا گیا۔ یہ ناٹک اور رہس فصلی تیوہاروں کے موقعے پر تمام ساحرانہ اور مذہبی رسموں کے ساتھ مندروں میں کھیلے جاتے تھے۔

ان ڈرامائی رسموں اور فصلی تیوہاروں کا جائزہ لینے سے پہلے مصر کے چند قدیم دیوتاؤں کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ دیوتا ان ڈراموں کے اہم کردار تھے۔ ان کے علاوہ فراعنہ کی شخصیت بھی کہ مصری عقائد کا جز تھی ان ڈراموں سے گہرا تعلق رکھتی تھی۔

اُزریس: اُزریس اور اس کی بیوی اِزیس کی داستان گزشتہ باب میں بیان کی جا چکی ہے۔ روایت کے مطابق اُزریس نے مصریوں کو نئے قسم کے اناج اور انگور سے متعارف کیا۔ ان کو شراب بنانے کا ہنر سکھایا اور مردم خوری کی رسم بند کرائی۔ حوریس کی مانند ازریس بھی غالبًا زمانہء قبلِ تاریخ میں مصریوں کا کوئی ذہین اور ہوشیار بادشاہ گزرا ہے جس نے اپنی قوم کے لیے یہ عظیم کارنامے سرانجام دیے تھے مگر رواج کے مطابق جوانی ہی میں قتل کر دیا گیا تھا تاکہ اس کے خون اور گوشت کے زمین میں مل جانے سے اناج کی فصل اچھی ہو۔

مسٹر لوفٹی اور گرانٹ ایلن نے تو یہ غیر مشروط دعویٰ کیا ہے کہ اُزریس شہر عبیدوز کا بادشاہ تھا جسے لوگوں نے ازراہِ عقدیت دیوتا بنا دیا۔ ان کی دلیلوں میں بڑا وزن ہے۔

یہ قیاس آرائی بلکہ حقیقت ہے کہ دنیا کی اکثر پرانی قومیں افزائشِ فصل کی خاطر آدمی کی قربانی کیا کرتی تھیں۔ ٹائلر اور فریزر نے اس رواج کی بکثرت مثالیں ۱۹ ویں صدی کی پس ماندہ قوموں سے پیش کی ہیں۔ فریزر لکھتا ہے کہ:

> ''تمام دنیا کی وحشی اور نیم مہذب قوموں میں انسانی قربانی کا رواج پایا جاتا ہے لوگ ان بدنصیبوں کی لاش کو کھیت میں بیج سمیت دفن کر دیتے تھے اور بسا اوقات ان کے خون کو بیجوں میں مل دیا جاتا تھا تاکہ فصل اچھی ہو۔ اس رواج کی سب سے مشہور مثال اڑیسہ کی کھونڈ قوم میں ملتی ہے۔ قربان ہونے والے آدمی کو وہ میریا کہتے ہیں۔ میریا کا منصب پانے والے کی وہ بڑی عزت کرتے ہیں اور اس کی خوب خاطر ہوتی ہے۔ قربانی کے دن لوگ ڈھول تاشے بجاتے ہوئے قربان گاہ کے سامنے جمع ہوتے ہیں۔ یہ جگہ مندر کے پاس ہی ہوتی ہے۔ وہاں منتر پڑھے جاتے ہیں اور میریا کو ذبح کر کے اس کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے جاتے ہیں تب گاؤں کا ہر مکھیا اپنے حصے کا گوشت لے کر گاؤں کی طرف بھاگتا ہے اور ٹکڑوں کو مندر کے

پروہت کے حوالے کر دیتا ہے۔ مندر کا پروہت ان کو دو حصوں میں بانٹتا ہے۔ ایک حصے کو وہ گڑھا کھود کر وہیں زمین میں دفن کر دیتا ہے اور گاؤں کا ہر مرد اس گڑھے میں مٹی ڈالتا ہے اور تب پروہت اس پر پانی چھڑکتا ہے۔ اس رسم کے بعد پروہت دوسرے حصے کو گاؤں کے ہر گھر میں تقسیم کر دیتا ہے اور ہر گھر کا سن رسیدہ آدمی اپنے ٹکڑے کو لے جا کر اپنے کھیت میں گاڑ دیتا ہے۔ سر، ہڈیوں اور انتڑیوں کو چتا میں رکھ کر جلا دیا جاتا ہے اور اس کی راکھ کھیتوں میں چھڑک دی جاتی ہے''۔

اسی قسم کا رواج آسٹریلیا، میکسیکو اور دوسرے ملکوں میں بھی موجود تھا۔ فلسطین، شام اور عرب وغیرہ میں پہلوٹھی کے بچے کی قربانی دی جاتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قربانی کے لیے بادشاہ سے زیادہ کون موزوں ہوگا کیونکہ وہ قوم کا سب سے اچھا اور مثالی انسان بلکہ دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ وہ تو مجسم زرخیزی تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ بادشاہ کو جوانی میں ہی بھینٹ چڑھایا جائے تاکہ فصلیں بھی جوان اور تندرست ہوں۔ پروفیسر مرے لکھتا ہے کہ مصر میں اسی مقدس بادشاہ کو سات یا نو سال کی حکومت کے بعد قربان کر دیا جاتا تھا۔

ابتدا میں مصری قومیں بھی اپنے بادشاہ کو جوانی ہی میں افزائشِ فصل کی خاطر قربان کر دیا کرتی تھیں۔ البتہ فراعنہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس رسم میں تھوڑی ترمیم ہوگئی اور فرعون کے بجائے اس کا نامزد کردہ نمائندہ زراعت کی بھینٹ چڑھنے لگا۔ ہوتا یوں تھا کہ قربانی کے تیوہار سے چند دن قبل فرعون تخت سے دست بردار ہو جاتا تھا اور اپنی جگہ قربان کیے جانے والے شخص کو فرعون مقرر کر دیتا تھا۔ یہ شخص تین چار روز تک برائے نام بادشاہت کرتا تھا اور جب قربانی کا وقت آتا تھا تو موت کے دیوتا انوبس (Anubis) کے مندر کا مہا پروہت گیدڑ کا چہرہ لگا کر اور گیدڑ کی کھال اوڑھ کر (گیدڑ، ملک الموت) شاہی محل میں داخل ہوتا تھا اور عارضی فرعون کو بڑے تزک و احتشام سے اپنے ہمراہ لے کر قربان گاہ واپس آ جاتا تھا۔

اس رسم کے آثار جنوبی مصر میں ۱۹ ویں صدی تک باقی رہے۔ مصر کے شمسی سال کی پہلی تاریخ کو جب کہ دریائے نیل پورے شباب پر ہوتا ہے تو ہر ضلعے میں حکومت کا نظم و نسق تین روز کے لیے بالکل معطل ہو جاتا تھا۔ (مقابلہ کیجیے بابل کے جشنِ نوروز سے) اور ہر شہر اپنا ایک

عارضی حاکم مقرر کر لیتا تھا۔ یہ عارضی حاکم نقالوں کی سی مخروطی ٹوپی اوڑھے اور سن کی داڑھی لگائے اور ہاتھ میں عصا لیے ضلع کے اعلیٰ افسر کی کوٹھی پر پہنچتا۔ ایک آدمی جلاّد اور ایک آدمی دفتری منشی کے بھیس میں اس کے ہمراہ ہوتا اور تماشائیوں کا ہجوم شور مچاتا پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ اصل افسر فرضی طور پر اختیارات سے دست بردار ہو جاتا تھا اور فرضی افسر احکام صادر کرنے لگتا۔ تین روز بعد تخریب کا راج ختم ہو جاتا تھا اور فرضی افسر کو موت کی سزا دی جاتی تھی لیکن اس کو واقعی پھانسی دینے کے بجائے اس کی ٹوپی، لباس اور داڑھی کو آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔

مصری آثار میں فراعنہ کے پہلے خاندان (۴۷۱۷۔۴۵۱۴ق۔م) کی ایک تصویر ملی ہے جس میں فرعون کے متبادل شخص کو قربان کیا جا رہا ہے مگر اس کو ذبح نہیں کیا جاتا تھا بلکہ کالے ناگ سے ڈسوایا جاتا تھا اور تب اس کے دل، پھیپھڑوں اور انتڑیوں کو کھیت میں دفن کر دیا جاتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اس میں مزید ترمیم ہوئی اور جنگی قیدیوں کو قربان کیا جانے لگا۔ مگر یہ رواج بھی ترک ہو گیا اور تب جانور قربان ہونے لگے۔

کتابِ اموات مصری دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ یہ دعائیں امرائے سلطنت کے تابوتوں پر لکھی جاتی تھیں اور دو ہزار سے ایک ہزار قبلِ مسیح تک رائج رہیں۔ اس کتاب کے مطابق انسانی قربانی کی رسم کھیتوں کی بُتائی کے آغاز کے وقت منائی جاتی تھی۔ قربانی کے فوراً بعد فرعون ہل لے کر مقدس کھیت میں اترتا تھا اور اسے جوتتا تھا اس کے بعد قربانی کا خون کھیت میں چھڑک دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینۃ الحبو کے آثار میں دیوار پر ایک منظر منقوش ہے جس میں فرعون رامیس سوئم (۱۲۰۲ق۔م) کھیت جوتتا دکھایا گیا ہے۔

اسی کتابِ اموات سے پتہ چلتا ہے کہ فراعنہ کے اٹھارویں خاندان کے عہد میں (۱۵۸۷ ق۔م۔۱۳۷۵ق۔م) انسانوں کی جگہ جانوروں کی (ہرن) قربانی ہونے لگی تھی۔

ساتت کے ساتھی غزال کے روپ میں آتے ہیں تب ان کو دیوتاؤں کے روبرو ذبح کیا جاتا ہے۔ ان کو گرایا جاتا ہے اور ان کا خون زمین پر بہنے لگتا ہے اور جتائی کی رات میں زمین ان کے خون سے تر ہو جاتی ہے۔

اُزرِیس خواہ دیوتا رہا ہو یا انسان، یہ واقعہ ہے کہ مصری رسوم میں اس کا تعلق اناج کی افزائش سے تھا۔ روایت کے مطابق ساتت نے اس کی لاش کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھیر دیے تھے۔ اور تب اس کی بیوی اِزِریس نے ان ٹکڑوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کیا تھا اور اپنے منتر کے زور سے اِزرِیس کو دوبارہ زندگی بخشی تھی۔ جس طرح اناج کے بیجوں کو زمین میں بکھیرا جاتا ہے اور وہ بظاہر موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر زمین سے پودوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

اُزرِیس کا تیوہار اکتوبر میں منایا جاتا تھا۔ مصر میں اُزرِیس کے دو نہایت متبرک معبد تھے۔ ایک بوزائرس میں جو ڈیلٹا میں واقع تھا اور دوسرا ابیدوز میں۔ زیادہ زور اُزرِیس کی موت کی رسموں پر دیا جاتا تھا اور بوزائرس میں اس کے دوبارہ جی اٹھنے پر۔

تیوہار کی رسمیں دو طرح کی ہوتی تھیں۔ ایک خالص زرعی اور دوسری ڈرامائی جس میں اُزرِیس کے قتل اور دوبارہ زندہ ہونے کے علاوہ اس کے بیٹے حورِیس اور ساتت کی جنگ اور ساتت کے قتل کے مناظر پیش کیے جاتے تھے۔

زرعی رسمیں بوائی کی رسمیں تھیں۔ حورِیس کی طلائی مگر کھوکھلی مورتی کو مٹی اور جو کے دانوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حورِیس کی چاروں اولاد کی مورتیوں کو بھی جو کے دانوں، چودہ قسم کے مصالحوں اور چودہ قسم کے قیمتی پتھروں سے بھرا جاتا تھا۔ پھر ان پانچوں مورتیوں کو پتھر کے ایک بڑے کڑھاؤ میں رکھ کر مٹی سے ڈھک دیا جاتا تھا اور جب ان میں انکھوے نکلنے لگتے تھے تو پروہت جشنِ بہار کی آمد کا اعلان کر دیتا تھا۔

کڑھاؤ کے اندر اُگنے والے پودوں کو ''اُزرِیس کا باغ'' کہتے تھے۔ اس قسم کے متعدد باغ بارھویں خاندان کے اہرام کے دروازے پر لاجون کے مقام پر ملے ہیں۔ اُزرِیس کے چھوٹے چھوٹے باغ امرائے مصر کے مقبروں سے بھی برآمد ہوئے ہیں۔ جن برتنوں میں جو کے پودے اُگائے گئے تھے ان پر اُزرِیس کی شبیہ کھدی ہوئی ہے۔ مدعا یہ تھا کہ جس طرح اُزرِیس کو دوبارہ زندگی ملی اسی طرح فوت شدہ امیر کو بھی نئی زندگی عطا ہو۔

ڈرامائی رسموں میں چھ کردار بہت اہم ہوتے تھے۔

اُزرِیس .... جسے ساتت نے قتل کیا تھا۔

اِزرِیس .... اس کی بہن اور وفادار بیوی۔
نفتیس .... اِزرِیس کی سگی بہن جس نے اُزرِیس کا ساتھ دیا
اور اُزرِیس کا سوگ منایا۔
ساتت .... بدی کا پیکر۔ اُزرِیس کا دشمن۔
حورِیس .... اُزرِیس کا جواں سال بیٹا جس نے ساتت سے باپ کا انتقام لیا۔
اَنوبیس .... گیدڑ..... موت کا دیوتا۔

یونان کے مورخ ہیروڈوٹس نے ایرانیوں کے دورِ اقتدار میں مصر کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں ان ڈرامائی رسموں کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''جس وقت سورج ڈوبنے لگتا ہے تو مجمع لاٹھی لے کر مندر کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تب دیوتا کا جلوس ایک دوسرے مقدس مقام سے روانہ ہوتا ہے۔ دیوتا ہوادار میں سوار ہوتا ہے اور ہزاروں پجاری اس کے پیچھے لاٹھیاں سنبھالے اور بھجن گاتے چلتے رہتے ہیں۔ جب جلوس مندر کے پاس پہنچتا ہے تو لوگ وہاں پہلے سے لاٹھیاں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ مزاحمت کرتے ہیں اور دیوتا کو مندر کے اندر جانے سے روکتے ہیں۔ تب دیوتا کے پجاری مخالفین پر لاٹھیوں سے حملہ کرتے ہیں اور مقابلہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ بہتوں کے سر پھوٹ جاتے ہیں''۔[۱]

ہیروڈوٹس نے مصر کا سفر اس وقت کیا تھا جب ایک غیر ملکی طاقت وہاں حکومت کر رہی تھی۔ اسے مصریوں کے جشنِ نوروز سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ یوں بھی فرعون اخناطون (۱۳۷۵۔ ۱۳۵۷ق۔م) نے اُزرِیس کی پرستش بند کر دی تھی اور اطون (سورج) کی پرستش لازمی قرار دے دی تھی۔ اس وجہ سے فراعنہ کے آخری دور میں جشنِ نوروز کی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی مگر اس سے قبل جشنِ نوروز سب سے بڑا قومی تیوہار سمجھا جاتا تھا اور ہر طبقے کے لوگ اس میں شریک ہوتے تھے۔

اس موقعے پر سچ مچ کے دو ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ حورِیس اور ساتت کی جنگ کا ڈرامہ اور تخلیقِ کائنات کا ڈرامہ جو دراصل اُزرِیس کے شجرۂ نسب کی تشریح تھا۔

حوریس اور ساتت کے رزمیہ ڈرامے میں حوریس کا پارٹ خود فرعون ادا کرتا تھا کیونکہ وہ حوریس کا اوتار خیال کیا جاتا تھا اور اِزریس کا پارٹ فرعون کی ملکہ ادا کرتی تھی اور ساتت کا پارٹ کسی موجبِ قتل قیدی کو دیا جاتا تھا۔

اس ڈرامے کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے مگر تخلیقِ کائنات کا ڈرامہ کھدائیوں میں ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے البتہ اس کے بعض اجزا دوسرے مذہبی نوشتوں میں ملے ہیں۔

رزمیہ ڈرامہ تمہید، تین ایکٹ اور اختتامیہ پر مشتمل تھا۔ ایک پروہت راوی کی حیثیت سے ڈرامے کے مختلف مناظر کی درمیانی کڑیاں ملاتا جاتا تھا اور اداکار اپنے مکالموں اور جسم کی حرکتوں سے راوی کی داستان کو حقیقت کا رنگ دیتے رہتے تھے۔ تخلیق اور تخریب کی اس جنگ میں تماشائی بھی پورا حصہ لیتے تھے اور جب فرعون قیدی کو قتل کرتا تھا تو مجمع جذبات سے بے قابو ہو کر قیدی پر ٹوٹ پڑتا تھا اور لاش کو تکّے بوٹی کر دیتا تھا۔

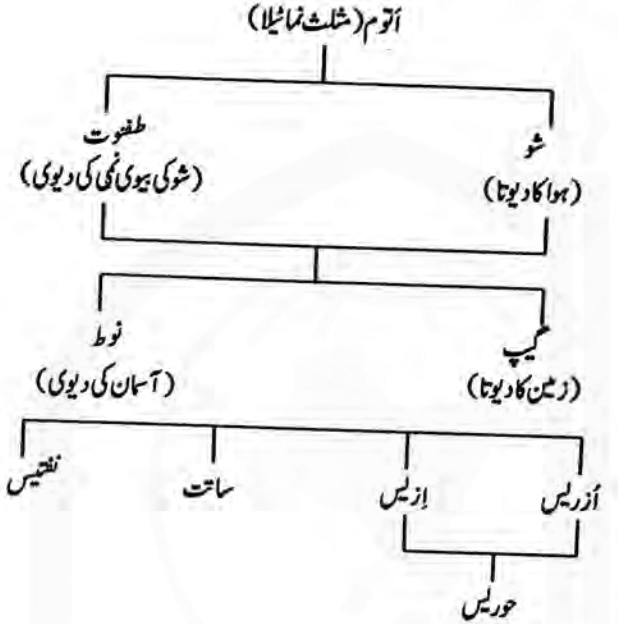
یہ ڈرامہ جشنِ نوروز کے قدیم تیوہار اور شمالی مصر کی فتح کی روایتوں پر مبنی تھا۔ شمالی مصر کی تسخیر کے کردار حوریس اور ساتت تھے جو جنوب (باز قوم) اور شمال (سانپ، دریائی گھوڑا اور گھڑیال) کی جنگ اور جنوب کی فتح کے نمائندے قرار دیے گئے۔ البتہ جشنِ نوروز کے کردار اُزریس، اِزریس اور نفتیس تھے جو افزائشِ فصل کی رسموں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں روایتوں کو جوڑنے کے لیے ان کے کرداروں میں خاندانی رشتہ قائم کرنا ضروری تھا لہٰذا حوریس کو مقتول اُزریس اور اس کی بیوی اِزریس کا بیٹا بنایا گیا تاکہ شمال پر جنوب کے حملے کی وجہِ جواز پیدا ہو جائے۔ کیونکہ بیٹے کا فرض تھا کہ دشمنوں سے بے گناہ باپ کے قتل کا انتقام لے۔ اس کے ساتھ حوریس کی اعلیٰ نسبی بھی ثابت کرنی تھی تاکہ اس کی عظمت دلوں میں بیٹھ جائے۔ اس کے لیے تخلیق کائنات کی داستان وضع کی گئی۔

تاریخِ مصر کے ابتدائی دور میں اُزریس، اِزریس، حوریس، ساتت اور انوبس کے علاوہ کسی بڑے دیوتا کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ اطون اور رع کا، نہ امون اور نوط کا اور نہ گیب، شو اور طفنوت کا۔ مظاہرِ قدرت کے یہ دیوتا دراصل زیبِ داستان کے لیے تخلیق کیے گئے تھے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں ان دیوتاؤں کے گرد داستانوں کا ایک طومار قائم ہو گیا مگر ان کو وہ عوامی مقبولیت

کبھی نصیب نہ ہوئی جو اُزریس اور حوریس کو حاصل تھی۔ لطف یہ ہے کہ ابتدائی دور میں کسی قدرتی دیوتا کا کوئی مندر بھی نہ تھا۔ رہ گیا سورج (آمون۔رع) سو وہ خالص شاہی دیوتا تھا جو فراعنہ کے پانچویں خاندان کے دور میں وجود میں آیا چنانچہ اٹھارویں خاندان (۱۵۸۷۔۱۳۷۵ ق۔م) سے پیش تر فرعون کے علاوہ کسی شخص کو سورج کی پرستش کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ سورج دیوتا کو ناپسند کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ چنانچہ شاہی نوشتوں میں تو سورج کی ثنا وصفت میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ البتہ عوامی روایتوں میں سورج کی تضحیک کی گئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں اِزلیس نے رع کو احمق بنا کر اس سے اسمِ اعظم کا راز معلوم کر لیا تھا۔ دوسری روایت میں اسے اتنا بوڑھا اور بے وقوف دکھایا گیا تھا کہ ساری دنیا اس پر ہنستی تھی۔ تیسری روایت میں تو اس کی بد دعا بھی کارگر نہیں ہوتی بلکہ تحوت (Thoth) جو علم و ہنر کا دیوتا ہے اپنی دانائی اور ہوشیاری سے رع کو ہرا دیتا ہے۔

تخلیقِ کائنات کا جو ڈرامہ نوروز کے دن مصر میں کھیلا جاتا تھا افسوس ہے کہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے ورنہ مصریوں کے عقیدۂ تخلیق کے محرکات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی۔ جو نوشتے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ تخلیق کے قصے تکوینِ کائنات کی تشریح کی غرض سے نہیں لکھے گئے بلکہ وہ کسی نہ کسی منتر کا جز تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی قصہ بھی ابتدائی دور کا نہیں ہے بلکہ سب سے قدیم قصہ فراعنہ کے چھٹے خاندان کے زمانے کا ہے (۲۷ ویں صدی قبلِ مسیح) یہ قصہ فرعون مرنے رعؔ اور فرعون نیفر کا رعؔ کے اہرام — پر کندہ شدہ منتروں کا ضمنی ٹکڑا ہے۔ ان منتروں میں اتوم (مٹی کا مثلث ٹیلا) کو مخاطب کیا گیا ہے جو ڈیلٹا کے مقدس شہر اُون (Heliopolis) کا دیوتا تھا اور (اس شہر کے آثار قاہرہ کے مضافات میں مطاریہ کے مقام پر برآمد ہوئے ہیں) درخواست کی گئی ہے کہ جس طرح تو نے دریائے نیل میں نمودار ہونے والے مثلث نما ٹیلے پر ظہور کر کے اسے دوام بخشا اسی طرح ہمارے اہرام کو بھی دوام بخش جو تیرے مقدس ٹیلے کی شبیہہ ہے۔

اس داستانِ تخلیق سے حوریس کا جو شجرہ بنتا ہے وہ یہ ہے۔



منتر کی پوری عبارت یہ ہے:

اے اَتوم! تو جو ٹیلے کی بلندی پر مقیم تھا
تو نمودار ہوا جس طرح اُون کے معبد کے مقدس پتھروں میں سے
پرند نمودار ہوتے ہیں۔
تیرے تھوک سے شو پیدا ہوا۔
تیری چھینک سے طفنوت پیدا ہوئی
تو نے ان کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔
جوکا کے بازو تھے۔
کیونکہ تیرا کا ان میں تھا
پس اے اتوم! اسی طرح بادشاہ نیفر کا رع کو بھی اپنے بازوؤں میں لے لے۔
اس کی اس عمارت کو اپنے بازوؤں میں لے لے

اس اہرام کو اپنے بازوؤں میں لے لے
آکا کے بازوؤں کی مانند
کیونکہ نیفر کا رع کا آکا اس کے اندر ہے
اور ابدیت کا آرزومند ہے
او اُتوم! تو اس بادشاہ نیفر کا رع کی حفاظت کر
اور اس اہرام کو اپنی پناہ میں رکھ
تو اس کی حفاظت کر کہ مبادا
اس کو دوام کی راہ میں کوئی ضرر پہنچے۔
جس طرح تو نے شو اور طفنوت کی حفاظت کی
او ہیلیو پولس کے عظیم دیوتاؤ!
اُتوم، شو، طفنوت، گیب، نوط، اُزریس، اِزلیس، ساتت اور نفتیس
جن کو اُتوم نے پیدا کیا!
اپنے دل کو مسرت سے کشادہ کر کے
تم کبھی اتوم سے جدا نہ ہو۔
جس طرح وہ بادشاہ نیفر کا رع کی حفاظت کرتا ہے
جس طرح وہ بادشاہ کے اہرام کی حفاظت کرتا ہے
جس طرح وہ اس عمارت کی حفاظت کرتا ہے
تمام دیوتاؤں اور مُردوں سے
جس طرح وہ بادشاہ کی حفاظت کرتا ہے کہ مبادا
دوام کی راہ میں اس کو کوئی ضرر پہنچے۔

تخلیقِ کائنات کا یہ تصور مظاہرِ قدرت کے مطالعے سے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ شاعرانہ تخیل کی خلاقی ہے ورنہ کوئی صحیح الدماغ انسان مشاہدۂ قدرت کے بعد اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ ہوا تھوک سے پیدا ہوئی ہے اور نمی چھینک سے۔ دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ اس منتر کی

رُو سے ساتت بھی ابتدا میں دیوتا تھا مگر اپنے بھائی اُزریس کو قتل کرنے کے باعث مردُود قرار پایا۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں تخلیق کا تصور سلبی ہے۔ یعنی دیوتا بھی انسانوں کی مانند نر اور مادہ کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چیز اس منتر کی ایک ملحقہ روایت سے اور واضح ہو جاتی ہے۔

اس روایت کے مطابق ابتدا میں پانی تھا تب اس پر ایک انڈا یا کنول کا پھول نمودار ہوا۔ مدت تک یہ انڈا یا پھول پانی پر تیرتا رہا تب اس میں سے انوم نکلا۔ اس کے چار اولاد ہوئی۔ شو اور طفنوت، گیب اور نوط، پھر شو اور طفنوت نے اپنے آپ کو گیب اور نوط کے اندر داخل کیا۔ گیب کو اپنے پاؤں کے نیچے داب لیا اور نوط کو اونچا کر دیا۔ اس طرح زمین اور آسمان جو ابتدا میں جُوے تھے الگ الگ ہو گئے۔ یہی گیب اور نوط اُزریس، اِزیس، ساتت اور نفتیس کے والدین تھے۔ زمین اور آسمان کے جدا ہونے کی ایک نہایت حسین اور رنگین تصویر برٹش میوزیم لندن میں نظر سے گزری۔ یہ تصویر کتاب اموات کے دوسرے مناظر کے ساتھ مصریات کے کمرے میں آویزاں ہے اور دسویں صدی قبلِ مسیح میں بنائی گئی تھی۔[۲۲]

مصر کی دوسری داستانِ تخلیق کا تعلق ممفس سے ہے۔ ممفس (Memphis) آج کل تو دریائے نیل کے دامن میں قاہرہ سے ۱۵ میل جنوب میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن اب سے چھ ہزار سال پہلے مصر کا دارالسلطنت ہونے کے باعث اس شہر کو وہی اہمیت حاصل تھی جو حمورابی کے عہد میں بابل کو حاصل تھی۔ ممفس کا قدیم دیوتا پتاح (Ptah) تھا۔ یعنی پانی سے نمودار ہونے والی زمین۔ گویا پتاح انوم ہی کا دوسرا نام ہے۔

ممفس کی داستانِ تخلیق ایک پتھر پر کندہ ملی ہے۔ اس کی تحریر گو ساتویں صدی قبل مسیح کی ہے لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ یہ داستان کم از کم ۲۷ سو برس قبلِ مسیح کی تصنیف ضرور ہے۔ اس میں حوریس کی رزمیہ داستان اور اس کے شجرۂ نصب کو ازسرِ نو ترتیب دیا گیا ہے تاکہ حوریس اور پتاح کا رشتہ قائم ہو جائے۔ البتہ اس داستان میں تخلیق کے عمل کو بڑے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا اصل داستان میں بہت بعد میں جوڑا گیا تھا۔

اس داستان کی تمہید میں حوریس کی مدح وثنا کی گئی ہے جو 'دونوں ملکوں (شمالی اور جنوبی

مصر) کو خوش حالی بخشتا ہے'' پھر شمال اور جنوب کے بادشاہ کی طولِ عمر کے لیے دعا مانگی گئی ہے اور لکھا ہے کہ ملک معظم بیٹر کارع نے اس دعا کو از سرِ نو لکھوایا۔ کیونکہ اس کے اصل نسخے کو کیڑے کھا گئے تھے۔ ''بادشاہ کو بقائے دوام نصیب ہو'' اس کے بعد حوریس اور ساتت کے درمیان نزاع کا ذکر ہے مگر اس نزاع کا نتیجہ قتل اور خون ریزی کی شکل میں نہیں نکلتا بلکہ گیب (زمین کا دیوتا) اس جھگڑے کو امن و آشتی سے طے کرا دیتا ہے۔

''نورتن خداوند پتاح کے سامنے حاضر ہوئے۔
اور اس نے حوریس اور ساتت کا جھگڑا چکایا:
اس نے ساتت کو شمال کا بادشاہ مقرر کیا
اور حوریس کو جنوب کا بادشاہ مقرر کیا۔
جہاں اس کا باپ (اُزریس) ڈوبا تھا۔
تب گیب نے ساتت سے کہا کہ اپنے ملک کو جا۔
مگر گیب کو خیال آیا کہ میں نے
ساتت کو حوریس کے برابر حصہ دے دیا ہے
پس اس نے کُل موروثی جائیداد حوریس کے حوالے کر دی۔
یعنی اپنے بیٹے کے بیٹے کے
اس طرح حوریس کو پورا ملک مل گیا۔
اور دونوں ملک متحد ہوئے۔
اور حوریس دونوں ملکوں کا بادشاہ بن گیا
اور دونوں ملکوں کا مقامِ اتصال (ممفس)
اس کا دار السلطنت قرار پایا

اس کے بعد حوریس کا شجرۂ نسب بیان ہوا ہے جس کی ابتدا پتاح تھا۔

پتاح جو عرشِ اعظم پر بیٹھا ہے
وہ نون (پانی) ہے اور اس کی بیوی نونت ہے

جس نے اتوم کو جنا۔
پتاح عظیم ہے۔ وہ نورتن کا دل اور زبان ہے۔
پتاح جس نے دیوتاؤں کو پیدا کیا

''تب دل اور زبان اتوم کے روپ میں وجود میں آئے۔ اس نے دل میں کا پھونکا اور دل سے حورلیس ''پتاح'' ہوا اور زبان سے ساتت ''پتاح'' ہوا۔ یعنی پتاح نے پہلے دل میں ارادہ کیا پھر اتوم کی تخلیق کا حکم دیا۔ اس طرح دل اور زبان کا اختیار جسم کے دوسرے تمام اعضا پر ہو گیا۔ وہ کہتے تھے کہ پتاح تمام دیوتاؤں، تمام جانوروں، تمام رینگنے والی چیزوں اور مویشیوں میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے سوچتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

تب پتاح نے اپنے دانتوں اور ہونٹوں سے
شو اور طفنوت کو پیدا کیا۔
وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں
کانوں سے سنتے ہیں۔
اور ناک سے سونگھتے ہیں
اس کی خبر دل کو پہنچاتے ہیں۔
اور دل زبان کے ذریعے اپنے
خیال کا اعلان کرتا ہے۔

'' اس طرح دیوتاؤں کی تشکیل ہوئی اور پتاح کی نورتن مکمل ہوئی۔ دراصل دل (حورلیس) نے جو کچھ سوچا اور زبان (ساتت) کو جو حکم دیا اس سے پوری کائنات کا نظام بنا۔ کس کا کی تخلیق ہوئی اور ہمسوت روحوں کا تعیُّن کیا گیا۔ وہ جو غذا اور آزوقہ ءحیات پیدا کرتی ہیں اور اس کو انصاف دیا گیا جس کا عمل پسندیدہ ہے اور اس کو بے انصافی دی گئی جس کا عمل پسندیدہ نہیں ہے اور اس کو زندگی دی گئی جو مطمئن ہے اور اس کو موت دی گئی جو گنہ گار ہے۔ اس طرح تمام کام اور پیشے بازوؤں کی قوت اور پاؤں کی حرکت اور اعضا کے منصب اس کے حکم کے مطابق مقرر ہوئے جسے دل نے سوچا اور زبان سے ظاہر کیا۔

اور جب پتاح نے تمام چیزیں خلق کر لیں تو وہ مطمئن ہو گیا اور اس نے آرام کیا"۔
اس کے بعد ممفس کا ذکر ہے۔ جہاں پتاح کے مندر میں ملک کا فاضل غلہ جمع ہوتا تھا اور

جہاں اُزریس پانی میں ڈوبا تھا۔
اِزریس اور نفتیس نے اسے ڈوبتے دیکھا۔
اور وہ بے حد دلگیر ہوئیں۔
تب حوریس نے بار بار چیخ کر انھیں حکم دیا کہ
تم اُزریس کو پکڑو اور ڈوبنے نہ دو
اور وہ اُزریس کو عین وقت پر پانی سے
نکال کر خشکی میں لائیں۔
اور وہ ابدیت کے پُر اسرار دیوتاؤں کے پُر اسرار محل
میں داخل ہو گیا۔
اس کے نقشِ قدم پر جو افق چمکتا ہے
رعؔ کے راستوں پر
وہ پتاحؔ کے درباریوں میں شامل ہو گیا
اس طرح اُزریس ملک کے شمالی حصے میں
خداوند کے محل میں پہنچا۔
اور اس کا بیٹا حوریس شمالی ملک
اور جنوبی ملک کا بادشاہ ہوا۔

مصر کی تیسری داستانِ تخلیق فراعنہ کے ۱۸ ویں خاندان (۱۵۸۷۔۱۳۷۵ ق۔م) کے دور کی ہے۔ اُن دِنوں مصر کا دارالسلطنت تھیبز (Thebes) تھا جو عبیدوز کے قریب جنوب میں واقع ہے۔ تھیبز کا بڑا دیوتا آمون رعؔ (سورج) تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ آمون رع کی کشتی دن کے وقت آسمان کے سمندر میں سے گزرتی ہے اور رات کے وقت ظلمات کے سمندر میں سے۔ ظلمات کے سمندر میں ایک مہیب اژدہا اَپوفس (Apophis) رہتا ہے جو آمون رع

کا جانی دشمن ہے لہٰذا آمون رع کے مندر میں ہر روز سورج ڈوبتے ہی اژدہے کو پسپا کرنے کی خاطر منتر پڑھے جاتے تھے اور رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ تخلیق کی یہ داستان اسی منتر کا ایک جز ہے۔ اس منتر کا عنوان تھا ''اپوفس کی پسپائی جو رع کا دشمن ہے اور اُزریس کا جو زندگی، خوش حالی اور تندرستی ہے''۔ یہ منتر ہر روز آمون رع کے مندر میں جو دونوں ملکوں کے بادشاہوں کا آقا ہے پڑھا جائے''۔

اس منتر کے ۲۶ ویں ٹکڑے کا عنوان ہے ''رع کی تخلیقات کے علم کی کتاب اور اپوفس کی ہزیمت۔ یہ الفاظ پڑھے جائیں''۔

آقائے کل نے وجود میں آنے کے بعد کہا:
میں وہ ہوں جو کھپری[۳] کی شکل میں وجود میں آیا
جب میں وجود میں آیا تو ہستی کا وجود ہوا۔
اور میرے وجود میں آنے کے بعد دوسری اشیا کا وجود آیا۔
میرے منھ سے (حکم سے) بہ کثرت چیزیں پیدا ہوئیں۔
اس سے قبل کہ آسمان کا وجود ہوتا،
اس سے قبل کہ زمین کا وجود ہوتا،
اس سے قبل کہ زمین کی چیزوں اور رینگنے والے جانوروں کا وجود ہوتا،
میں نے بعضوں کو نون (پانی) میں بے ہوشی کے عالم میں رکھا۔
اس سے قبل کہ مجھے اپنے قیام کے لیے کوئی ٹیلا ملتا۔
میں نے عالمِ تنہائی میں ہر شے کی شکل اپنے تصور میں مقرر کی
اس سے قبل کہ میں شو (ہوا) کو اپنے تھوک سے پیدا کرتا۔
اور طفنوت (نمی) کو اپنی چھینک سے پیدا کرتا۔
اس سے قبل کہ اور چیزیں وجود میں آتیں
میں نے خود اپنے دل میں منصوبہ بنایا
اور بہ کثرت ہستیوں کے پیکر ذہن میں تیار کیے

بچوں کے پیکر اور بچوں کے بچوں کے پیکر
چونکہ آمون رَع تنہا تھا اور اس کے بیوی نہ تھی اس لیے
میں وہ تھا جس نے اپنی مٹھی کے ساتھ جفتی کھائی
میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی منی نکالی۔
تب میں نے قے کی۔
اور میرے تھوک سے شُو بن گیا۔
اور میری چھینک سے طفنوت بنی
اور نون (پانی) نے ان کی پرورش کی
اور جب وہ مجھ سے دور چلے گئے۔
تو میری آنکھ نے ان کی نگہبانی کی
اپنے وجود کے وقت میں تنہا تھا۔
پھر تین دیوتا۔ نون، شُو اور طفنوت پیدا ہوئے
میں نے تمام رینگنے والی چیزیں خلق کیں
اور وہ جو نرسل کی جھاڑیوں میں رہتی ہیں (پرند)
تب شُو اور طفنوت نے گیب اور نوط کو جنم دیا
اور گیب اور نوط نے اُزریس، حوریس، ساتت اِزلیس
اور نفتیس کو اپنے جسم سے پیدا کیا۔

ان دیوتاؤں کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ اپوفس اژدہے کو ہلاک کرنے میں ان سے مدد لی جائے۔ اس لیے رع نے ان کو منتر سکھائے تھے۔ چنانچہ اژدہا ہلاک ہوا اور اس کا نام ونشان تک مٹ گیا۔

پس اے آمون رَع جس طرح تو نے
اپنے دشمن کو ہلاک اور پامال کیا ہے
اسی طرح فرعون کے ہر زندہ اور مُردہ دشمن

کو ہلاک اور پائمال کر۔

آخر میں تاکید کی گئی ہے کہ اپوفس کی شکل ہرے رنگ سے قرطاس پر بناؤ۔ اس تصویر کو ایک صندوق میں رکھو اور اس پر اپوفس کا نام لکھو، پھر صندوق کو خوب کس کر باندھو اور آگ میں ڈال دو۔ ایسا ہر روز کرو اور ساتھ ہی یہ منتر بھی پڑھتے جاؤ۔ راکھ کو بائیں پاؤں سے کچل دو اور دن میں چار بار اس پر تھوکو اور آگ پر ڈالتے وقت چار بار کہو کہ ''اے اپوفس رع نے تجھ پر فتح پائی'' اور چار بار کہو کہ ''حورلیس نے اپنے دشمن پر فتح پائی'' اور چار بار کہو ''فرعون نے اپنے دشمنوں پر فتح پائی''۔

حواشی

۱۔ ہیروڈوٹس، تاریخ، جلد دوئم، ص۔۱۳۱۔

۲۔ سورۂ انبیاء کی یہ آیت (۳۰) ملاحظہ ہو: اَوَلَمْ يَرَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔ کیا ایمان نہ لانے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان جُڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو جُدا کیا اور ہم نے پانی سے ہر جان دار شے بنائی کیا تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔

۳۔ آفتاب صبح جس کا تصوّر گوبر کے کیڑے کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ گوبر کا کیڑا زرخیزی کی علامت ہے۔

قدیم چینیوں کا عقیدہ تخلیق

چین کی قدیم تاریخ کے تین دور تسلیم کیے گئے ہیں۔ پہلا دور شانگ خاندان کی بادشاہت کا (۱۷۶۶۔۱۰۲۷ ق۔م) دوسرا دور چو خاندان کی بادشاہت کا (۱۰۲۷۔۲۲۱ ق۔م) اور تیسرا دور ہان خاندان کا (۲۰۶ ق۔م۔۲۲۰ء)۔ چو خاندان کا عہد چینی تہذیب کا سنہرا زمانہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ بیشتر کلاسیکی اور فلسفیانہ ادب اسی دور کی تخلیق ہیں۔ کنفوشیش اور لاؤزے اسی دور میں پیدا ہوئے تھے اور اسی زمانے میں پرانی تصنیفات کو یکجا کیا گیا تھا۔

چینیوں کے نزدیک تخلیق عبارت تھی ابتری وفساد (Chaos) میں نظم و ترتیب پیدا کرنے سے۔ چنانچہ تیسری صدی قبلِ مسیح کی ایک داستان کے مطابق شمالی سمندر کا بادشاہ ہُو اور جنوبی سمندر کا بادشاہ شُو وسطی سمندر کے بادشاہ ہون تون کے علاقے میں وقتاً فوقتاً آپس میں ملا کرتے تھے۔ ہُون تون بے چارہ دیکھنے، کھانے، اور سانس لینے سے معذور تھا۔ البتہ وہ بڑا مہمان نواز تھا۔ ہُو اور شُو نے اس کی خاطر داریوں سے خوش ہو کر یہ طے کیا کہ ہون تون کے سر میں سوراخ کر دیے جائیں تا کہ اس کی معذوریاں دور ہو جائیں۔ پس وہ ہون تون کے سر میں روز ایک سوراخ کرنے لگے۔ مگر ساتویں دن ہون تون جس کے لفظی معنی ابتری و فساد کے ہوتے ہیں مر گیا۔ اسی لمحے کائنات وجود میں آئی۔ یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہُو گا کہ ہُو، شُو کے مرکب کے لفظی معنی بجلی کی کڑک چمک کے ہیں۔ گویا کائنات کی تخلیق بجلی کی کڑک چمک سے ہوئی۔

تیسری صدی عیسوی کی ایک داستان کے مطابق ہون تون (فساد) ابتدا میں مرغی کے انڈے کے مانند تھا اور اس وقت زمین آسمان کا وجود نہیں ہوا تھا۔ ہُون تون کے اندر پان کو

پرورش پا رہا تھا۔ اٹھارہ ہزار برس کے بعد یہ انڈا پھوٹا اور اس کے اندر کا ہلکا اور چمکیلا حصہ آسمان اور بھاری اور تاریک حصہ زمین بن گیا۔ پھر اٹھارہ ہزار برس تک آسمان ہر روز دس فٹ اونچا ہوتا گیا اور زمین دس فٹ موٹی ہوتی گئی اور پآن کو جوان دونوں کے درمیان تھا ہر روز دس فٹ بڑھتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان ۹۰ ہزار لی (۳۰ ہزار میل) کا فاصلہ ہے۔

پآن کو کی موت پر اس کے بدن کے مختلف حصے قدرتی عناصر میں تبدیل ہو گئے۔ اس کا سر پہاڑ بن گیا۔ اس کی دائیں آنکھ سورج بن گئی اور بائیں آنکھ چاند۔ اس کی سانس ہوا اور بادل میں تبدیل ہوگئی اور آواز گرج چمک بن گئی۔ اس کے خون سے دریا اور سمندر بنے اور رگ پٹھوں نے زمین کی تہوں کی شکل اختیار کی۔ اس کے گوشت سے مٹی اور ہریالی وجود میں آئی۔ اس کے سر کے بالوں اور بھوؤں سے ستارے اور سیارے۔ اس کے دانتوں اور ہڈیوں سے دھاتیں بنیں۔ اس کا پسینہ بارش میں تبدیل ہوگیا اور اس کے بدن میں لپٹی ہوئی جونکوں سے نسلِ انسانی پیدا ہوئی۔

چینی حکمراں ان عقیدوں کو کس طرح اپنے طبقاتی مفاد اور ریاستی احکام کے لیے استعمال کرتے تھے اس کا اندازہ تخلیق کی ایک اور داستان سے ہوتا ہے۔ اس داستان کے مطابق زمین اور آسمان تو الگ ہو چکے تھے مگر ابھی انسان پیدا نہیں ہوا تھا لہٰذا نوکوا (Nukua) دیوی نے پیلی مٹی کو پیٹ پیٹ کر آدمی بنائے۔ یہ کام بڑی محنت کا تھا اور نوکوا کا سارا دن اسی میں صرف ہو جاتا تھا لہٰذا اس نے ایک رسّی لی اور اس کو کیچڑ میں بھگو دیا اور کیچڑ کے قطروں سے آدمی بنائے۔ امرا اور روٴسا تو پیلی مٹی سے بنے البتہ نچلے طبقوں کے غریب غربا کیچڑ سے۔

پرانی داستانوں میں نوکوا دیوی انسان کو تخلیق کرنے کے عمل میں کسی کو شریک نہیں کرتی بلکہ یہ کام تنہا کرتی ہے۔ البتہ بعد میں جب مادری نظام کی جگہ پدری نظام رائج ہوتا ہے تو فوہسی (Fu-Hsi) اس کا شریکِ کار بن جاتا ہے۔ بعض کہانیوں میں نوکوا کو فوہسی کی چھوٹی بہن بتایا جاتا ہے اور بعض میں اس کی بیوی۔

اور جب مادری نظام کے آثار بالکل مٹ گئے اور پدری نظام کی مکمل حاکمیت قائم ہوگئی تو تخلیق کے عمل میں سے عورت کو سرے سے خارج کر دیا گیا اور اب یہ ذمے داری پانکو نے اکیلے

سنبھال لی۔ چنانچہ ایک داستان کے مطابق پانکو زمین، آسمان، حیوانات اور نباتات کے وجود میں آنے سے مطمئن نہ تھا کیونکہ کائنات میں ایسی کوئی ہستی نہ تھی جس میں استدلال کی قوت ہو یا جو دوسری چیزوں کو ترقی دے سکتی یا استعمال میں لاسکتی تھی۔ پس پانکو مردوں اور عورتوں کے مٹی کے پُتلے بنانے لگا۔ اس میں پانکو کا پورا دن گزر گیا۔ جوں ہی یہ پُتلے خشک ہوئے ان میں ییِن (Yin) اور یانگ (Yang) کی قوت آ گئی۔

یِین اور یانگ قدیم چینی فکر میں کائنات کا حرکی اور تخلیقی اصول ہیں۔ ان کا باہمی ربط و گریز ہی موجودات میں تغیّر اور ذات وصفات میں تبدیلیوں کا باعث ہوتا ہے۔ تمام واقعات یِین و یانگ ہی کے وصل و فراق سے ظہور میں آتے ہیں۔ اس عمل میں یانگ فاعل ہوتا ہے اور یِین مفعول۔ یِین مادّہ یعنی منفی قوت ہے اور یانگ نر یعنی مثبت قوت۔ یانگ آسمان ہے جو اوپر ہے اور یِین زمین ہے جو نیچے ہے۔ اسی طرح سیاہی سفیدی، نرمی سختی، نیکی بدی، چھوٹائی بڑائی، غم اور خوشی، سزا اور جزا، اتفاق و اختلاف، ردّوقبول، محبت ونفرت، اقدام اور پسپائی، جفت و طاق سب یانگ اور یِین کے باہمی رشتوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور محال ہے۔

نواں باب

آریاؤں کا عقیدہ تخلیق

آریا قبیلے جن کا آبائی وطن دریائے وولگا اور سر دریا کے درمیان کا گیاہستانی علاقہ تھا، دو سمتوں میں پھیلے۔ جنوب میں انھوں نے ایران، افغانستان اور وادیِ سندھ کا رخ کیا اور مشرق میں یونان، دریائے ڈینوب اور دریائے رہائن کی وادیوں میں آباد ہو گئے۔

ہندی آریاؤں کی سب سے مقدس کتاب رگ وید ہے۔ رگ وید میں کل ۱۰۱۸ بھجن ہیں جو ۱۵سو قبلِ مسیح اور ایک ہزار قبلِ مسیح کے درمیان وادی سندھ میں مرتب کیے گئے تھے۔ یہ بھجن اگنی (آگ) سورج، ہوا، اِندر اور دوسرے دیوتاؤں کی تعریف میں ہیں۔

رِگ وید کی پہلی داستانِ تخلیق سومیری داستان کی مانند ایک رزمیہ کہانی ہے۔ اس داستان کی جائے وقوع وادی سندھ ہے جہاں آریاؤں کو مقامی باشندوں سے لڑنا پڑا تھا۔ ان میں ایک قوم اسورا تھی (اسورا کے لغوی معنی زندہ قوت کے ہیں) جس کے سردار کا نام وَرِتر تھا۔ وہ بڑا خطرناک راکشش اور مجسم بدی تھا۔ اس کی ماں کا نام دانو (ضبط و تحمل) تھا۔ اسورا قوم کا ایک دوسرا سردار اَدِیتا مجسم نیکی تھا وہ اَدِیتی (آزادی) کا بیٹا تھا۔ (رگ وید وَرِتر اور ادیتا کے باپ کا ذکر نہیں کرتا اس لیے کہ وادیِ سندھ میں اس وقت تک مادری نظام رائج تھا) وَرِتر اور اَدِیتا ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک بار جب ادیتا ہارنے لگا تو اس نے اِندر دیوتا (طاقت) سے فریاد کی۔ اِندر دیوتا دھرتی اور آکاش کا بیٹا تھا۔ وہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب زمین اور آسمان جڑے ہوئے تھے۔ اندر نے سوم رس پیا تھا جو دھرتی کی چھاتی سے نکلتا تھا۔ سوم رس پینے سے اس میں اتنی شکتی آ گئی تھی کہ آکاش ڈر کر دھرتی سے دور چلا گیا تھا اور زمین اور آسمان کے بیچ میں اِندر کا راج ہو گیا تھا۔

جب اُدِیتا نے اندر کی دہائی دی تو اندر نے اس شرط پر مدد کا وعدہ کیا کہ اُدِیتا اس کو اپنا آقا تسلیم کرلے گا۔ ادیتا نے اندر کی یہ شرط مان لی۔ تب اندر نے بجلی کا بھالا (وجر) لیا اور وَرِتّر سے لڑنے چل پڑا۔ وَرِتّر بڑا چالاک تھا۔ اس نے اژدہے کا روپ دھارن کرلیا۔ مگر اندر نے وَرِتّر پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس کے پیٹ سے ایک گائے نکلی جو حاملہ تھی اور اس گائے نے سورج کو جنا۔

جب ''سَتَ'' اَست (نیستی) سے پیدا ہو چکا تو آکاش کی چھت میں سورج کے لیے راستہ بنایا گیا اور پانی نے بھی آکاش کی راہ لی اور وہاں سے نمی کی پھوار زمین پر برسنے لگی اور ہر چیز کے لیے ایک رِیت مقرر ہوئی اور وُرونا اس ریت کے سنگھاسن پر بیٹھا۔ وہ اُدِیتاؤں (ست) کا مکھیا تھا اور وہ رِیت کی نگرانی کرنے لگا تاکہ کوئی اس کو توڑنے نہ پائے اور تب اندر اور دوسرے دیوتاؤں نے تخلیق کا جشن منایا اور رقص کیا اور پہلا انسان (پُروش) پیدا ہوا۔

رگ وید کی دوسری داستانِ تخلیق کا تعلق ہرنیائے گربھ (انڈے) سے ہے۔

وہی انڈا جو یونانی داستانِ تخلیق میں پانی پر تیرتا ہے۔

ابتدا میں ہرنیائے گربھ نمودار ہوا۔
وہ تمام موجودات کا واحد آقا تھا۔
اسی نے زمین کو ٹھوس اور مضبوط بنایا
اور آسمان کو قائم کیا۔
ہم کس دیوتا کو بھینٹ چڑھائیں؟
کون ہم کو سانس دیتا ہے۔ قوت دیتا ہے؟
تمام جانور کس کا حکم مانتے ہیں؟ حتیٰ کہ دیوتا بھی؟
کس کی پرچھائیں موت ہے۔ کس کا سایہ ابدی زندگی ہے؟
کون ہے جو فقط اپنی طاقت سے ان پکشوؤں کا سوامی ہوا
جو سانس لیتے ہیں، سوتے ہیں اور جاگتے ہیں۔
جو انسان اور جانور سب کا ابدی آقا ہوا۔

کون ہے جس نے آسمان کو روشن کیا اور زمین کو پائیدار بنایا
کون ہے جس نے ہوا کے وسیع و عریض خطے مقرر کیے۔
ہم کس دیوتا کی پرستش کریں۔

نرائن ایک ہزار برس تک اس انڈے پر لیٹا رہا اور یہ انڈا سمندر پر تیرتا رہا۔ تب نرائن کی ناف سے کنول کا ایک پھول نکلا جو ہزار سورجوں سے زیادہ چمکیلا تھا۔ یہ کنول اتنا بڑا تھا کہ ساری کائنات اس میں سما سکتی تھی۔ اس کنول سے برہما نکلا جو از خود پیدا ہوا تھا اور اس میں نرائن کی طاقت تھی اور اسی طاقت سے برہما نے دنیا کی تمام چیزیں پیدا کیں اور ان کو شکل اور نام دیے۔

رگ وید میں خالقِ کائنات کے کئی نام ہیں۔ وہ پرُجاپتی ہے، وِشوکرما ہے، پوروش ہے، برہما ہے۔

ابتدا میں یہ کائنات برہما تھی
اس نے دیوتاؤں کو پیدا کیا۔
ان کو پیدا کرنے کے بعد اُس نے اُن کو اِن دنیاؤں میں چڑھنے کی قوت دی۔
اگنی (آگ) کو ایک دنیا،
وَایو (ہوا) کو ہوا
سُوریہ (سورج) کو آسمان۔
تب برہما خود ان خطوں سے باہر چلا گیا۔
ماورا میں جانے کے بعد اس نے سوچا اب میں نیچے کیسے جاؤں
اور وہ رُوپ اور نام کی مدد سے نیچے آیا۔
کیا مقام تھا، کون سا اور کہاں کا اصول تھا
جس سے بینائے کل وشوکرما نے زمین کو پیدا کیا۔
اور اپنی طاقت سے آسمان کو ظاہر کیا۔
ایک خدا جس کے ہر رخ پر آنکھیں ہیں
ہر رُخ پر ایک چہرہ ہے

ہر رُخ پر ہاتھ ہیں
ہر رُخ پر پاؤں ہیں
وہ زمین اور آسمان کو پیدا کرتے وقت
انھیں اپنے ہاتھوں اور پروں سے شکل دیتا ہے۔

ایک اور جگہ پر لکھا ہے:

وشوکرما دانا ہے، طاقت ور ہے، خالق ہے
وہ ہمارا باپ ہے، ہمارا خالق ہے
وہ تمام خطوں سے آگاہ ہے اور تمام مخلوق سے بھی۔

رِگ وید کا ایک مشہور بھجن پُرش شکتا یعنی انسان کا گیت ہے۔ اس بھجن میں تخلیق کرنے والے دیوتا ہیں اور جس مسالے سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے وہ پُرش نامی ایک دیو کا جسم ہے۔ یہاں تخلیق کا عمل ایک قربانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قربانی میں پرش کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور اس کے جسم کے مختلف حصوں سے کائنات کے مختلف حصوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ سنسکرت کے عالموں کا خیال ہے کہ یہ بھجن دوسرے ویدوں کی تدوین کے بعد رگ وید میں شامل کیا گیا ہے۔ رگ وید کا یہ واحد بھجن ہے جس میں ہندوؤں کی چاروں ذاتوں کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھجن بہت اہم ہے کیونکہ اس میں ذاتوں کی تقسیم کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے لیے مذہبی جواز پیدا کیا گیا ہے۔

اس بھجن کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ وہ یہ کہ اسی سے ہندو فلسفے میں وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے عقیدے کا آغاز ہوتا ہے: پُرش یہ ساری کائنات ہے۔ جو کچھ تھا، ہے اور ہوگا"۔

پُروش اے وی دَم سروَم یتو بھُوتم یتو چہ بھَوِیَم
ا۔ پُرش کے ہزار سر تھے، ہزار آنکھیں تھیں اور ہزار پاؤں اس نے بھومی کو
ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔
اور اس کا جسم دس انگل باہر تھا۔
۲۔ پُرش یہ سب کچھ ہے، جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے۔

اور وہ ابدیت کا آقا ہے۔
جسے وہ خوراک کے ذریعے بڑھاتا ہے۔
۳۔ یہ ہے اس کی عظمت اور وہ اس سے بھی فزوں تر ہے۔
اس کی ایک چوتھائی سے تمام موجوداتِ عالم بنے ہیں
اور اس کا تین چوتھائی اَمَر ہے جو آسمان میں ہے
۴۔ اپنے تین چوتھائی سمیت وہ اونچا چلا گیا۔
اور اس کا ایک چوتھائی یہاں وجود ہو کر واپس آیا
تب وہ ہر سمت پھیل گیا اور جو کھاتا ہے اور جو نہیں کھاتا
سب کو گھیرے میں لے لیا۔
۵۔ اس سے ویرج پیدا ہوا اور ویرج سے پرُش
اور پرُش پیدا ہو کر زمین سے ماورا تک
اور اس کے آگے پیچھے تک پہنچ گیا
۶۔ جب دیوتاؤں نے یجن (قربانی) میں
پرُش کی بھینٹ چڑھائی۔
تو بسنت اس کا پگھلا ہوا مکھن تھا،
گرمی اس کا ایندھن تھی۔
اور خزاں اس کے بھینٹ کا عمل تھی۔

جب دیوتاؤں نے پرُش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے تو ان ٹکڑوں کا کیا انجام ہوا۔ اس کا منھ کیا بنا؟ اس کے دونوں بازو، دونوں رانیں اور دونوں پاؤں کیا ہوئے۔

اس کے منھ سے برہمن بنا، اس کے دونوں بازوؤں سے چھتری بنا، اس کی دونوں رانوں سے ویش بنا اور اس کے دونوں پاؤں سے شودر بنا۔ چاند اس کے دماغ سے بنا، اس کی آنکھ سے سورج پیدا ہوا۔ اس کے منھ سے اِندر اور اگنی پیدا ہوئے اور اس کی سانس سے وایو پیدا ہوا۔

یہاں یہ سوال عبث ہے کہ اِندر، اگنی اور وایو تو پرُش سے پہلے موجود تھے اور انھیں نے

پرُش کی قربانی دی تھی پھر پرُش کے منھ اور سانس سے ان دیوتاؤں کی تخلیق کیا معنی رکھتی ہے کیونکہ پرانی داستانوں میں اس قسم کا تضاد عام ہے۔

''اس کی ناف سے ہوا پیدا ہوئی۔ اس کے سر سے آکاش اور دونوں پیروں سے دھرتی پیدا ہوئی''

مگر تخلیق کی پہلی فلسفیانہ تشریح رگ وید کے دسویں منڈل میں ملتی ہے اور جو تشکیک پر ختم ہوتی ہے۔[1]

۱۔ابتدا میں نہ اَست (عدم) تھا نہ سَت (وجود) تھا۔
نہ ہوا تھی نہ آکاش تھا جو پرے ہے
کون سب کو ڈھانکے ہوئے تھا؟ کہاں اور کس کی حفاظت میں؟
کیا پانی کی اتھاہ گہرائی تھی گمبھیر؟
۲۔اس وقت نہ موت تھی نہ امر (ابدیت) تھا
نہ دن کی روشنی تھی اور نہ رات کی (چاند سورج موجود نہ تھے)
بس وہی اکیلا بلا ہوا کے سانس لیتا تھا، اپنی قوت سے۔
اس کے سوا کوئی چیز ماورا میں بھی نہ تھی۔
۳۔تاریکی تاریکی میں پوشیدہ تھی
کائنات بس پانی ہی پانی تھی
تب وہ جو موجود ہو کر خلا سے ڈھکا ہوا تھا
تپش کی طاقت کے باعث نمودار ہوا
اس سے پہلے خواہش پیدا ہوئی
خواہش جو ذہن کا پہلا بیج تھی

کون ہے جو سچ مچ واقف ہے؟ کون ہے جو یقین سے کہے
کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ یہ تخلیق کیوں کر ہوئی

کیا دیوتا اس سے پیش تر نمودار ہوئے یا بعد میں؟
پس کون جانتا ہے کہ یہ کائنات کیسے پیدا ہوئی؟

یہ کائنات کہاں سے ابھری؟
کیا اس نے اس کی بنیاد رکھی یا وہ ازخود وجود میں آئی؟
وہ جو سب سے اونچے آکاش پر ہے کائنات کا نگراں ہے
بس وہی جانتا ہے...... یا وہ بھی نہیں جانتا۔

....

ایرانیوں کا عقیدہ تخلیق

ایرانی آثار کی کھدائیوں میں اب تک ایسا کوئی نوشتہ دستیاب نہیں ہوا ہے جس سے زرتشت سے پیش تر کے ایرانی عقائدِ تخلیق پر روشنی پڑتی ہو۔ لہٰذا ہماری معلومات کا واحد ذریعہ اُوستا ہے۔ گیتوں اور دعاؤں کا یہ مجموعہ زرتشت سے منسوب ہے۔ (۵۵۳۔۶۳۰ ق۔م) اُوستا کے تین حصے ہیں (۱) یَسْنا (عبادت کے زمرے) جس کا ایک ٹکڑا گاتھا کہلاتا ہے۔ (۲) یشت جو قربانی کی دعائیں ہیں۔ (۳) وندی داد جو رسوم کا مجموعہ ہے۔ زرتشتی مذہب کی دو اور کتابیں جو ساسانی عہد میں لکھی گئیں بڑی اہم ہیں۔ اول بنداہش، جس میں زمین اور اس کے بسنے والوں کی تخلیق کا تذکرہ ہے اور دوئم زندا گاہیہ جو مذہبی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

اُوستا کے جو حصے ضائع ہونے سے بچ گئے ہیں ان میں تخلیق کی کوئی مبسوط داستان نہیں ملتی۔ بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ کائنات کا خالق اَہُور مزدا ہے۔ داستان میں ایک جگہ اَہُور مزدا سے بہت سے سوال کیے گئے ہیں:

سورج اور ستاروں کے راستے کس نے مقرر کیے؟

کون ہے جس کے حکم سے چاند بڑھتا اور گھٹتا ہے؟
کون ہے جس نے زمین کو قائم کر رکھا ہے؟
اور جو بادلوں کو نیچے گرنے سے روکتا ہے؟
کون ہے جو پانی اور پودوں کو باقی رکھتا ہے؟
کس ہنرمند صناع نے روشنیاں اور تاریکیاں بنائیں؟
خواب اور بیداری کو خلق کیا؟
کون ہے جس کی مرضی سے صبح، دوپہر اور شام موجود ہیں،
اور باشعور انسان کو اس کے فرائض یاد دلائے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے — اہُورمزدا — لیکن ساسانی دور کی پہلوی کتابوں میں تخلیق کا قصہ قدرے تفصیل سے ملتا ہے۔ مثلاً بندا ہش میں لکھا ہے کہ

ہرُمز عرش پر تھا — دانائے کل اور خیرِ کل
اور نادان اہرمن ضرر پہنچانا جس کا کام ہے
ظلمت کی گہرائیوں میں تھا۔
ان کے درمیان خلا تھا۔
ہُرمز کو اہرمن کے وجود کا علم تھا۔
اور یہ کہ وہ حملہ کرے گا اور مجھ میں ضم ہو جائے گا۔
اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اہرمن کون کون سے اور کتنے حربے استعمال کرے گا
ہرُمز نے ایسی چیز تخلیق کی جو اس کے حربے کے لیے ضروری تھی۔
تین سال تک تخلیق اسی منزل میں رہی
تخریب پسند روح کو ہرُمز کے وجود کا علم نہ تھا۔
تب وہ گہرائیوں سے نکلا اور اس سرحد پر پہنچا
جہاں سے روشنیاں نظر آتی ہیں۔
جب اس نے ہرُمز کے نور کو دیکھا تو وہ آگے بڑھا

اورثور کو ہلاک کرنے لپکا
لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہرُمز کی شجاعت اور طاقت اس سے زیادہ ہے
تو وہ ظلمت کی طرف بھاگا اور
وہاں اس نے بہت سے بھوت بنائے۔
مگر ہرُمز نے خون خرابے سے بچنے کی خاطر اہرمن سے نو ہزار برس
کے لیے صلح کر لی۔
اسی اثنا میں ہرُمز نے پہلے آسمان کو خلق کیا، اتنا روشن اور بسیط کہ
اس کے سرے ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے۔
اس کی شکل انڈے کی تھی اور وہ چمکیلی دھات سے بنا تھا۔
پھر اس نے آسمان کے مسالے سے پانی خلق کیا۔ پھر پانی سے
زمین کو خلق کیا جو گول ہے اور آسمان کے وسط میں واقع ہے۔
اور اس نے زمین کے اندر دھاتوں کو اور پہاڑوں کو پیدا کیا
جو بعد میں زمین سے نمودار ہوئے اور اونچے ہو گئے۔
اس زمین کے نیچے ہر طرف پانی ہے۔
چوتھے اس نے پودوں کو پیدا کیا
پانچویں اس نے بیل کو پیدا کیا
اور چھٹے گایومرت (کیومرث) پہلے آدمی کو پیدا کیا۔
اس نے بیل اور آدمی کو مٹی سے پیدا کیا۔
اور اس نے آسمان کی روشنی اور تازگی سے آدمیوں اور بیلوں کا تخم بنایا۔
اور کیومرث کے اور بیل کے جسموں میں ڈال دیا۔
تاکہ آدمیوں اور مویشیوں کی افزائشِ نسل ہو۔

لیکن داستان دینک کی تفسیروں میں تخلیق کا ایک اور طریقہ بیان کیا گیا ہے جو رگ وید کی پوروش روایت سے ملتا جلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہرُمز نے ایک انسان نما جسم کے ٹکرے کیے۔

سر سے آسمان بنایا، پاؤں سے زمین بنائی، اس کے آنسوؤں نے پانی خلق کیا، بالوں سے نباتات وجود میں آئے۔ دائیں ہاتھ سے بیل پیدا ہوا اور دماغ سے آگ خلق ہوئی۔

حوالہ جات

1. A.A. Macdonell, Rigveda X. 90, *Vedic Reader*, Oxford University press, 1917.

دسواں باب

کنعانیوں کا عقیدۂ تخلیق

عراق اور مصر کے درمیان ایک اور تاریخی اور مردم خیز خطہ واقع ہے۔ آج کل تو یہ خطہ شام، لبنان، اردن اور اسرائیل (فلسطین) کی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے لیکن پرانے زمانے میں اس پورے علاقے کو کنعان کہتے تھے۔ کنعان دراصل تین سو میل لمبی اور تین سو میل چوڑی ایک تپلی سی ساحلی پٹی تھی جو شمال میں انطاکیہ سے شروع ہو کر جنوب میں غازہ پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے مغرب میں بحرِ روم تھا اور مشرق میں بحرِ مردار اور دریائے اردن جو کنعان کو عرب کے ریگستان سے جدا کرتے تھے۔ کنعان میں ساحل سے ہٹ کر پہاڑوں کا ایک سلسلہ بھی شمال سے جنوب تک چلا گیا تھا۔ اردن اور دوسرے دریا انھیں پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور پہاڑوں کی بدولت کنعان میں سردیوں میں بارش بھی ہوتی ہے۔ سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے کنعان کا موسم عام طور پر معتدل رہتا ہے۔ البتہ اکتوبر اور اپریل کے درمیان وہاں سخت سردی پڑتی ہے بالخصوص شمالی علاقے میں جو سردیوں میں برف سے ڈھک جاتے ہیں اور اب کے تو بیت المقدس سے بھی شدید برف باری کی خبریں آئی ہیں۔

عہدِ قدیم میں کنعان کے تین حصے تھے۔ شمالی حصہ جو اب شام کہلاتا ہے یوگارت تہذیب کا مرکز تھا۔ اس تہذیب کے آثار بندرگاہ لتاکیہ کے قریب راس شمراء کی کھدائیوں میں ملے ہیں۔ وہاں بہت سی لوحیں بھی برآمد ہوئی ہیں جن سے اس علاقے کے لوگوں کے عقائد اور رسم ورواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تہذیب ۱۵۰۰ ق۔م میں بھی زندہ تھی۔

وسطی حصہ فونیقیا (لبنان) کا تھا۔ فونیقیا ملک کنعان کا سب سے سرسبز وشاداب علاقہ تھا۔

وہاں پہاڑی ندیوں اور چشموں کی فراوانی تھی اور زیتون، انگور، اور انجیر وہاں کے خاص پھل تھے۔

فونیقیا کے باشندے جہاز رانی کے لیے مشہور تھے اور بحرِ روم کی ساری تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ ان کی نو آبادیاں یورپ اور افریقہ کے ساحلوں پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ الجبیل (ببلوس) سعیدہ (سِرون) سور (ٹائر) اور طرابلس الشرق ان کے اہم شہر تھے۔ الجبیل روم کے مشرقی ساحل کی سب سے بڑی بندرگاہ سمجھی جاتی تھی۔

فونیقیا کے جنوب میں فلسطین تھا جو تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمالی حصہ گلیلی کہلاتا تھا جس کے بارے میں انجیل کی کتابِ استثنا میں لکھا ہے کہ "پانی کی ندیوں اور ایسے چشموں کا ملک ہے جو وادیوں اور پہاڑوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ وہ ایسا ملک ہے جہاں گیہوں اور جو اور انگور اور انجیر کے درخت اور انار ہوتے ہیں وہ ایسا ملک ہے جہاں روغن دار زیتون اور شہد بھی ہے" (باب ۸)

گلیلی کے جنوب میں سامریہ (اسرائیل) تھا اور سامریہ کے جنوب میں یہوداہ کا علاقہ تھا۔ فلسطین کا سب سے مقدس خطہ یہی تھا۔ وہیں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنی بادشاہت قائم کی تھی اور یروشلم (بیت المقدس) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ کنعان دراصل نبیوں اور رسولوں کی سرزمین ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے شہراز سے ہجرت کر کے کنعان ہی میں حیران (قریۃ العرب) کے مقام پر سکونت اختیار کی تھی اور حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کنعان کی جدائی کا داغ اٹھایا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے خدائے واحد کی شریعت کا پیغام سنایا تھا اور دانیال بنی اسیر ہو کر بابل گئے تھے اور ایوبؑ کے صبر کا امتحان لیا گیا تھا اور حضرت مسیحؑ نے قُم باذن اللہ کی آواز بلند کی تھی اور مصلوب ہوئے تھے۔ رسول مقبولؐ بھی تجارتی قافلوں کے ہمراہ کنعان ہی تشریف لے جاتے تھے اور مسلمانوں کا قبلہءاوّل بھی اسی خطے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تین بڑے مذاہب اس سرزمین کو آج تک عزیز رکھتے ہیں۔

موسوی شریف کے نفاذ سے پہلے کنعان کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا۔ یہ وہی بعل ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ:

اَتَدعُونَ بَعلاً وَّ تَذَرُونَ اَحسَنُ الخَالِقِینَ

کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر خالق کو چھوڑ دیتے ہو۔

(سورۂ یونس۔۱۲۵)

اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعل کی پرستش کا رواج عرب میں بھی موجود تھا۔ اہلِ عرب بعل کو افزائشِ فصل کا دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہ تصور باقی رہا۔ مثلاً بعل اس آراضی کو کہتے ہیں جس کو بارش یا آب پاشی کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسے زمین دوز چشمے سیراب کرتے ہوں اور جس میں سب سے اچھی کھجور کی فصل ہوتی ہو[1]

بعل کے لفظی معنی آقا و مالک کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعل پورے کنعان میں افزائشِ زرخیزی اور بارش کا دیوتا سمجھا جاتا تھا مگر بعل کسی مخصوص شہر کے دیوتا کا نام نہ تھا بلکہ ہر علاقے اور شہر کا اپنا الگ بعل ہوتا تھا۔ گویا بعل اسمِ نکرہ تھا اور سب بعلوں میں افزائشِ فصل و نسل اور بارش کی صفت مشترک تھی۔ کنعانی عقیدے اور معاشرے میں بعل کو وہی حیثیت حاصل تھی جو عراق میں مردُک اور مصر میں اِزریس اور حوریس کو حاصل تھی۔ بعل کا سالانہ تیوہار بھی عراق کے جشنِ نوروز کی مانند اپریل میں موسمِ بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس موقعے پر دوسری رسموں کے علاوہ بعل کی زندگی، موت اور جی اٹھنے کی داستان رزمیہ تمثیل کی شکل میں پیش کی جاتی تھی۔

راس شمرا کی کھدائی میں جو لوحیں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کنعان کا سب سے قدیم دیوتا ایل تھا۔ اسے ابو الایل بھی کہتے تھے۔ باب ایل (بابل) اسماعیل، ہابیل، قابیل، جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل وغیرہ میں یہی ایل بطور لاحقہ استعمال ہوا ہے۔

بعل سے پہلے تخلیق اور افزائش کی رسموں کا مرکزی کردار ایل ہی تھا۔ ایل کا تیوہار موسمِ گرما کے آغاز میں اس وقت منایا جاتا تھا جب انجیر، زیتون، اور انگور تیار ہونے لگتے تھے۔ اس موقعے پر سچ مچ کا ایک ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ یہ ڈرامہ راس شمرا کی لوحوں میں کندہ ملا ہے۔ اس میں کرداروں کے نام، اسٹیج کے لیے ہدایتیں، ڈرامے کا مقام اور مختلف مناظر کی تفصیلات درج ہیں۔ ڈرامے کے ابتدائیے میں بادشاہ، ملکہ اور امرا و عمائدینِ شہر کے موجود ہونے کا ذکر بھی ہے۔

جشنِ نوروز کے ڈرامے کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ

اب افزائش کے ساتوں شفیق اور مہربان دیوتاؤں کی آمد ہے۔
جن کا ذکر آ قا ایل ہے
انھیں کی عنایت سے سات سال تک اناج کی فراوانی رہے گی
لہٰذا جی بھر کے کھاؤ
اور ہر طرح کی شراب انگور پیو۔

مگر موت اور بدی کی طاقت ہمیشہ گھات میں لگی رہتی ہے۔ چنانچہ دیوتا کھانے پینے اور خوشیاں منانے میں مصروف ہیں کہ موت نمودار ہوتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیوگی کا نشان ہے اور دوسرے میں سوگ کا عصا ہے۔ دیوتا موت سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

تب دوسرا منظر شروع ہوتا ہے جس میں دو لڑکیاں سمندر کے کنارے آگ میں نمودار ہوتی ہیں اور ایل دیوتا کی طرف بڑھتی ہیں۔ دیوتا اور تماشائیوں دونوں کے لیے یہ بڑا نازک وقت ہے کیونکہ ایل بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کی قوتِ تخلیق مشکوک ہے۔ اب اگر ایل ان لڑکیوں سے مباشرت نہ کر سکا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس سال فصل اچھی نہ ہوگی۔ ایل دونوں لڑکیوں کو اپنے جھونپڑے میں لے جاتا ہے۔ البتہ اپنے عصا کو جو اس کے عضوِ تناسل کی علامت ہے دروازے پر رکھ دیتا ہے۔ اب ڈراما اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے کیونکہ ایل عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اگر عورتیں ''میرے شوہر، میرے شوہر'' کہہ کر چیخیں
اور کہیں ''یہ تیرا عصا نیچے کی طرف جھک گیا ہے
تیرا عصا اندر گر گیا ہے''
تب عورتیں ایل کی بیویاں سمجھی جائیں گی
لیکن عورتیں اگر ''میرے باپ، میرے باپ'' کہہ کہہ کر چیخیں
اور کہیں کہ تیرا'' عصا نیچے کی طرف جھک گیا ہے
تیرا عصا گر گیا ہے''

تب وہ ایل کی بیٹیاں سمجھی جائیں گی
مگر ایل مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
وہ جھک کر عورتوں کے ہونٹ چومتا ہے
اور ان کے ہونٹ انار کی مانند میٹھے ہیں۔
اور ایل کے پیار سے عورتیں حاملہ ہو جاتی ہیں۔
اس کی آغوش میں آنے سے عورتوں کے نطفہ ٹھہر جاتا ہے۔
اور وہ سحر اور شام کو جنتی ہیں۔

سحر اور شام افزائشِ فصل کے دیوتا نہ تھے۔ اس کے باوجود کنعانیوں نے ان کو افزائش کے دوسرے دیوتاؤں پر فوقیت کیوں دی۔ ہماری محدود معلومات اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ مگر ڈرامہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایل ان عورتوں سے دوبارہ مباشرت کرتا ہے۔ اور اب کے ان کے بطن سے سات دیو پیکر پیدا ہوتے ہیں

جن کا ایک ہونٹ زمین پر ہے
اور دوسرا ہونٹ آسمان پر ہے
پس ان کے منہ میں آسمان کے پرندے اڑتے ہیں۔
اور سمندر کی مچھلیاں تیرتی ہیں

راس شمرا کی کھدائی میں جو لوحیں ملی ہیں ان سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ تاریخ کے کس دور میں ایلؔ کی جگہ بعلؔ افزائش اور بارش کا دیوتا بن گیا۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ جس طرح وادیِ دجلہ اور فرات میں انو کو مرڈک کے حق میں خدائی سے دستبردار ہونا پڑا تھا اسی طرح کنعان میں ایل کو بعل کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی ہوگی۔ مگر نہ انو نے ہنسی خوشی خدائی کو خیر باد کہا اور نہ ایل نے۔

کنعانی دیو مالا میں ایلؔ کی بیوی کا نام عاشطرہ (سومیری عِشتار) تھا۔ عاشطرہ کے بطن سے ایل کی تین اولادیں ہوئیں۔ بعلؔ، موتؔ اور اناث۔ ایلؔ کا چہیتا بیٹا موت تھا۔ ایلؔ اور موتؔ دونوں بعلؔ سے سخت نفرت کرتے تھے۔ البتہ اناث اپنے بھائی بعل کو بہت چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بعلؔ سے شادی بھی کرلی (پرانے زمانے میں سگے بھائی بہن آپس میں شادی کر سکتے تھے)۔

بعل کو اپنی عظمت اور بزرگی منوانے کے لیے افسانوی سورماؤں کی مانند مہمیں سر کرنی پڑیں۔ اس کا پہلا مقابلہ یَم سے ہوا جو سمندر کا دیوتا تھا۔ بعل اور یَم کے معرکے اُس رزمیہ تمثیل میں موجود ہیں جو جشنِ نو روز کے موقعے پر کنعان میں کھیلی جاتی تھی۔ اس تمثیل کی ابتدا دیوتاؤں کی ضیافت سے ہوتی ہے۔ ایل اپنے شاہی تخت پر بیٹھا ہے اور دیوتا اس کے گرد جمع ہیں کہ یَم کے ایلچی دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ دیوتا ایلچی کو دیکھتے ہی بھانپ جاتے ہیں کہ وہ کس ارادے سے آئے ہیں۔

دیوتاؤں نے جوں ہی ایلچیوں کو دیکھا
توانھوں نے اپنے سر گھٹنوں پر رکھ لیے
حتیٰ کہ تخت پر بیٹھنے والے نے بھی۔
لیکن بعل نے انھیں ڈانٹا:
دیوتاؤ! تم نے اپنے سر گھٹنوں پر کیوں رکھ لیے؟
یَم کے ایلچی جو لوحیں لے کر آئے ہیں
پہلے ان کو پڑھ تو لو۔
پس اے دیوتاؤ! اپنے سر اونچے کرو۔
اور میں یَم کے ایلچیوں کو جواب دوں گا۔

بعل کی للکار کام آتی ہے اور دیوتا اپنا سر اٹھا لیتے ہیں۔

یَم کے ایلچی بڑے گستاخ ہیں۔ وہ ایل کو نہ سلام کرتے ہیں اور نہ سجدہ بلکہ ایل سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بعل کو گرفتار کر کے ہمارے حوالے کردو۔

تمہارا آقا اور مالک یَم تم کو حکم دیتا ہے کہ
اُس کو ہمارے حوالے کردو۔
جس کو تم نے پناہ دی ہے
بعل اور اس کے ساتھیوں کو ہمارے حوالے کردو
تا کہ ہم اس کے طلائی خزانے کے وارث بن جائیں۔

دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ کسی دیوتا کی ہمت نہیں ہوتی کہ منہ سے کچھ بولے۔ تب ایل کہتا ہے کہ:

او! یم۔ بعل تیرا غلام ہے
بعل ہمیشہ کے لیے تیرا غلام ہے
وہ دیوتاؤں کی مانند تیری خدمت میں
خراج لے کر حاضر ہوگا
وہ پاک بیٹوں کی مانند تیرے حضور میں
نذرانہ پیش کرے گا۔

بعل اپنے بوڑھے باپ کی بزدلی پر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور تلوار لے کر ایلچیوں پر جھپٹتا ہے۔ مگر اس کی بیوی اناث اور اس کی ماں عشطرہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں اور سمجھاتی ہیں کہ قاصدوں پر حملہ کرنا بری بات ہے۔

بعل ایلچیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا ہے اور فریقین میں لڑائی کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ کوثر نامی ایک مصری صناع بعل کو دو نہایت وزنی گرز بنا کر دیتا ہے اور پیش گوئی کرتا ہے کہ:

تو اپنے دشمنوں کو ہلاک کرے گا۔
اور تجھے ابدی بادشاہت نصیب ہوگی

بالآخر بعل اور یم کا مقابلہ ہوتا ہے اور بعل اپنے دشمن پر فتح پاتا ہے۔

بعل کا گرز اس طرح لپکا
جس طرح باز شکار پر جھپٹتا ہے۔
اس نے یم کے ماتھے پر ضرب لگائی
یم کی آنکھوں کے درمیانی حصے پر
اور سمندر زمین کے قدموں پر گر پڑا۔

سمندر کو زیر کرنے کے بعد بعل دریائی اژدہے (لوتان) سانپ اور جنگل کے خون خوار

درندوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس مہم میں اناث بھی برابر شریک رہی اور اس نے بعل کے دشمنوں کو چن چن کر ہلاک کیا مگر بعل کا سب سے بڑا حریف موت تھا اور وہ اتنا طاقت ور تھا کہ خود بعل بھی اس سے ڈرتا تھا۔

ایک روز بعل اپنے نئے محل میں بیٹھا عیش و عشرت میں مصروف تھا کہ موت کا پیام پہنچا کہ تم اپنی بادشاہت میرے سپرد کر دو کیونکہ

میں وہ ہوں جو دیوتاؤں پر حکومت کرتا ہوں
اور دیوتا انسان سب میرے تابع ہیں۔
میں زمین کی سب چیزوں پر حاوی ہوں۔

بعل بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ موت سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے دو قاصد موت کے پاس بھیجے جو ظلمات میں رہتا تھا۔

قاصدوں نے موت کے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ:

ہمارا آقا بعل جو عظیم سپاہی ہے
جو بادلوں پر سواری کرتا ہے
تجھے سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے
کہ میں تیرا غلام ہوں
تیرا ابدی غلام۔

موت بعل کی اس بے چون و چرا اطاعت پر بہت خوش ہوتا ہے۔

موت کی اطاعت خود موت ہے چنانچہ دونوں قاصد ایل کے پاس جاتے ہیں اور اسے بعل کے مرنے کی خبر سناتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ بعل کے مرنے سے ساری دنیا خشک، بنجر اور بے آب و گیاہ ہوگئی ہے۔ گو ایل بعل کو پسند نہیں کرتا مگر وہ کائنات کی تباہی بھی نہیں دیکھ سکتا۔

وہ اپنے تخت سے نیچے اترتا ہے
وہ پاانداز پر بیٹھ جاتا ہے
اور وہاں سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے

اور اپنے سر پر سوگ کی راکھ ڈالتا ہے

اور اپنے بالوں میں دھول بھرتا ہے۔

اور جب اناث کو اپنے شوہر کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو وہ بعل کی لاش ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ جب شمس دیوی کی مدد سے اسے بعل کی لاش مل جاتی ہے تو وہ اپنے گھر لاتی ہے اور بڑی شان و شوکت سے دفن کر دیتی ہے مگر اسے یہ خلش برابر ستاتی رہتی ہے کہ میرے شوہر کو کس نے مارا۔ ایک دن اس کی مڈبھیر موت سے ہو جاتی ہے اور جب وہ موت سے بعل کے قاتل کا نام پوچھتی ہے تو موت کہتا ہے کہ میں نے بعل کو ہلاک کیا۔

یہ سن کر تند خو اناث آگ بگولا ہو جاتی ہے اور

وہ موت دیوتا کو پکڑ لیتی ہے

تلوار سے اس کا سر قلم کرتی ہے

پنکھے سے وہ اسے پھٹکتی ہے

چکی میں وہ اسے پیستی ہے۔

آگ میں وہ اسے جلاتی ہے۔

اور کھیت میں وہ اسے بوتی ہے۔

گویا موت کوئی اناج ہے۔ بظاہر داستان کا یہ تضاد ہے کیونکہ افزائش فصل کا دیوتا تو بعل تھا اور یہ سارے زرعی عمل اس کے ساتھ ہونے چاہییں۔ لیکن چونکہ موت نے بعل کو ہضم کر لیا ہے لہٰذا اب وہ بعل کا نمائندہ بھی ہے۔

موت کے کھیت میں بونے کے معنی یہ ہوئے کہ اب بعل کے جی اٹھنے کا وقت قریب آ گیا ہے چنانچہ داستان میں ایل ایک روز خواب دیکھتا ہے کہ بعل زندہ ہے۔

خدائے رحیم اور خالقِ کائنات نے خواب دیکھا کہ

آسمان سے تیل کی بارش ہو رہی ہے

اور وادیوں میں شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔

اور خدائے رحیم خوش ہو کر

پہلے پائنداز پر، پھر تخت پر بیٹھا۔
اور اس نے ہنس کر کہا
اب مجھے آرام کرنے دو۔
کیونکہ بعل زندہ ہے
کیونکہ زمین کا آقا بعل زندہ ہے۔

تب شمس دیوی دوبارہ بعل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ وہ بعل کو پا لیتی ہے مگر اس حال میں کہ بعل نے موت کو زمین پر گرا دیا ہے (بہار کی آمد آمد ہے) لیکن موت کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا۔

موت بھی مضبوط ہے، بعل بھی مضبوط ہے
وہ جنگلی سانڈوں کی مانند ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں۔
وہ سانپ کی مانند ایک دوسرے کو ڈستے ہیں۔
وہ دوڑنے والوں کی مانند ایک دوسرے کو ٹھوکر مارتے ہیں۔

شمس دیوی بیچ بچاؤ کرتی ہے اور موت کو خداوند ایل کے قہر و غضب سے ڈراتی ہے۔ موت ڈر کر چلا جاتا ہے اور بعل دوبارہ زندہ سلامت کنعان واپس آ جاتا ہے۔

کنعان کے ان ناٹکوں کی رمزیت کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ اہلِ کنعان کی نظر میں بعل تخلیق اور افزائش کا پیکر تھا۔ اس کے برعکس یم (سمندر) اور موت تخریب کے پیکر تھے۔ ان کا تجربہ بتاتا تھا کہ سمندری طوفان لہلہاتے کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ یوں بھی جہاز رانوں کی اس قوم کو دن رات سمندر کی خوف ناک موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ انھیں اسباب کی بنا پر اہلِ کنعان سمندر کو اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔ رہی موت سو وہ ایسی حقیقت تھی جس سے انکار ممکن نہ تھا۔ درخت، سبزے، پھل پھول، مویشی، انسان سب کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا تھا۔ لہٰذا بعل اور موت کی جنگ مردُک اور تیامت کی جنگ کی مانند تخلیق اور تخریب کی طاقتوں کی جنگ تھی۔ ہر سال خزاں کے موسم میں موت زندگی پر غالب آ جاتی تھی مگر ہر سال موسمِ بہار کی آمد پر بعل دوبارہ زندہ ہو جاتا تھا۔ بعل کا زندہ ہو جانا دراصل

آمدِ بہار کی علامت بن گیا تھا۔ تخلیق اور تخریب کا یہ تصادم ابدی تھا۔

حوالہ جات

۱۔ فلپ کے حتی، تاریخ عرب، ص ۹۷ اور نولد کے۔ انسائیکلوپیڈیا مذہب واخلاق۔

گیارھواں باب

عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدۂ تخلیق

اب سے تین سَوا تین ہزار سال پیش تر دنیا کی دو بڑی قوموں آریہ اور یہودی کو تلاشِ معاش کی خاطر اپنا آبائی وطن ترک کرنا پڑا۔ آریہ قبیلے وسطی ایشیا کی چراگاہوں سے نکلے اور بلقان، ترکی، ایران اور دریائے سندھ کی وادی میں پھیل گئے۔ یہودی قبیلے عراق اور مصر سے نکلے اور کنعان کے زرخیز علاقے پر قابض ہو گئے۔

یہودی تاریخ میں ہمیں تین بڑی ہجرتوں کا سراغ ملتا ہے۔ پہلی ہجرت حضرت ابراہیمؑ کی تھی جنہوں نے پروفیسر ہک کے دعوے کے مطابق اٹھارھویں صدی قبلِ مسیح میں عراق سے ہجرت کی اور اپنے قبیلے سمیت حُران کے قریب آباد ہوئے۔ وادیٔ دجلہ و فرات میں اُن دنوں بڑی سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی اس لیے بہت ممکن ہے کہ ابراہیمی قبیلے کی دیکھا دیکھی دوسرے سامی قبیلوں نے بھی کنعان کا رخ کیا ہو کیونکہ سترھویں صدی اور پندرھویں صدی قبلِ مسیح کی پیکانی لوحوں میں پہلی دفعہ ''حبیرو'' قوموں کی نقلِ مکانی کا تذکرہ بار بار آیا ہے یہی لوگ اوّلین عبرانی تھے۔

دوسری ہجرت آرامی قبیلوں کی تھی جو خالص بدوی اور صحرا نشین تھے۔ ان کے رہنما حضرت یعقوبؑ تھے جن کو اسرائیل بھی کہتے ہیں۔ انھوں نے سیکم (سامریہ) کے گرد و نواح میں اپنی بستیاں بنائیں۔

آباد کاروں کا تیسرا ریلا تیرھویں صدی قبلِ مسیح میں جنوب کی سمت سے آیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے ہجرت کی تھی۔

کنعان میں آباد ہونے والے یہ مہاجرین پیشے کے اعتبار سے گلّہ بان تھے۔ وہ بھیڑ

بکریاں پالتے تھے اور خیموں میں رہتے تھے۔ نہ ان کو زراعت سے کوئی سروکار تھا اور نہ وہ شہری زندگی کے آداب سے آگاہ تھے۔ انھوں نے کنعان کے ''پُر رونق شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ مردوں عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے قتل کیا اور کنعانیوں کو اپنا غلام بنالیا۔ ان کی خونچکاں داستانوں سے کتابِ مقدس (پرانا عہد نامہ) کے صفحات لالہ زار ہیں۔

''قومیں (یہودیوں کے خروج کی خبر سے) سن کر تھرا گئی ہیں اور فلسطین کے باشندوں کی جان پر آبنی ہے۔ اَدوم کے رئیس حیران ہیں اور موآب کے پہلوانوں کو کپکپی لگ گئی ہے۔ کنعانیوں کے دل پگھلے جاتے ہیں۔ خوف و ہراس ان پر طاری ہے۔ تیرے بازو کی عظمت کے سبب وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت ہیں''۔

(کتابِ خروج باب ۱۵)

کنعان کی ایک چھوٹی سی قوم پر حملے کی داستان بڑے فخر سے یوں بیان کی جاتی ہے:

''انھوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کیا اور انھوں نے ان مقتولوں کے سوا عوّی اور رقم اور صور اور حور اور ربع کو بھی جو مدیان کے پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا اور بعود کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے چوپائے اور بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کی سکونت گاہوں کے سب شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کی سب چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا اور انھوں نے سارا مالِ غنیمت اور سب کو اسیر کیا۔ کیا انسان اور کیا حیوان، ساتھ لیے اور اپنی لشکر گاہ میں لے آئے جو دریائے اردن کے کنارے موآب کے میدانوں میں تھی''۔

(گنتی ب ۳۱)

یہودیوں سے پیش تر بھی کنعان کو بسا اوقات اپنی زرخیزی کی سزا ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ کبھی بابل اور اشور کی فوجیں کنعان پر حملہ کرتیں اور کبھی مصر کی فوجیں۔ کنعان کبھی مصر کے حلقہء اثر میں ہوتا اور کبھی بابل کے۔ اسی وجہ سے کنعان میں کبھی مضبوط مرکزی ریاست قائم نہ

ہو سکی۔ کیونکہ نہ فراعنہء مصر اس بات کو برداشت کر سکتے اور نہ سلاطینِ بابل اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ کنعان میں کوئی ایسی حکومت بنے جو ان سے ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اسی وجہ سے کنعان ابتدا ہی سے چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بٹا رہا۔ یہ بادشاہتیں مصر یا بابل کی باج گزار ہوتی تھیں۔ البتہ جب مصر یا بابل کا مرکز کمزور ہو جاتا تو یہ بادشاہتیں خراج دینا بند کر دیتیں۔

کنعان پر غلبہ پانے کے بعد یہودیوں نے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں بنالیں۔ جو بادشاہتیں مصر سے قریب تھیں وہ مصر کو اور جو ریاستیں بابل کے قریب تھیں وہ بابل کو خراج ادا کرنے لگیں۔ یہودیوں کے بادشاہ ان کے سیاسی سربراہ ہونے کے علاوہ ان کے مذہبی پیشوا بھی ہوتے تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ کنعانیوں کی رسموں اور ریتوں کو اپنا لیا۔ ایل، بعل اور دوسرے کنعانی دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے اور کنعانی معاشرے کا جز بن گئے۔

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں، حتیوں اور اموریوں...... کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے"۔

(قضاۃ باب ۳)

"اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عشتارات کی پرستش کرنے لگے"۔

(قضاۃ باب ۲)

جس طرح مسلمان اللہ کے نام کو بطور لاحقہ استعمال کرتے ہیں (عبداللہ، عنایت اللہ وغیرہ) اسی طرح یہودیوں نے ایل اور بعل کو اپنے ناموں کا جز بنالیا۔ (مثلاً یرو بعل اور اسماعیل) البتہ انھوں نے اپنے آبائی رب یہوا کو ترک نہیں کیا۔ اس دیوتا کو وہ ریگستانوں سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہوا ہی کی بدولت ان کو کنعانیوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ یہی یہوا کئی سو سال گزرنے کے بعد یہودیوں کا خدائے واحد قرار پایا (آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے کے کسی نوشتے میں یہوا کا ذکر نہیں ملتا)۔

مگر یہوا کی ذات بھی کنعانی معاشرے کی وجہ سے نہ بچ سکی۔ چنانچہ یہودیوں نے اپنے ریگستانی دیوتا کو بہت جلد کنعان کی افزائشِ فصل کے دیوتا کا منصب دے دیا۔ بعل کی مانند یہوا بھی

آسمان سے پانی برسانے لگا۔ بادل اور بجلی کی گرج چمک بعل کی مانند یہوا سے منسوب کر دی گئی اور وہ بھی بعل کی طرح پانی میں اژدھوں کے سر کچلنے اور لویاتان کے ٹکڑے کرنے لگا (زبور۔ ۷۴) یہ لویاتان دراصل کنعانیوں کا اژدہا لوتان ہے جس کو بعل نے ہلاک کیا تھا۔

یہودیوں نے اپنے قربانی کے تیوہار کو بھی کنعانیوں کے موسمِ بہار کے فصلی تیوہار سے ملا دیا اور اس تیوہار کی تاریخ وہی رکھی جس دن کنعانی، بعل کا تیوہار مناتے تھے۔ یعنی ۳۱ مارچ۔ قربانی کے تیوہار میں وہ فرعون کی غلامی سے نجات دلانے والے یہوا کے لیے حلوان کا ذبیحہ پیش کرتے تھے۔ اس تیوہار کو وہ Pesach کہتے تھے۔ مگر اس دن وہ جو کی روٹی کا تیوہار Massoth بھی مناتے تھے جو کنعانیوں کا افزائشِ فصل کا تیوہار تھا۔ اس ملے جُلے تیوہار کے موقعے پر وہ اپنے ہیکلوں میں زبور کے زمزمے گاتے تھے۔

یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ اس تیوہار کے موقعے پر یہودی اپنے خدا یہوا کی فتوحات کو ڈرامائی رنگ میں پیش کرتے تھے یا نہیں۔ البتہ تاریخ شاہد ہے کہ جب ستر سال کی اسیری کے بعد یہودیوں کے سردار اور کاہن ۵۱۶ ق۔م میں بابل سے رہا ہو کر یروشلم واپس آئے تو انھوں نے مردُک کے ڈرامے کی نقل میں یہوا کی تخلیقات کو بھی ڈرامائی رسموں کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمثیل روشن شاہ (جشنِ ناقوس) کے موقع پر کھیلی جاتی تھی۔ یہ تیوہار سات دن تک منایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے عہد نامے میں تخلیقِ کائنات کی جو روایت اسیری کے بعد کی ہے اس میں تخلیق کا عمل چھ دن تک جاری رہتا ہے اور ساتویں دن یہوا آرام کرتا ہے۔ ساتویں دن حضرت سلیمانؑ کے ہیکل سے یہوا کا تخت جلوس کی شکل میں نکلتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ تخلیق سے متعلق دوسرے قصے بھی مثلاً شیطان کا خدا کی نافرمانی کرنا، آدم و حوا کا باغِ عدن میں شجرِ ممنوعہ چکھنا اور پھر جنت سے نکالا جانا بھی تمثیل کے جز ہوں کیونکہ ان قصوں کے ڈرامائی امکانات سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

تخلیقِ کائنات سے متعلق پرانے عہد نامے میں دو روایتیں درج ہیں۔ ایک بابل کی اسیری سے پہلے کی ہے (۸ ویں صدی ق۔م) اور دوسری اسیری کے بعد کی۔ ہم یہاں دونوں روایتیں پہلو بہ پہلو پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔

اسیری سے قبل

ابتدا میں کائنات بے آب و گیاہ ویرانہ تھی یہوا نے زمین اور آسمان کو بنایا۔
یہوا نے زمین کی مٹی سے انسان کو گڑھا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔
پھر مشرق کی طرف باغِ عدن بنایا اس میں ہر قسم کے درخت تھے۔ حتیٰ کہ شجرِ حیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی۔ بیچ میں ایک دریا تھا جو باغ سے نکل کر چار حصوں میں بٹ جاتا تھا جن کے نام جیحوں، دجلہ، فرات اور فسیون تھے۔ پھر سب چرند و پرند پیدا کیے (کسی دریائی جانور کا ذکر نہیں) اور آدم نے ان کے نام رکھے۔ پھر حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا۔
(کتابِ پیدائش باب ۲)

اسیری کے بعد

ابتدا میں کائنات ایک پرُ آب ویرانہ تھی تب یہوا نے چھ دن میں مندرجہ ذیل چیزیں یکے بعد دیگرے بنائیں اور ساتویں دن آرام کیا۔
۱۔ روشنی
۲۔ آسمان یا فضا
۳۔ زمین اور نباتات
۴۔ سورج، چاند اور ستارے
۵۔ چرند اور پرند اور دریائی جانور
۶۔ جانوروں کے جوڑے اور انسان
۷۔ خدا نے ساتویں دن آرام کیا۔
(کتابِ پیدائش باب ۱)

ان دونوں روایتوں میں پہلا فرق کائنات کی ابتدائی شکل کا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ دونوں راوی کائنات کی ابتدا کو تسلیم کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یہ بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ کائنات عدم سے وجود میں کیسے آئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد تکوین و آفرینش کا فلسفہ بیان کرنا نہیں تھا بلکہ یہ بتانا تھا کہ ابتدا میں کائنات میں انتشار، پراگندگی اور بدنظمی تھی اور اس صورتِ حال کی اصلاح یہوا نے کی۔ مگر اسیری سے پہلے کی داستان کے مطابق کائنات ابتدا میں بے آب و گیاہ ویرانہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ان یہودیوں کے لیے جو ہزاروں برس سے بے آب و گیاہ ریگستانوں میں رہنے کے عادی تھے ساری کائنات کو بے آب و گیاہ ویرانہ تصور کرنا قدرتی امر تھا لیکن جن نسلوں نے پہلے کنعان میں اور پھر بابل کی اسیری کے

زمانے میں عراق میں عمریں گزاری ہوں ان کے تاثرات یقیناً مختلف ہوں گے کیونکہ بابل اور اس کے جنوب میں تو ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ یہی سبب ہے کہ اسیری کے بعد کی داستان میں بابل کی داستانِ تخلیق کی مانند کائنات کی ابتدا پانی سے ہوتی ہے۔

اسیری کے بعد کی داستان میں تخلیق کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ غالباً پارسی مذہب سے ماخوذ ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکیم زرتشت کے پیرو کوروش اعظم (وفات ۵۲۹ ق۔م) نے یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلوائی اور ان کو بہت سا سونا چاندی دے کر یروشلم بھیجا تاکہ وہ اپنا ہیکل دوبارہ تعمیر کریں (چنانچہ پرانے عہد نامے میں کوروش کی بہت تعریف کی گئی ہے) تو ہمارا یہ گمان قوی ہوجاتا ہے کہ یہودیوں نے پارسیوں کے عقائد سے متاثر ہوکر اپنی داستانِ تخلیق کو اَوستا کے رنگ میں ڈھالا ہوگا۔

مثلاً اَوستا کی کتاب یشنا میں ایک مقام پر تخلیق کا تذکرہ استفہام اقراری کے طور پر یوں ہوتا ہے:

سورج اور ستاروں کے راستے کس نے مقرر کیے۔
کون ہے جس کے حکم سے چاند بڑھتا گھٹتا ہے؟
کون ہے جس نے زمین کو قائم کر رکھا ہے؟
اور جو بادلوں کو نیچے گرنے سے روکتا ہے؟
کون ہے جو پانی اور پودوں کو باقی رکھتا ہے؟
کس ہنرمند نے روشنیاں اور تاریکیاں بنائیں؟
خواب اور بیداری کو خلق کیا؟
کون ہے جس کی مرضی سے صبح و شام موجود ہیں؟
اور باشعور انسان کو اس کے فرائض یاد دلاتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب ایک ہی ہے کہ اہُورمزدا نے جو عرش پر ہے یہ کارنامے سر انجام دیے۔ ایک اور جگہ بنداہش میں لکھا ہے کہ

اہُورمزدا نے پہلے آسمان خلق کیا۔

پھر اس نے آسمان کے مسالے سے پانی خلق کیا۔
پھر پانی سے زمین۳ بنائی جو گول ہے۔
اس نے زمین کے اندر دھاتوں اور پہاڑوں کو پیدا کیا۔
چوتھے۴ اس نے پودوں کو پیدا کیا۔
پانچویں۵ اس نے بیل کو پیدا کیا
اور چھٹے۶ گایومرت (کیومرث) پہلے آدمی کو پیدا کیا۔
اس نے بیل اور آدمی کو مٹی سے پیدا کیا۔

یہودیوں نے پارسیوں کے خدا اہورمزدا کی ان چھ تخلیقات کو چھ دن میں تقسیم کر دیا اور انھیں اپنے خدا یہوا سے منسوب کر دیا۔

انجیل کی داستان میں جنت کا جو نقشہ ہے اس کے ماخذ کے بارے میں تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ اس میں عراق کے دریاؤں کا ذکر ہے۔ خود لفظ عدن عکادی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چراگاہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح شجرِ حیات اور شجرِ ممنوعہ بھی بابل ہی کی قدیم داستانوں کے پودے ہیں۔ ان پر ہم گل گامش کی داستان بیان کرتے وقت تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

مگر سب سے دلچسپ تخلیق آدم اور حوا کی ہے۔ عبرانی زبان میں آدم کے لفظی معنی مٹی کے ہوتے ہیں اور ان کی تخلیق کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ کمھار کے چاک پر برتن بنانے کے ہم معنی ہے۔ یعنی جس طرح کمھار چاک پر گیلی مٹی کے برتن بناتا ہے اسی طرح یہوا نے آدم کو بنایا۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ خنوم Kanum دیوتا نے انسان کو کمھار کے چاک پر بنایا۔ چنانچہ لکسر کے مقام پر ایسے دیواری نقش ہیں جن میں خنوم دیوتا کمھار کے چاک پر انسان کا پتلا بنا رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مصر سے نکلتے وقت یہودی یہ عقیدہ اپنے ساتھ لائے ہوں۔

حوا، عبرانی زبان میں زندگی کو کہتے ہیں۔ حیٔ اور حیات اسی خاندان کے الفاظ ہیں۔ عورت کو حیات سے تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ قدیم یہودی ذہن بھی عورت کو زندگی کا سرچشمہ

تصور کرتا تھا حالانکہ یہودیوں کا معاشرہ خالص اَبوی معاشرہ تھا جس میں عورت کی حیثیت ثانوی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کرنے کا خیال کہاں سے آیا۔ اس کے لیے ہمیں نن ہورسگ کی سومیری داستان کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس داستان میں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مادرِ کائنات آٹھ قسم کے پودے پیدا کرتی ہے مگر پانی کا دیوتا اِنکی ان پودوں کو کھا جاتا ہے۔ اس پر نن ہورسگ اِنکی کو سراپ دیتی ہے اور اس کے آٹھ اعضا کو روگ لگ جاتا ہے۔ تب دیوتا، مادرِ کائنات سے درخواست کرتے ہیں کہ تو اِنکی کو معاف کردے۔ چنانچہ وہ آٹھ دیویاں پیدا کرتی ہے۔ ہر بیمار عضو کو اچھا کرنے کی ایک دیوی۔ اِنکی کے بیمار حصوں میں ایک حصہ پسلیوں کا بھی تھا۔ اس کو اچھا کرنے کے لیے جو دیوی پیدا کی گئی اس کا نام نن تی (Ninti) تھا۔ نن تی کے لفظی معنی ''پسلی کی خاتون'' کے ہوتے ہیں لیکن سومیری زبان میں تی حیات کو بھی کہتے ہیں لہٰذا نن تی کا مفہوم ''حیات کی خاتون'' بھی ہوسکتا ہے۔

یہی نن تی یہودی عقیدے میں داخل ہوکر حوا بن گئی اور اس کو آدم کی پسلی سے خلق کیا گیا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے حوا کا تصور سومیری اور عکادی روایتوں سے لیا ہے۔

عیسائیوں نے پرانے عہد نامے کی روایتوں کو اپنالیا۔ البتہ ان میں حضرت مسیحؑ سے متعلق دو روایتوں کا اضافہ کردیا۔ ایک کنواری مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور دوسری حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہوکر جی اٹھنا اور آسمان پر چلا جانا۔ لیکن یہ دونوں روایتیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

بارھواں باب

مسلمانوں کا عقیدہ تخلیق

اسلام کے عقیدۂ تخلیق سے ہر کلمہ گو تھوڑا بہت ضرور واقف ہے۔ جن لوگوں نے قرآن اور احادیث کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کو تو تفصیلات کا بھی علم ہوگا مگر اس مسئلے پر غور کرنے سے پہلے عربوں کے عہدِ جاہلیت کے عقائد کا مختصر سا جائزہ بے محل نہ ہوگا۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کا جزیرہ نما متعدد چھوٹے بڑے قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ اونٹ اور بھیڑ بکری ان کے مویشی تھے۔ وہ ان مویشیوں کو لے کر پانی اور چارے کی تلاش میں عرب کے جلتے تپتے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے اور جہاں کہیں کوئی نخلستان نظر آ جاتا تھا پڑاؤ ڈال دیتے تھے۔ مویشیوں کا گوشت، دودھ، پنیر اور کھجور ان کی غذا تھی۔ وہ اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے اور انھیں بالوں سے اپنے لیے پوشاک تیار کرتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی جفاکشی کی زندگی تھی مگر اپنی شاعری، شہ سواری اور شمشیر زنی سے انھوں نے اس بے کیف و رنگ زندگی کو بھی خوش گوار بنا لیا تھا۔ شجاعت اور مہمان نوازی ان بادیہ نشینوں کے تابناک جوہر تھے۔

یوں تو حجاز میں عربوں کی کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں موجود تھیں لیکن قابلِ ذکر فقط دو ہی تھیں۔ شمال میں مدینہ اور جنوب میں مکّہ، مکّے کے قریب طائف کی بستی بھی تھی لیکن طائف دراصل امرائے مکّہ کی تفریح گاہ تھا۔ یہ جگہ سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ وہاں پانی کی بھی فراوانی ہے اس لیے طائف کا نخلستان بہت سرسبز و شاداب رہتا تھا۔

مکّہ اور مدینہ (قدیم نام یثرب) اس اہم تجارتی راستے پر واقع تھے جو یمن سے شام کو جاتا تھا۔

عرب کے بدوی اور حذری باشندوں کا معاشرہ قبائلی جمہوریت کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھا لیکن شہروں میں تجارت پیشہ لوگوں ہی کا اثر و اقتدار قائم تھا۔

حجاز میں مکے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ شہر وہاں کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ مکے میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا جسے سوق العکاز کہتے تھے۔ شہر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہاں خانہ کعبہ واقع تھا۔ یہ جگہ عربوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ تھی جہاں وہ ذی الحج کے مہینے میں حج کی رسم منانے جمع ہوتے تھے۔ حرم کے پاسبان زائرین سے حج کا محصول وصول کیا کرتے تھے۔ اسی باعث کعبے کی پاسبانی کے لیے مکے والوں میں اکثر رسّہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ عبدِ مناف اور ان کے بیٹے ہاشم کی دولت و ثروت کا ایک سبب حرم کی پاسبانی کا عہدہ بھی تھا اور جب ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب نے چاہِ زمزم کو جو مدت سے ریت کے نیچے دبا پڑا تھا کھود نکالا تو بنی ہاشم کا اثر اور بڑھ گیا۔ ا مکے کا سب سے بڑا اور طاقت ور قبیلہ قریش کا تھا۔ چنانچہ شہر کا نظم و نسق اسی قبیلے کے ہاتھ میں تھا۔

حجاز میں عقائد کے اعتبار سے پانچ قسم کے لوگ آباد تھے۔ اوّل مشرکین جو اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو بھی مانتے تھے اور ان کے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ دوسرے کُفّار جو اللہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے قبائلی یا خاندانی دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتے تھے۔ تیسرے یہودی جو حجاز کے قدیم باشندے نہ تھے بلکہ سلطنتِ روما نے جب فلسطین پر قبضہ کیا تھا تو وہاں سے بھاگ کر حجاز میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ یمن اور شام کے تجارتی راستے پر واقع چھوٹے چھوٹے نخلستانوں میں رہتے تھے۔ ان کا پیشہ زراعت تھا۔ انھوں نے عربوں کی زبان اختیار کر لی تھی مگر وہ عربوں سے الگ تھلگ رہتے تھے وہ اپنی مقدس کتابیں بھی ہمراہ لائے تھے اور اہلِ کتاب ہونے پر فخر کرتے تھے۔ یہودی اپنے خدائے واحد یہواہ کی عبادت کرتے تھے اور عام عربوں کو جو صنم پرست تھے بہت حقیر سمجھتے تھے۔ یثرب پر یہودیوں ہی کا غلبہ تھا چنانچہ ان کے دو قبیلے اوس اور خزرج وہاں بڑے بااثر تھے۔

چوتھا گروہ نصاریٰ کا تھا مگر ان کی آبادی بہت کم تھی اور ان کے اکثر رہنما علائق دنیاوی سے دور صحراؤں اور غاروں میں راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

پانچواں گروہ وہ تھا جسے اہلِ مکہ حنیف کہتے تھے۔ یہ لوگ فقط اللہ کی عبادت کرتے تھے اور مکّے کے دوسرے خداؤں کو نہ مانتے تھے۔ امیہ ابنِ ابی السلط جو آنحضرتؐ کے ماموں زاد بھائی

ہوتے تھے اور ورقہ بن نوفل جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے حنیف ہی تھے۔۲

مکہ بلکہ پورے حجاز میں غالب اکثریت مشرکین کی تھی۔ وہ بہ کثرت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا معبود اللہ تھا۔

الاؤلی، اُم الجمال، صفا اور یمن کے آثارِ قدیمہ میں ایسے پتھر برآمد ہوئے ہیں جن پر اللہ کا نام کندہ ہے۔ ان میں بعض پتھر پانچویں صدی قبل مسیح کے ہیں اور بعض رسول مقبولؐ کی ولادت سے پانچ سو سال قبل کے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب میں اللہ کی عبادت کا رواج بہت مدت سے تھا۔

مفسرین میں لفظ اللہ کے مخرج و معنی کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن بیضاوی (وفات ۱۲۸۶ء) کا خیال ہے کہ اللہ دراصل اَل اِلہٰ ہی کا اختصار ہے جو ابتدا میں اسمِ نکرہ کے طور پر مستعمل تھا لیکن بعد میں اسمِ معرفہ بن گیا۔ قرآن نے بھی اِلہٰ کی اصطلاح عام خداؤں کے معنی میں استعمال کی ہے اور اسے اسمِ معرفہ بناتے وقت 'واحد' کا اضافہ کر دیا ہے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِىْ بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (سورۂ انعام۔۱۹)	کیا تم سچ مچ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں۔ تو کہہ میں گواہی نہیں دیتا۔ تو کہہ وہی ہے معبود ایک اور بیشک میں تمہارے شرک سے بے زار ہوں۔

اِلہٰ تمام سامی قوموں میں خدا کا نام تھا۔ عکادی اور کنعانی زبانوں میں اسے ایل کہتے تھے چنانچہ کنعانی نوشتوں میں اِل El کو بار بار ''تمام مخلوقات کا خالق'' کہا گیا ہے (Anet 143) یہودیوں کے مذہب میں وہ اِلوہم قرار پایا اور عربوں نے اسے اِلہٰ اور اللہ کہہ کر پکارا۔

قرآن میں اہلِ مکہ کی اللہ پرستی کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً سورۂ یونس میں لکھا ہے کہ وہ خطرے کے وقت اللہ سے دعا مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر تو ہمیں آندھی اور طوفانوں سے نجات دلوائے گا تو ہم تیرا شکر ادا کریں گے۔

هُوَالَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَ هُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِم دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ
(سورۂ یونس۔ ۲۲)

وہی ہے جو چلاتا ہے تم کو بیچ جنگل کے اور دریا کے یہاں تک کہ جب ہوتے ہو کشتی میں اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ (ان کی) رفتار سے خوش ہوتے ہیں۔ اس حالت میں دفعتاً ان پر ایک جھونکا ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (بڑے) آ گھرے۔ اس وقت سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں کہ (اے اللہ) اگر تو ہم کو اس مصیبت سے بچالے تو بیشک ہم ہوں گے شکر کرنے والوں سے۔

وَ اِذَ غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُ اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا یَجْحَد بِاٰیٰتِنَا اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ
(سورۂ لقمان۔ ۳۲)

اور جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب (اللہ) ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو بعضے تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری نشانیوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں۔

لیکن اہلِ مکہ اللہ کو خدائے واحد نہیں مانتے تھے بلکہ وہ اللہ کے علاوہ دوسرے خداؤں کی بھی پرستش کرتے تھے۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ
(سورۂ رعد۔ ۱۶)

کیا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انھوں نے (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسے خدا پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کو پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا۔ کہہ اللہ ہی ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست۔

اہلِ مکہ اللہ کی سخت قسمیں بھی کھاتے تھے (سورۂ انعام۔ ۱۱۰) اور اس کو نذریں اور قربانیاں

بھی پیش کرتے تھے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَاقُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَايُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (سورۂ انعام ۱۰۹)

اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تاکید سے کہ اگر ہم کو ایک نشانی پہنچے تو ہم ضروری اس پر ایمان لے آویں گے۔ کہہ دے (اے رسول) کہ نشانیاں فقط اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اس کی کیا خبر ہے کہ وہ نشان جس وقت آجاویں گے یہ لوگ جب بھی ایمان نہ لاویں گے۔

مگر اللہ کی قسمیں کھانے، قربانیاں پیش کرنے اور عبادت کے باوجود یہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسرے خداؤں کو بھی مانتے تھے اور جب اللہ کا رسولؐ ان کو شرک سے منع کرتا تھا تو اس کو جواب دیتے تھے کہ اللہ نے تو ہمیں دوسرے خداؤں کی عبادت سے نہیں منع کیا ہے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ.
(سورۂ انعام۔۱۴۹)

یہ مشرک یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ کہہ دے اے رسول کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو۔ تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم لوگ بالکل اٹکل سے باتیں بناتے ہو۔

مشرکین کے عقیدے کے مطابق اللہ کی تین بیٹیاں تھیں۔ الات، عزّہ اور منات۔ لات سورج کی دیوی تھی۔ اس کا بت طائف میں تھا۔ عزّہ دراصل اناث، عشتار اور ناہید ہے۔ قریش اور بنی کنانہ نے اس کا بت نخلہ میں نصب کر رکھا تھا جو مکّے کی ایک مضافاتی بستی تھی۔ منات مکّے اور یثرب کے درمیانی اور ساحلی علاقے کی دیوی تھی لیکن قریش کا نہایت بزرگ معبود ہبل تھا۔ اس کا بت کعبے کے اندر کنوئیں کے پاس نصب تھا۔

عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تو تخلیقِ کائنات کی ایک مکمل داستان موجود

تھی لیکن آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں اب تک ایسا کوئی نوشتہ نہیں ملا ہے جس سے قریش یا دوسرے قبیلوں کے عقائدِ تخلیق کا حال معلوم ہو سکے۔ پروفیسر جتی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اللہ ہی کو ہر چیز کا خالق مانتے تھے۔

قرآن نے نہ صرف اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا اور اس طرح اعلان کیا کہ کلمہء شہادت کی پہلی شرط لا الٰہ الا اللہ رکھ دی اور اہلِ مکّہ کو دوسرے خداؤں کی عبادت ترک کرنے کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ کائنات کا حقیقی اور تنہا خالق اللہ ہی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورہ رعد۔۱٦)	کہہ دے (اے رسولؐ) کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی اکیلا غالب ہے۔

اسلام میں ذاتِ باری تعالیٰ کو اس کی صفات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی قرآن کی بعض آیتوں میں اللہ کی ذات کی طرف واضح اشارے موجود ہیں مثلاً اللہ آسمان میں ہے (سورۂ الملک۔ ۱٦، ۱۷) اس کا قیام عرش پر ہے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ یہ عرش آسمان زمین سے الگ ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (الزخرف۔۸۲)	پاک ذات ہے وہ رب آسمانوں کا زمین کا جو عرش کا بھی مالک ہے۔

یہ عرش پانی پر ہے وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (سورۂ ہود۔۷)

اس عرش کو کچھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اور کچھ اس کے گرد مصروفِ تحمید ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (المومن۔۷)	جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں۔

وَ تَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ
(سورۂ الزمر۔۷۵)
اور تو دیکھے گا فرشتوں کو عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے۔

مشکوۃ شریف میں حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلعم ایک روز صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا آیا۔ آنحضرتؐ نے بادل کی طرف اشارہ فرما کر صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ آنحضرتؐ نے اس کی تشریح کی اور پھر اسی طرح کائنات کی مختلف چیزوں کے بارے میں سوال کیا اور جواب عطا فرمایا یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے سات آسمانوں کا تذکرہ فرمایا اور کہا کہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور سب سے اونچے آسمان کے اوپر عرش ہے اور عرش اور اس کے آسمان کے درمیان بھی پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔
(احمد اور ترمذی)[۳۳]

خدا بڑا قادرِ مطلق ہے۔ چنانچہ وہ کسی کام کا کرنا مقرّر کرتا ہے تو اس کی نسبت بس اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ
(سورۂ یٰسین۔۸۲)

ہم یہودیوں کے عقیدۂ تخلیق سے بحث کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ ان کا خدائے واحد یہواہ اپنی تمام قوت کے باوجود کائنات کو عدم سے وجود میں نہیں لایا بلکہ کائنات ابتدا میں ایک بے آب و گیاہ پُر آب ویرانہ تھی البتہ یہواہ نے اس کی اصلاح کی اور سورج، چاند، نباتات، حیوانات اور پھر انسان کی تخلیق کی۔ پرانا عہد نامہ اس سوال کا جواب نہیں دیتا کہ آخر بے آب و گیاہ ویرانے کو کس نے خلق کیا۔ یہودیوں کو شاید اس سوال کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی یا پھر انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ اگر ہم نے یہ کہا کہ اس ابتدائی ویرانے کو یہواہ نے پیدا کیا تو پھر سوال اٹھے گا کہ یہواہ کو کس نے پیدا کیا۔

قرآن نے کہا کہ اللہ ہر شے کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں قرآن میں اس ابتدائی ویرانے کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ آفرینش کی بقیہ داستان پرانے عہد

نامے سے بہت ملتی جلتی ہے۔

مثلاً قران بھی پرانے عہدنامے کی مانند یہی فرماتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن عرش پر قائم ہوا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (سورۂ الاعراف۔ ۵۴)	تحقیق تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔

ایسی ہی آیتیں سورۂ ہود ۷، سورۂ فرقان ۵۹، سورۂ سجدہ ۳، سورۂ ق ۳۸ اور سورۂ حدید۴ میں موجود ہیں۔

مگر ابتدا میں آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر اللہ نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔

لَمْ یَرَی الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء۔۳۰)	کیا ان لوگوں کو جو انکار کرتے ہیں نہیں نظر آیا کہ زمین و آسمان پہلے ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو جدا کیا۔

پھر فرمایا کہ پہلے آسمان اور اس کے بعد زمین بنائی۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (سورۂ النزعات۔۳۰) اور اس (آسمان) کے بعد زمین کو بچھا دیا

آسمان پہلے دھواں تھا۔ پس خدا نے اسے دو دن میں بنایا اور اس کو ستاروں سے زینت دی۔

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ. فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (سورۂ حم سجدہ۔۱۱،۱۲)	پھر آسمان کے بنانے کی طرف توجہ کی اور وہ دھواں تھا۔ پھر اس سے اور زمین سے کہا تم ہمارے احکام کی طرف بخوشی آؤ یا بہ مجبوری آؤ۔ ان دونوں نے کہا ہم بخوشی حاضر ہیں۔ پس دو دن میں ان کے سات آسمان بنا دیے اور ہر ایک آسمان میں اس کے مناسب حکم نافذ کردیا۔ اور ہم نے دنیا کے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور اس کی حفاظت کی۔

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو اونچا کیا۔ (سورۂ رعد۔۲) آسمان کی تخلیق سے فارغ ہو کر اللہ زمین کی طرف متوجہ ہوا اور زمین کو دو دن میں خلق کیا۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (سورۂ حم سجدہ۔۹)	کہہ دے کہ کیا تم اس کے منکر ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔

پہاڑ وغیرہ بھی غالباً دو دن میں خلق ہوئے کیونکہ فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (سورۂ حم سجدہ۔۱۰)	اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت رکھی اور اس میں قوت مقرر کی۔ چار دن میں

اللہ نے سورج، چاند اور رات دن سب کی تخلیق کی مگر ان چیزوں کی تخلیق کی مدّت نہیں بیان کی۔

پرانے عہد نامے کی داستانِ تخلیق میں یہواہ نے کائنات کو چھ دن میں خلق کیا تھا اور ساتویں دن آرام کیا تھا۔ جانوروں کے جوڑے اور انسان اس کی چھٹے دن کی تخلیق تھے۔ قرآن

کے مطابق اللہ نے دو دن میں آسمان بنائے جس میں غالباً چاند سورج اور ستارے بھی شامل ہیں۔ دو دن میں پہاڑ اور دو دن میں زمین وغیرہ خلق کئے لیکن آدم کی تخلیق ان اشیا سے الگ اور بعد میں ہوئی۔

آدم کی تخلیق خالقِ کائنات کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ چنانچہ بابل کی قدیم داستانوں میں بھی ہمیں پیدائشِ آدم کے تذکرے جابجا ملتے ہیں۔ مرڈک کی داستانِ تخلیق میں لکھا ہے کہ مرڈک یا اِیا نے انسان کو باغی دیوتا کے خون سے پیدا کیا۔ ایک اور قدیم بابلی نوشتے میں لکھا ہے کہ انسان کو مادرِ کائنات نے خلق کیا:

دیوتاؤں میں سب سے دانا مامی نے اپنا مُنھ کھولا
تو لُلو کو پیدا کر جو وحشی ہے۔
تاکہ وہ بارِ تخلیق اٹھائے۔
اور تمام دیوتاؤں کی خدمت کرے۔
اسے گیلی مٹی سے بنا
اور خون سے اس میں جان ڈال

یہ چند سطریں اس بابلی منتر کا ٹکڑا ہیں جو زچگی کے وقت پڑھا جاتا تھا۔ مصری داستان میں بھی انسان مٹی ہی سے بنایا جاتا ہے اور مٹی بھی وہ جس سے کمہار برتن گڑھتے ہیں۔ اسی طرح یہودیوں کی کتاب پیدائش میں خدا انسان کو مٹی سے بناتا ہے اور اس کے نتھنوں میں روح پھونکتا ہے۔

قرآن میں تخلیقِ آدم کا جو قصہ درج ہے اس سے ہر شخص آگاہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌ ۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ

(سورہ حجر ۲۶۔۲۸)

اور تحقیق ہم نے انسان کو خلق کیا کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو بنی تھی سڑی ہوئی کیچڑ سے اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو تحقیق میں پیدا کرنے والا ہوں آدمی کو بجنے والی مٹی سے جو بنی تھی کیچڑ سڑی ہوئی سے۔ پس جب درست کرلوں میں اس کو اور پھونک دوں روح اپنی سے پس گر پڑو واسطے اس کے سجدے کرتے ہوئے۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ میں نے انسان کو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّا زِبٍ (سورۂ الصّٰفّٰت ۱۱)

ان کے علاوہ بکثرت آیات تخلیقِ آدم سے متعلق قرآن شریف میں ملتی ہیں۔ ان آیتوں میں آدم کی تخلیق کا جو تصور ہے وہ مصری اور یہودی تصور سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی انسان کمہار کے برتن کی مانند گڑھا جاتا ہے۔

قرآن شریف میں حوا کی تخلیق کی تفصیلات نہیں ملتیں لیکن معتبر احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ نے حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ صاحب احسن التفاسیر نے سورۂ بقرہ کی آیت ۳۵ تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حضرت عبداللہ ابنِ عباس، عبداللہ ابن مسعود اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ پہلے تنِ تنہا حضرت آدمؑ کو جنت میں رہنے کا حکم ہوا تھا۔ حضرت آدمؑ جنت میں رہنے لگے مگر تنہائی کے سبب سے اکثر گھبرایا کرتے تھے۔ ایک دن جب حضرت آدمؑ سو رہے تھے تو ان کی نیند کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کر دیا اور ان دونوں کو جنت میں رہنے کا حکم دے دیا۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ پسلی کی ہڈی سے پیدا ہونے کے سبب سے پسلی کی ہڈی کی طرح عورت کے مزاج میں ایک کجی ہے۔[۲۴]

یہی روایت انجیل میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے اپنی صورت پر پیدا کیا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ میں اس کے لیے ایک مددگار اس کے مانند بناؤں گا اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس پسلی سے ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔

(کتاب پیدائش باب ۲)

غرضیکہ اسلام کا عقیدۂ تخلیق جزئیات سے قطعِ نظر یہود و نصاریٰ کے عقیدوں سے بہت مشابہ ہے۔

تخلیق کائنات کی کہانی لمبی ہوگئی۔ پھر بھی ہم چین، یونان اور برصغیر پاک و ہند کے قدیم عقائد کا جائزہ نہ لے سکے۔ بہرحال اس ساری بحث کا مقصد عقیدۂ تخلیق کے عہد بہ عہد ارتقا کی نشان دہی کرنا تھا اور یہ واضح کرنا تھا کہ یہ عقیدہ وجدان کی ودیعت نہیں ہے اور نہ پرانی قوموں نے مظاہرِ قدرت کے بغور مطالعے سے اپنے نظریات مرتب کیے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آفرینش کی ابتدائی داستانیں افزائشِ فصل کے تیوہاروں، رسموں اور رہسوں کا جز ہیں۔

تیسری صدی قبلِ مسیح میں جب سکندرِ اعظم کے جانشینوں نے مشرقِ قریب پر اپنا تسلّط قائم کیا تو ان علاقوں میں یونان کے فصلی تیوہاروں نے فروغ پایا۔ یونانیوں کا افزائش کا دیوتا دایونی سس Dionysys تھا۔ چنانچہ انھیں دایونی سس دیوتا کو اِزریس، بعل اور تموز سے ہم آہنگ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ مگر جن لوگوں نے یونانی شاعر ہیسیڈ (Hesiod) کا تخلیق نامہ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کوہِ اولمپس کے بڑے دیوتا زیوس (Zeus) کی داستان دراصل بابل کے زمزمۂ تخلیق ہی کا چربہ ہے اور اس کا مقصد بھی وہی تھا جو زمزمۂ بابل کا تھا۔

یونانیوں کے بعد جب پہلی صدی قبلِ مسیح میں جو علاقے رومۃ الکبریٰ کے سلطنت میں شامل ہوئے اور وہاں رومی نو آبادیاں قائم ہونے لگیں تو کنعان میں رومیوں کے تیوہار بڑی شان و شوکت سے منائے جانے لگے۔ رومیوں کا افزائش کا دیوتا باخوس (Bacchus) تھا۔ اس کا تیوہار

بھی بعل کی مانند موسمِ بہار ہی میں پڑتا تھا اس لیے اہلِ کنعان کو رومیوں کے تیوہار کو اپنانے میں کوئی جذباتی الجھن پیش نہیں آئی۔ بعلبک (لبنان) میں باخوس اور زہرہ وغیرہ کے عالی شان معابد کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔

البتہ ۳۳۰ء میں جب شہنشاہِ قسطنطین نے عیسائی مذہب قبول کر کے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو مقامی اور رومی بھی دیوتا عتاب میں آ گئے۔ ان کے بت توڑ دیے گئے اور معابد مسمار کر دیے گئے۔ ۳۷۸ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس (Theodsius) نے فطرت پرستی (Paganism) بذریعۂ فرمان ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے تین سال بعد فطرت پرستوں کے تمام تیوہار بھی بند کر دیے گئے اور ان رسموں میں شرکت جرم قرار پائی۔ ۴۳۸ء میں یہ اعلان ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی بت کی پرستش کرتا یا کسی مندر میں چڑھاوا پیش کرتا پایا گیا تو اس کو دس سیر سونا بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگا ورنہ اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

عیسائیوں کا سب سے بڑا تیوہار ایسٹر تھا۔ ایسٹر کے ہفتے میں حضرت مسیح کے مصلوب ہونے پر سوگ اور ان کے دوبارہ جی اٹھنے پر شادمانی کی رسمیں منائی جاتی تھیں۔ یہ رسمیں دراصل بعل اور اُزریس کی موت اور حیاتِ ثانیہ کی رسموں کی نقل تھیں۔

چنانچہ عوام کی تالیفِ قلب کی خاطر ایسٹر کا تیوہار اپریل میں اسی زمانے میں منایا جانے لگا جس زمانے میں فطرت پرست اپنا بہار کا تیوہار مناتے تھے۔

تین چار نسلوں کے بعد کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ ایسٹر کا تیوہار درحقیقت بعل اور اُزریس کے تیوہاروں کی نقل ہے یا توریت اور انجیل میں تخلیق کی جو داستانیں بیان کی گئی ہیں وہ بابل، کنعان اور مصر کی قدیم داستانوں سے ماخوذ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابن اسحاق، سیرۃ الرسول

۲۔ حتّی، تاریخ عرب، ص ۱۰۸

۳۔ مشکوٰۃ شریف، جلد چہارم، ص ۲۲۴۔۲۲۵

۴۔ احسن التفاسیر، ص ۸

تیرھواں باب

تخلیق اور ارتقا کا نظریہ

پرانی تہذیبوں میں تخلیقِ کائنات کے دو تصور ملتے ہیں۔ ایک سلبی، دوسرا جدلی۔ سلبی تصور زیادہ قدیم ہے اس لیے کہ ابتدائی انسان کو عملِ تخلیق کا شعور سب سے پہلے اپنی اور جانوروں کی پیدائش سے ہوا۔ بشر تولید کے قوانین سے تو واقف نہ تھا البتہ تجربے اور مشاہدے سے وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ بچہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ عورت کی طرح گائے، بھینس، ہرن، بھالو سب کی ماداؤں کے پیٹ پھولتے ہیں اور معیّنہ وقت کے بعد ان کے جسم کے ایک مخصوص مقام سے جیتا جاگتا مولود برآمد ہوتا ہے۔ یہ عمل شروع شروع میں لوگوں کو شاید بہت عجیب لگا ہو لیکن پھر وہ اس کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ عورت ان کی نظر میں تخلیق کا سرچشمہ اور افزائش نسل کی علامت بن گئی۔ انھوں نے زمین کو بھی ماں (عورت) کا رتبہ دے دیا کیونکہ پانی زمین ہی سے نکلتا تھا۔ درخت، پودے اور ہریالیاں زمین سے اُگتی تھیں اور زمین ہی کے سینے پر لہراتی تھیں۔ لہٰذا انھوں نے زمین کو اگر دھرتی ماتا کا رتبہ دیا تو کیا غلط کیا۔ یہی وجہ ہے کہ افزائشِ نسل و فصل کی تمام پرانی رسمیں ہر خطے اور قوم میں عورت ہی کے گرد گھومتی ہیں۔

تخلیق کائنات کے سلبی تصور کی سب سے نمایاں مثال موہن جو دڑو کی قدیم تہذیب ہے۔ اس خطے کے قدیم باشندے "شکتی" یا پراکرتی کو تخلیق کائنات کا مبدا خیال کرتے تھے اور شکتی کو عورت کے روپ میں دیکھتے تھے۔ اسی سے ملتا جلتا عقیدہ قدیم یونانیوں کا تھا۔ چنانچہ ہیسیڈ (Hesiod) لکھتا ہے کہ

"ابتدا میں خلا تھا۔ تب چوڑے سینے والی زمین کا وجود ہوا جو تمام چیزوں کی ابدی بنیاد ہے اور عشق جو دیوتاؤں اور انسانوں کے جسموں کو ڈھیلا کر دیتا ہے اور ان

> کے حواس اور ارادوں کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے اور زمین نے پہلے ستاروں بھرے آسمان (Uranus) کو جنا جو وسعت میں اس کے برابر تھا تا کہ آسمان ہر طرف سے اس کو ڈھک لے۔ تب اس نے اونچے پہاڑ پیدا کیے اور بپھرے سمندر کو مگر یہ چیزیں اس نے بلا جنسی مباشرت کے پیدا کیں اور تب اس نے آسمان کے ساتھ صحبت کی۔''

وادیٔ سندھ کے آریاؤں نے جن کے معاشرے میں مرد کو عورت پر فوقیت حاصل تھی پراکرتی کے ساتھ پُرش (مرد) کو نہ صرف شامل کر لیا بلکہ اس کو فعّال قوت قرار دیا اور عورت کی قوت اِنفعالی مقرر کی۔ اسی طرح چینیوں میں یانگ (مرد) اور یین (عورت) کے ملاپ سے موجوداتِ عالم کی تخلیق کا تصور رائج ہوا۔ انھوں نے بھی تخلیقی عمل میں یانگ کو وہی درجہ دیا جو آریاؤں نے پُرش کو دیا تھا۔

تخلیق کے جدلی تصور کے بارے میں ہم پچھلے صفحات میں بڑی تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ عشتار اور ارشی گل کی جنگ، تیامت اور الپسُو اور پھر مردُک اور تیامت کی جنگیں، اِزِریس اور سات کی جنگ، بعل اور موت کی جنگ، اہورمزدا یعنی یزداں (نور) اور اینگرومنوس یعنی اہرمن (ظلمت) کی جنگ تخلیقِ کائنات کے جدلی تصور کی مختلف شکلیں ہیں۔ درحقیقت یہ جڑواں شخصیتیں ایک ہی حقیقت کے دو متضاد پہلو ہیں جن کی تعبیر انسان نے بڑے ڈرامائی انداز میں کی تھی۔ توحید پرست مذاہب ہر چند کہ خالق کائنات کی ذات میں کسی دوسری ذات کو شریک نہیں کر سکتے تھے لیکن جدلی تصور کے اثر سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ انھوں نے شیطان کو بدی کا پیکر بنا کر انسان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ البتہ ہبوطِ آدمؑ کی داستان پڑھو تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اصل جنگ آدم اور شیطان کے درمیان نہیں بلکہ خدا اور شیطان کے درمیان ہے۔

تخلیقِ کائنات کا جدلی تصور اس آویزش اور پیکار کا ذہنی پرتو ہے جو انسانی معاشرے میں ایک خاص دور میں شروع ہوئی۔ یہ جدلی تصور غیر طبقاتی معاشرے میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس وقت ابھرا جب معاشرہ طبقات میں بٹ گیا۔ بادشاہتیں قائم ہوئیں اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔ جنگیں چھڑتیں، بستیاں اُجڑتیں، لشکریوں کے ساتھ بے گناہوں کا خون بہتا اور جو فریق فاتح ہوتا اس کے کارناموں کی دھوم مچتی، اس کی شان میں

داستانیں لکھی جاتیں اور بھجن اور گیت گائے جاتے۔ حتیٰ کہ ہر قسم کی اچھائی کو اس کی ذات سے منسوب کر دیا جاتا تھا اور دشمنوں کو بدی کا پتلا بنا دیا جاتا تھا۔

ارتقا کا نظریہء تخلیق کائنات کے عقیدوں کی سراسر نفی کرتا ہے۔ ہر چند کہ اس نظریے کا موجد چارلس ڈارون ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ مادیّت کے فلسفے اور اٹھارویں، انیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ مادّی فلسفیوں کا دعویٰ تھا کہ تمام موجوداتِ عالم مادّے سے بنے ہیں جس کا سب سے قلیل عنصر ایٹم ہے۔ مادّہ کبھی فنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی تاثیریں اور شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ مادّہ ہر دم حرکت کرتا اور متغیر رہتا ہے خواہ ہم اس تغیر یا حرکت کو دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔ تیسرے یہ کہ مادّے کے تغیر اور حرکت کے کچھ قانون ہیں اور کوئی غیر مادّی یا ماورائی طاقت مادّے کی حرکت و تغیر میں دخیل نہیں ہوتی۔

نظریہء ارتقا کے دھندلے سے نشان ہم کو قدیم فلسفیوں بالخصوص یونانی فلسفیوں کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ یہ فلسفی دیوی، دیوتاؤں کی خلاقی قوتوں کے قائل نہیں تھے اور نہ یہ مانتے تھے کہ دنیا کے بنانے چلانے اور بگاڑنے میں ان دیوی دیوتاؤں کو کوئی دخل ہے بلکہ وہ مظاہرِ قدرت کی تشریح قدرت ہی کے حوالے سے کرتے تھے۔ مثلاً کوئی کہتا تھا کہ دنیا پانی سے بنی ہے، کوئی کہتا تھا کہ آگ سے اور کوئی کہتا تھا کہ ہوا یا مٹی سے۔ کائنات کا ایٹمی فلسفہ بھی انھیں کی ایجاد ہے۔ انکسیماندر (۶۱۱۔۵۴۷ ق۔م) قیاس آرائیوں میں ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کائنات کا مادّی سبب اور عنصرِ اولیٰ ''لامحدود'' ہے۔ دنیا دائمی حرکت کی بنا پر وجود میں آئی اور ضدین کے باہمی تصادم سے بنتی بگڑتی رہتی ہے۔

انکسیماندر (Anaximander) ملی ٹوس (Miletos) کا باشندہ تھا۔ یہ ریاست ایشیائے کوچک (ترکی) کے جنوبی ساحل پر واقع تھی اور یونان کی شہری ریاستوں میں سب سے زیادہ دولت مند سمجھی جاتی تھی۔ ملی ٹوس کی خوش حالی کا سبب اونی کپڑوں کی صنعت تھی۔ ملی ٹوس کی بندرگاہ میں مصر، بلقان، لبنان وغیرہ کے تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کی وجہ سے بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ وہاں کے تاجروں کی کاروباری سرگرمیوں کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کی اسّی نوآبادیاں مختلف ملکوں میں قائم تھیں جہاں سے وہ اپنے وطن کی پیداوار کے

بدلے دھات، پھل، لکڑی وغیرہ حاصل کرتے تھے۔

تجارتی منڈی ہونے کے باعث ملی ٹوس میں ہر ملک، قوم اور مذہب کے لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ تجارتی مال کی لین دین کے علاوہ وہاں پر خیالوں اور عقیدوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ تجارتی سفر کے تجربوں نے ملی ٹوس کے باشندوں کو بہت آزاد خیال بنادیا تھا اور ان میں نئی چیزوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ یوں بھی مصر، لبنان اور بابل ہمسایہ ملک تھے جن سے ملی ٹوس کے لوگوں کا مستقل رابطہ رہتا تھا چنانچہ ملی ٹوس چھٹی اور پانچویں صدی قبلِ مسیح میں فلسفے اور سائنس کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ یونانی فلسفے اور سائنس کے بانی طالیس اور انکیسماندر اگر ملی ٹوس کی خاک سے اٹھے تو جائے حیرت نہیں۔

انکیسماندر خالی خولی فلسفی نہ تھا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے گیان دھیان میں مصروف رہتا بلکہ وہ بڑا سرگرم شہری تھا۔ اس نے ایک سورج گھڑی بنائی تھی جس میں سیّاروں کی گردش دکھائی گئی تھی، اس نے علم جغرافیہ کی تدوین کی تھی اور دنیا کا ایک نقشہ بھی بنایا تھا تاکہ ہم وطنوں کو تجارتی سفر میں سہولت ہو۔ نظریہء ارتقا کا پہلا تذکرہ بھی اسی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ زمین پہلے ایک سیّال مادّہ تھی جو سورج کی گرمی سے آہستہ آہستہ خشک ہوگئی۔ بھاپ کے اُڑنے سے بادل بنے اور فضا کی حرارت میں جو تبدیلی آئی اس کی وجہ سے ہوا میں تمّوج پیدا ہوا۔ تمام حیوان بھی نمی ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اوّلین جانور جن میں انسان بھی شامل ہے مچھلی تھے۔ پھر جوں جوں زمین سوکھتی گئی یہ جانور اپنی موجودہ شکل اختیار کرتے گئے۔ انکیسماندر کی ایک اور حیرت انگیز قیاس آرائی یہ تھی کہ انسان کسی دوسری نوع کے جانور سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیدائش کے وقت بشر اتنا کمزور اور لاچار ہوتا کہ اپنے لیے غذا نہیں فراہم کرسکتا لہٰذا فنا ہوجاتا۔ انکیسماندر کسی حد تک اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ ماحول سے مطابقت کس کو کہتے ہیں اور بقائے اصلح کے کیا معنی ہیں؟[1]

دوسرا یونانی فلسفی جس نے ارتقا کے بارے میں سوچا امپے ڈوکلیز (Empedocles) تھا۔ وہ اپنے عہد کا (۵۰۰۔۴۳۰ ق۔م) نہایت مشہور طبیب، خطیب اور شاعر تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تمام موجوداتِ عالم چار عناصر: ہوا، پانی، آگ اور مٹی سے مل کر بنے ہیں۔ یہ عناصر اپنے عمل میں

کشش واجتناب یا محبت ومخاصمت کی حرکی قوتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ وصل وفراق کی یہی دونوں قوتیں ہیں جن کے سبب سے عناصرِ اربع کے مابین ملاپ اور جدائی ہوتی رہتی ہے اور چیزیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ جب محبت اور وصل کا رجحان غالب ہوتا ہے تو ٹھوس مادہ ترقی کر کے پودا بن جاتا ہے اور نامیاتی (Organic) اجسام اعلیٰ سے اعلیٰ تر شکلیں اختیار کرتے جاتے ہیں۔ امپے ڈوکلیز کا خیال تھا کہ نیچر میں ایک نوع اور دوسری نوع کی چیزوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً بدن کے بال، درختوں کی پتیاں، پرندوں کے موٹے پر اور جانور کی موٹی کھال کے خول درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ "زمین پر ابتدا میں جانوروں کی کہیں زیادہ قسمیں موجود تھیں مگر ان میں بہ کثرت ایسی تھیں جو نئی نسلیں پیدا نہیں کر سکیں اور معدوم ہو گئیں کیونکہ اس وقت جو انواع زندہ ہیں ان کے تحفظ اور بچاؤ کا سبب ان کی ہوشیاری یا جراءت یا پھرتی تھی"۔[۲] ڈارون کے بقائے اصلح کے نظریے کی یہ نہایت واضح پیش قیاسی ہے۔ امپے ڈوکلیز کا یہ بھی قول تھا کہ "تمام اعلیٰ درجے کی انواع نے ادنیٰ درجے کی انواع سے ترقی کی ہے"۔[۳]

ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق۔م) کی قاموسی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ وہ پہلا یونانی فلسفی ہے جس نے وسیع پیمانے پر سائنسی تجربے کیے۔ اس کے پیش رَو فلسفی اپنے مشاہدے کی بنا پر ظن وقیاس سے کام لیتے تھے لیکن ارسطو کے نزدیک یہ طریقہ اطمینان بخش نہ تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کی مدد سے انواع واقسام کے پودے، پھول اور جانور جمع کیے اور ان پر طرح طرح کے تجربے کرتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس کے شاگرد سکندرِ اعظم نے شاہی شکاریوں، مچھیروں اور باغ بانوں کو حکم دے رکھا تھا کہ تم کو جب کوئی نئے قسم کا پودا یا جانور ملے تو اس کا ایک نمونہ ارسطو کے عجائب گھر کو ضرور بھجوادو۔ ارسطو نے جانوروں کی تقریباً ساڑھے پانچ سو انواع کی درجہ بندی کی تھی اور مختلف نوع کے کم از کم پچاس جانوروں کی چیر پھاڑ کر کے ان کے متعلق اپنے مشاہدات قلم بند کیے تھے۔[۴]

ارسطو نے ان تجربوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا ایک وحدت ہے۔ اس وحدت کی نوعیت سیڑھی کی سی ہے جس میں بہت سے زینے ہیں۔ پہلے زینے پر پودے ہیں۔ ان سے اوپر کے زینوں پر درجہ بدرجہ مختلف انواع کے جانور ہیں اور سب سے بالائی زینے پر انسان براجمان ہے۔ اس طرح ارسطو نے مخلوقات کے گیارہ درجے یا زینے

مقرر کیے۔ البتہ اس کا کہنا تھا کہ ایک زینے کی اعلیٰ ترین مخلوق اور اس سے اوپر کے زینے کی پست ترین مخلوق کے درمیان اتنا کم فرق ہوتا ہے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے:

"نیچر بے جان چیزوں سے حیوانی زندگی کی طرف دھیرے دھیرے اس انداز سے بڑھتی ہے کہ دونوں میں خطِ امتیاز کھینچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ موجودات کی سیڑھی میں بے جان چیزوں سے اوپر نباتات آتی ہیں جو حیوانوں کے مقابلے میں تو بے جان ہی ہوتی ہیں لیکن ٹھوس جسموں کے مقابلے میں جان دار پھر پودوں کا رجحان حیوانات کی طرف ہوتا ہے۔ سمندر میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ جانور ہیں یا پودے۔ اسفنج ہر اعتبار سے نباتات سے تعلق رکھتا نظر آتا ہے۔ بعض جانوروں میں جڑیں ہوتی ہیں اور اگر ان کو جڑ سے جدا کر دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں۔ جہاں تک حسّیات کا تعلق ہے بعض جانوروں کی حسّی قوت کا پتہ ہی نہیں چلتا البتہ بعض اس قوت کا بہت خفیف سا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح پوری حیوانی سیڑھی میں درجہ بدرجہ فرق ہوتا جاتا ہے"۔[۵]

ارسطو مخلوقات کی درجہ بندی ان کی جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے کرتا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ نوع کا تعیُّن جسمانی ساخت سے نہیں ہوتا بلکہ نامیاتی اعضا کی حرکات و عادات سے ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ارسطو مابعد الطبیعیات کا سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ جسمانی ساخت اور اعضا کے عادات و حرکات بالآخر روح کے تابع ہوتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک ہر شے اپنی مخصوص روح ہوتی ہے۔ نباتات کی روح جو ان کی مسلسل تخلیق اور افزائش کی ضامن ہوتی ہے۔ جانوروں کی روح جو افزائشی روح کے علاوہ ہوتی ہے (حسی روح)۔ یہ حسی روح از خود محسوس کرنے اور حرکت میں آنے میں جانوروں کی مدد کرتی ہے۔ اسی طرح انسان کی اپنی روح ہوتی ہے جس میں تخلیقِ ذات کرنے اور حرکت اور محسوس کرنے کے علاوہ عقل بھی ہوتی ہے۔ ارسطو کے خیال میں روحِ انسانی کا مرکز دماغ نہیں بلکہ دل ہوتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک انسان اور دوسرے بچہ دینے والے جانوروں کی درمیانی کڑی بوزنہ ہے۔[۶] اس کا خیال ہے کہ جانوروں میں عضوی تبدیلی ضرورت کے تقاضوں کی وجہ سے ہوتی

ہے۔ نظریہء ارتقا کا موجد ڈارون بھی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ارسطو کی تحریروں میں ''قدرتی انتخاب'' کا (جو نظریۂ ارتقا کی اساس ہے) ہلکا سا پرتو ملتا ہے۔ مثلاً غرض و غایت کے فلسفے کو رد کرتے ہوئے ارسطو کہتا تھا کہ بارش اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اناج پیدا ہو یا کاشت کار کی فصل کھلیان میں تباہ ہو جائے اسی منطق کا اطلاق عضویات پر کرتے ہوئے ارسطو لکھتا ہے کہ دانتوں کی بتیسی کی ترتیب ضرورتاً ایسی ہوتی ہے کہ سامنے کے دانت تو تیز اور نکیلے ہوتے ہیں جنہوں نے یہ شکل اس لیے اختیار کی ہے کہ خوراک کو کاٹ یا بانٹ سکیں جبکہ ڈاڑھیں چپٹی ہوتی ہیں اس لیے کہ ان سے غذا چبائی جاتی ہے۔ دانتوں کی یہ تنظیم کسی مقصد کے تحت نہیں ہوئی ہے بلکہ اتفاقاً ہوئی ہے۔ یہی حال دوسرے اعضا کا ہے جو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مقصد سے مطابقت کے سلسلے میں وجود میں آئے ہیں ہے۔ ڈارون ارسطو کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''یہاں ہم کو قدرتی انتخاب کے اصول کا پرتو دکھائی دیتا ہے مگر ارسطو کو اس اصول کی کتنی کم فہم تھی اس کا اندازہ دانتوں کی تشکیل کے بارے میں اس کی رائے سے ہوتا ہے۔[۸]

سکندرِ اعظم کی موت (۳۲۷ ق۔م) کے بعد یونانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے جانشینوں کے درمیان حصولِ اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ پانچ سال بعد جب ارسطو نے وفات پائی تو یونانی تہذیب کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ فلسفہ و حکمت کی درس گاہیں ویران ہو گئیں اور یونانی علما و فضلا نے بھاگ بھاگ کر اسکندریہ میں پناہ لی۔ یہ درست ہے کہ رومۃ الکبریٰ کے فرماں روا فتح و ظفر اور جاہ و حشم میں یونانیوں پر بھی سبقت لے گئے لیکن وہ افلاطون اور ارسطو نہ پیدا کر سکے اور جب بادشاہ سمیت حکمراں طبقے نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور کلیسائے روم کا اقتدار ہوا تو سائنسی تحقیق و جستجو کی روح بالکل ہی مردہ ہو گئی۔ تخلیق کے مسیحی عقیدے نے رواج پایا اور پادریوں نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی کہ خدا نے دنیا کو چھ دن میں خلق کیا تھا اور اس وقت سے وہ یوں ہی چل رہی ہے۔ اس میں نہ تبدیلی ہوتی ہے نہ ترقی۔ البتہ جو تبدیلیاں اور ترقیاں تم دیکھ رہے ہو وہ درحقیقت شیطانی شعبدے ہیں جن سے ہر خدا پرست کو پرہیز کرنا چاہیے۔ پادریوں نے ہبوطِ آدم کی داستان کی جو تشریح کی اس کے نتائج اور زیادہ مضر ثابت ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ بنی آدم روحانی اور اخلاقی طور پر مسلسل روبہ انحطاط ہے۔ یہ زوال

اس لمحے شروع ہوا جب آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا اور جنت سے نکالے گئے۔ اگر کسی بدنصیب نے پادریوں کی ان خرافات کے خلاف منھ کھولنے کی جرأت کی تو کلیسا کی عدالت نے اس کو زندیق، دہریہ، بدعتی اور جادوگر قرار دے کر آگ میں جھونک دیا یا بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں بے گناہ کلیسا کے ان انسانیت سوز جرائم کا نشانہ بنے۔ فلسفہء انحطاط کے اس خونیں طوفان میں ترقی کے تصور کی نشو ونما کیوں کر ہو سکتی تھی۔

البتہ پندرھویں صدی کے اختتام پر جب امریکہ اور ہندوستان کے بحری راستے دریافت ہوئے اور بین الاقوامی تجارت کے فروغ کے باعث سرمایہ داری نظام کی داغ بیل پڑی اور یورپ میں قومی ریاستیں بننے لگیں اور ان کے مفاد کلیسا سے ٹکرانے لگے اور پروٹسٹنٹ تحریک شروع ہوئی اور چھاپے خانے قائم ہوئے اور قومی زبان کا ادب ترقی کرنے لگا اور پاپائے روم کے سیاسی مخالفین نے روشن خیال دانش وروں کی سرپرستی شروع کر دی اور بین الاقوامی تجارت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مشینی ایجادوں کی حوصلہ افزائی ہونے لگی تو یورپ میں خرد افروزی کا نیا دور شروع ہوا۔ سائنسی دریافتوں اور صنعتی ترقیوں کی وجہ سے تحقیق و جستجو کا ایک نیا ماحول پیدا ہوا۔ تقلید اور روایت پرستی کی جگہ آہستہ آہستہ تنقید اور تشکیک اور کیوں اور کیسے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ اب کم از کم تعلیم یافتہ طبقوں کو یہ کہہ کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں بات انجیل یا مذہبی کتابوں میں یوں ہی لکھی ہے لہٰذا اس کو بے چون و چرا مان لو بلکہ ہر دعوے کی تائید میں عقلی دلیل طلب کی جاتی تھی۔ اُس مذہب کے دن پورے ہو گئے تھے جو خوف اور تعزیر کے تازیانوں سے حکومت کرتا تھا۔

اکا دکا فلسفیوں سے قطعِ نظر ارتقا کے تصور کا احیا اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ قرونِ وسطیٰ کا فلسفۂ حیات اگر آدم کا زوال تھا تو ۱۸ ویں صدی نے آدم کی ترقی کو اپنا فلسفہء حیات بنایا۔ یہ فلسفہ کسی دانائے راز کے تخیل کی تخلیق نہ تھا بلکہ گرد و پیش کی حقیقتوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ صنعت و حرفت میں ترقی، پیداوار اور تجارت میں ترقی، فن و ہنر میں ترقی، تعلیم و تدریس میں ترقی وہ معروضی حقیقتیں تھیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے مفکروں نے انھیں

معروضی حقیقتوں کی بنا پر ارتقا کا ایک جامع نظریہ مرتب کیا جو کائنات اور انسانی معاشرے دونوں پر حاوی تھا۔ اس نظریے کی وسیع پیانے پر تبلیغ سب سے پہلے فرانس کے ''قاموسیوں'' (Encyclopaedists) نے کی۔ یہ روشن خیال مفکروں کا ایک گروہ تھا جس کا سربراہ مشہور انقلابی مفکر دیدرو تھا۔ اس جماعت نے ۱۷۵۱ء اور ۱۷۷۷ء کے درمیان ایک انسائیکلو پیڈیا ۲۲ جلدوں میں شائع کی جس کا مقصد ''روئے زمین پر بکھرے ہوئے علم کو یکجا کرنا تھا تا کہ کوئی جامع نظامِ فکر وضع کیا جا سکے''۔ اس نظامِ فکر کی اساس عقل اور سائنس تھی۔ انسائیکلو پیڈیا کے مندرجات کا تعلیم یافتہ ذہنوں پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ فرانس کی ایڈوکیٹ جنرل کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ''ان فلسفیوں نے تختِ شاہی کو ہلا دیا ہے اور کلیسا کو درہم برہم کر دیا ہے۔ ۹''

اور انقلابِ فرانس کے ایک نقیب کون دورسے (Condorcet) نے اپنی کتاب ''روحِ انسان کی ترقی کی تاریخ'' میں لکھا کہ ''میں نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ انسان کی کاملیت دراصل لامحدود ہے۔ اس کی ترقی کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہے گی مگر انسان پیچھے کی طرف کبھی نہ دوڑے گا''۔ اور مشہور سائنس دان لمارک نے اپنے تجربوں کا نچوڑ ۱۸۰۹ء میں فلسفہء حیوانیات میں بڑی تفصیل سے پیش کیا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ جانوروں نے بھی مشینوں کی طرح ارتقا کے مدارج بہتر نوع کی شکل میں ''قانونِ ترقی'' کے مطابق طے کیے ہیں۔

فرانس کے خردمند یونانی فلسفیوں کے نظریہء ارتقا سے بہت متاثر تھے۔ مثلاً بنائے دامیلے (Benoit De Maillet) نے ۱۷۴۹ء میں انکسیماندر کی تقلید میں یہ رائے ظاہر کی کہ ''خشکی کے تمام جانور مچھلی سے نکلے ہیں۔ انھوں نے بدلتی ہوئی عادتوں اور تغیّر پذیر ماحول کے باعث موجودہ شکلیں اختیار کی ہیں۔ پرندے ابتدا میں اُڑنے والی مچھلیاں تھے اور شیر دریائی شیر کی نسل سے ہے اور انسان جل پریوں کی اولاد ہے جن کا اوپری دھڑ عورت کا اور نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے'' اور ماپرٹوئیس (Maupertuis) نے ۱۷۵۱ء میں یونان کے ایٹمی فلسفیوں کی طرح یہ دعویٰ کیا کہ پودوں اور جانوروں کی مختلف انواع ایٹموں کی مختلف ترتیبوں سے پیدا ہوئی ہیں۔

دوسرا ملک جہاں ارتقا کا نظریہ بہت مقبول ہوا جرمنی تھا۔ مگر وہاں کے مفکر ارتقا کی تشریح مشینوں کے حوالے سے نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی توجہ کا مرکز ذہنِ انسانی کا ارتقا تھا۔ وہ

آئیڈلسٹ تھے اور ان کے نزدیک موجوداتِ عالم کے ارتقا کی محرک ''روحِ عالم'' تھی یا تصورِ مطلق۔ انہوں نے نیچر کے ارتقا کے تین گریڈ مقرر کیے تھے۔ پہلا میکانکی جیسے سورج اور سیاروں کا نظام جس میں ''خودمختاری'' برائے نام ہوتی ہے۔ دوسرے کیمیاوی عناصر اور تیسرے حیوانات جو خود بخود ترقی کرتے ہیں۔ ہر گریڈ میں بعض اپنی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں اور بعض نچلی سطح کی اشیا کی لیکن یہ تینوں گریڈ پستی سے ترقی کر کے یکے بعد دیگرے وجود میں نہیں آئے ہیں اور نہ ایک کا دوسرے کے وجود سے کوئی تعلق ہے۔ تاریخی ارتقا تو فقط ''روحِ عالم'' کی باطنی ذات میں ہوا ہے۔ اس روحِ عالم نے اپنے داخلی تضادات کو تحلیل کر کے مختلف شکلیں خلق کیں جو قدرت کے معروضات کا مخرج ہیں۔ تمام موجودات روحِ عالم کی باطنی حرکت کے معروضی مظاہر ہیں لیکن ان کا ایک دوسرے سے کوئی طبعی یا تاریخی رشتہ نہیں ہے۔

جرمنی کے آئیڈلسٹ فلسفیوں کا سرخیل ہیگل (۱۷۷۰ء۔۱۸۳۱ء) تھا جس نے ''روحِ عالم'' یا ''تصورِ مطلق'' کے ارتقا کا پورا نظام مرتب کر ڈالا۔ وہ روحِ عالم کو کائنات کا جوہر خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ عالم عبارت ہے ''روحِ عالم'' کے ارتقا اور اظہار و نمود سے۔ روح کی پوشیدہ قوتوں کے اجاگر ہونے سے، آزادی کے شعور کے ارتقا سے، ہیگل کے بقول ''روح'' جب اپنے آپ کو ''مکانی وسعتوں'' میں ظاہر کرتی ہے تو اس کو نیچر کہتے ہیں اور جب وہ اپنے آپ کو زمانی ارتقا میں ظاہر کرتی ہے تو اس کو انسانی تہذیبوں کا ارتقا کہتے ہیں۔ ہیگل کی رائے میں نیچر کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ یعنی نیچر میں کوئی تبدیلی یا ترقی نہیں ہوتی۔ دوستوں نے جب ہیگل کو بتایا کہ علم الارض کے ماہرین نے زمین کی تہوں اور چٹانوں کی پرتوں سے ایسے جانوروں کے ڈھانچے برآمد کیے ہیں جواب ناپید ہیں تو ہیگل نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے اس کے نظریے کی تردید ہوتی تھی۔ ہیگل کا کہنا تھا کہ نیچر کے برعکس انسان اور اس کا معاشرہ برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔

ارتقا کا سائنسی نظریہ باقاعدہ طور پر سب سے پہلے ژاں لمارک (۱۷۴۴ء۔۱۸۲۹ء) نے ۱۸۰۹ء میں اپنی تصنیف ''فلسفہء حیوانات'' میں پیش کیا۔ لمارک کے والدین چاہتے تھے کہ بیٹا پادری بنے مگر اس کا دل مذہبی تعلیم میں نہ لگا اور وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ پھر تجارت کرنے لگا

لیکن سُو دو ژیاں کا ماحول بھی اسے پسند نہ آیا اور وہ پیرس کے شاہی باغ میں ملازم ہو گیا۔ پودوں اور جانوروں کی یہ دنیا اس کو بہت اچھی لگی۔ حتیٰ کہ وہ اپنی فرصت کے اوقات بھی انھیں کے مطالعے میں صرف کرنے لگا۔ لمارک نے اپنی تحقیق کی ابتدا پودوں سے کی۔ ان سے فارغ ہوا تو سب سے نچلے درجے کے جانوروں کا مطالعہ کرنے لگا اور اس طرح بتدریج انسان تک پہنچا۔

لمارک بڑھاپے میں اندھا ہو گیا تھا اور اس کے آخری دن بڑی عسرت اور کسمپرسی میں گزرے۔ اس کا واحد سہارا دو بیٹیاں تھیں جو اس کی خدمت کرتی تھیں اور جن سے وہ اپنی کتابیں لکھوایا کرتا تھا۔ البتہ اس کے مرنے کے برسوں بعد اس کی شاہ کار تصنیف کے سو سالہ جشن کے موقع پر (۱۹۰۹ء) پیرس میں اس کا مجسّمہ بڑی دھوم دھام سے نصب کیا گیا۔ نیچے لکھا تھا۔ ''نظریہء ارتقا کا موجد''۔ مجسّمے کی پشت پر ایک نابینا بوڑھے کی اُبھرواں تصویر بنی تھی جو آرام کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کی بیٹی پاس کھڑی کہہ رہی ہے کہ ''آئندہ نسلیں آپ پر فخر کریں گی اور آپ کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اس کا بدلہ لیں گی''۔

لمارک کا کہنا تھا کہ پودوں اور جانوروں نے بہت طویل مدت کے ارتقائی عمل سے گزر کر موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا باعث ماحول کی تبدیلیاں ہیں۔ جسم کی تبدیلیاں نئی نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اس نے پانی کے کنارے اُگنے والے ایک پودے کی مثال دیتے ہوئے لکھا کہ یہ پودا آدھا پانی کے اندر ہوتا ہے اور آدھا پانی کے اوپر۔ جو شاخیں پانی میں ڈوبی رہتی ہیں ان میں باریک باریک کانٹے نکل آتے ہیں۔ البتہ جو شاخیں سطحِ آب سے اوپر ہوتی ہیں ان میں کانٹے نہیں ہوتے بلکہ چوڑی چوڑی پتیاں اور پھول ہوتے ہیں مگر اسی پودے کو اگر خشکی میں لگا دیا جائے تو اس کی تمام شاخوں میں پتیاں نکل آتی ہیں اور دوبارہ پانی میں لگا دیا جائے تو پہلے کی طرح زیرِ آب شاخوں میں پھر کانٹے نکل آتے ہیں۔

ماحول کی تبدیلی کا اثر جانوروں پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کو بھی تغیّر پذیر ماحول کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی حرکات و سکنات میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ جانوروں نے ضرورت کے تحت اپنے بدن کے جن حصوں سے زیادہ کام لیا ان میں ترقی اور

اصلاح ہوتی گئی اور جن اعضا سے کم کام لیا یا جن کا استعمال بالکل ترک کر دیا وہ اعضا چند نسلوں کے بعد آہستہ آہستہ مُردہ اور پھر معدوم ہو گئے۔ لمارک نے اس قانون کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً بوجھ بردار یا گودی میں کام کرنے والے مزدوروں کے پاؤں کے پنجے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح نانبائیوں اور ملاحوں کے بازو، کندھے اور سینے بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔ دلدل اور کیچڑ میں رہنے والے پرندوں کی ٹانگیں، گردنیں اور چونچیں لمبی ہوتی ہیں اس لیے کہ کیچڑ کے نیچے سے غذا حاصل کرنے میں یہ اعضا بہت مدد کرتے ہیں۔ ترکِ استعمال کی مثال زمین دوز جانور ہیں جو اندھے ہوتے ہیں۔ اعضا کے استعمال یا ترکِ استعمال سے جسم میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ نئی نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں لیکن لمارک نے پودوں اور جانوروں کے نوعی ارتقا میں ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ایک غیر سائنسی عنصر بھی شامل کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر نامیاتی جسم ''تکمیلِ ذات'' کے لیے کوشاں رہتا ہے اور ایک پُراسرار باطنی جذبہ اس کو ترقی کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ اس مابعد الطبیعیاتی تصور کی تصدیق، تجربے اور مشاہدے سے نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا سائنس دانوں نے اس کو رد کر دیا۔

ڈارون کی عظمت یہ ہے کہ اس نے اپنے نظریہء ارتقا کی تشریح فقط شواہد اور تجربوں کے حوالے سے کی۔ قدرتی حقیقتوں کی توجیہ کے لیے کسی ماورائی قوت کا سہارا نہیں لیا۔

چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء۔۱۸۸۲ء) کی پرورش بڑے سائنسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کا دادا ڈاکٹر ایراس مس ڈارون اپنے وقت کا مشہور نیچری تھا جس کے خیالات لمارک سے ملتے جلتے تھے۔ ڈارون کا باپ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ باغ بانی کا بہت شوقین تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بنگلے میں انواع و اقسام کے درخت لگا رکھے تھے۔ کمسن ڈارون کا زیادہ وقت اسی باغ میں گزرتا تھا۔ وہ پرندوں اور پھولوں کو گھنٹوں غور سے دیکھتا رہتا اور رنگ برنگی تتلیاں اور بھنورے جمع کرتا۔ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے ڈارون لکھتا ہے کہ ''جب میں اسکول میں داخل ہوا تو میرا نیچرل تاریخ بالخصوص نیچرل چیزوں کو اکٹھا کرنے کا مذاق کافی ترقی کر چکا تھا۔ میں پودوں کے نام جاننے کی کوشش کرتا اور گھونگے، سیپ، مہریں، سکے، دھات اور پتھر کے ٹکڑے غرضیکہ طرح طرح کی اشیا جمع کرتا رہتا تھا''۔[۱۰]

ڈارون کو سولہ برس کی عمر میں اڈنبرا یونیورسٹی میں ڈاکٹری پڑھنے بھیج دیا گیا لیکن اس کو طب سے کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ اس کا فطری میلان نیچر کی طرف تھا۔ وہ حسبِ معمول پھول، پتے اور کیڑے مکوڑے جمع کرتا یا نباتات و حیاتیات پر کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ وہ مچھیروں کے ساتھ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاتا اور نئے نئے نمونے کے گھونگے اور سیپ لے آتا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے آبی کیڑوں پر ایک مضمون لکھا اور یونیورسٹی کی پلی نین (Plinean) سوسائٹی میں جو طلبا کی علمی انجمن تھی پڑھا۔ وہ اس انجمن کے جلسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا اور اعتراف کرتا ہے کہ ان بحثوں کا ''میرے شوقِ تحقیق پر بہت خوش گوار اثر پڑا تھا''۔ وہاں پروفیسروں کی بھی ایک سوسائٹی تھی جس کے جلسوں میں نیچرل سائنس پر مذاکرات ہوتے رہتے تھے۔ ڈارون پروفیسر گرانٹ کے ہمراہ ان جلسوں میں بھی شرکت کرتا رہتا تھا۔ اڈنبرا ہی میں اس نے آبی کیڑوں کی چیر پھاڑ کرنے اور پرندوں کی کھال میں بھُس بھرنے کا فن بھی سیکھا۔

جب ڈارون کے باپ کو پتہ چلا کہ ڈارون کو ڈاکٹری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو اس نے بیٹے کو دینیات کی تعلیم کے لیے کیمبرج بھیج دیا (۱۸۲۸ء)۔ مگر ڈارون کو دینیات میں بھی کچھ لطف نہ آیا۔ وہ نیچرل سائنس کے پروفیسروں کے لیکچر سنتا اور حشرات الارض جمع کرتا رہا۔ اپنے اس شوق کا ماجرا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

> ''ایک روز کسی پرانے درخت کی چھال نکالتے ہوئے مجھے دو نہایت نادر قسم کے بیٹل (Beetle) نظر آئے۔ میں نے دونوں کو الگ الگ مٹھی میں بند کر لیا۔ اسی لمحے نئی قسم کا ایک اور بیٹل رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اس کو کھونا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے دائیں مٹھی والے بیٹل کو منہ میں رکھ لیا لیکن اس موذی نے میری زبان میں اتنے زور سے کاٹا کہ میں نے گھبرا کر اسے تھوک دیا''۔[11]

ڈارون نے کیڑوں مکوڑوں کا ذخیرہ کرنے کے لیے ایک آدمی بھی نوکر رکھ لیا تھا جو درختوں پر اور کشتیوں کے پیندوں پر جمی ہوئی کائی کھرچ کھرچ کر لاتا اور ڈارون اس کے اندر پرورش پانے والے کیڑوں کی درجہ بندی کرتا۔ اس طرح ڈارون نے کیڑوں کی بعض بڑی نایاب قسمیں دریافت

کیں۔ان کی تفصیلات حیوانیات کے ایک رسالے میں ڈارون ہی کے نام سے شائع ہوئیں۔

کیمبرج یونیورسٹی میں ڈارون کو اتفاق سے دو ایسے سائنس دان ملے جنھوں نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ایک ارضیات کے پروفیسر ایڈم سجوک(Adam Sedgwick) اور دوسرے نباتات کے پروفیسر جان ہنیسلو (John Hanslow)۔پروفیسر ہینسلو ہی کی سفارش سے ڈارون کو''بیگل'' جہاز پر جو جنوبی کرۂ ارض کے وسیع تحقیقاتی سفر پر جارہا تھا اعزازی نیچرسٹ کی نوکری مل گئی۔اس سفر نے ڈارون کی زندگی ہی بدل دی۔چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ''میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ میری حقیقی تربیت یا ذہنی تعلیم سب سے پہلے اسی سفر میں ہوئی''۔جہاز نے دسمبر ۱۸۳۱ء میں لنگر اٹھایا اور جنوبی امریکہ کی راہ لی۔یہ سفر بہت طویل اور سمندر بہت طوفانی تھا۔ پھر بھی ڈارون بڑی باقاعدگی سے اپنا روزنامچہ لکھتا رہا۔جنوری ۱۸۳۲ء میں بیگل نے بحر اٹلانٹک کے جزیرے Cape Verde میں لنگر ڈالا۔ڈارون نے وہاں کے جنگلوں میں گھوم کر کئی غیر معروف پودے جمع کیے۔جنوبی امریکہ کے سب سے جنوبی خطے میں ڈارون نے ایسے معدوم جانوروں کے ڈھانچے پتھروں میں جمے ہوئے دیکھے جن کی خبر کسی کو نہ تھی اور انھیں مجر جانوروں سے ڈارون کو پہلی بار ارتقا کا خیال آیا۔مگر ڈارون کو سب سے کارآمد معلومات جزیرہ گلاپاگوس (Galapagos) میں حاصل ہوئیں۔یہ جزیرے جنوبی امریکہ کے ساحل سے تقریباً آٹھ سو میل دور بحرالکاہل میں واقع ہیں۔وہاں کئی سمندری دھارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہاں گرم خطوں کے علاوہ قطبِ شمالی کے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ان جزیروں میں ڈارون نے بہت بڑے بڑے کچھوے اور گرگٹ دیکھے جو دنیا کے دوسرے خطوں میں اب بالکل ناپید ہیں۔ڈارون نے چودہ قسم کے جھینگوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ان میں سے ایک کی چونچ تو ہُدہُد سے بھی لمبی تھی۔ڈارون کو یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ گلاپاگوس کے پرندے جنوبی امریکہ کے پرندوں سے شکل وصورت میں بہت مشابہ ہیں۔حالانکہ یہ جزیرہ کبھی جنوبی امریکہ سے جڑا ہوا نہیں تھا اور دونوں کے درمیان آٹھ سو میل چوڑا سمندر حائل ہے۔ڈارون کو ایک جزیرے کے پرندوں اور دوسرے جزیرے کے پرندوں میں تھوڑا بہت تفاوت بھی نظر آیا۔ ڈارون نے ارجنٹائن کے چٹیل میدانوں، کوہ اینڈیز کی پہاڑیوں، چلی اور آسٹریلیا کی نمکین

جھیلوں، تھسیتی اور تیرادیل پوئیگو کے گھنے جنگلوں، بحرالکاہل کے مونگے کے جزیروں اوران میں رہنے والے پرندوں اور جانوروں کا بھی گہرا مطالعہ کیا اوران پس ماندہ قوموں کے رہن سہن اور جسمانی ساخت کو بھی دیکھا جو مہذب دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشوں میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ گلاپاگوس اور جنوبی امریکہ کے مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے ڈارون لکھتا ہے کہ:

''میرے دل پراس بات سے گہرا اثر پڑا کہ خشک و بے شجر میدانوں میں مجھے ان جانوروں کے ڈھانچے ملے جن کے بدن پر حفاظتی زرہیں بنی ہوئی تھیں نیز میں اس امر سے بھی بے حد متاثر ہوا کہ جنوب کی طرف بڑھیں تو ہر قدم پر نئے نئے پرندے ایک دوسرے کی جگہ لیتے چلے جا رہے تھے۔ ہر چند کے گلاپاگوس کی پیداوار میں جنوبی امریکہ کی زیادہ تر خصوصیات موجود ہیں لیکن جزیرے میں چیزوں کے درمیان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ فرق بھی پایا جاتا تھا۔ حالانکہ ارضیاتی اعتبار سے ان میں سے کوئی جزیرہ بھی زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوتا''۔

ڈارون اس یادگار سفر سے جانوروں اور پودوں کا بڑا نادر ذخیرہ اپنے ساتھ لایا۔ سیپ، گھونگے، تتلیاں، بھونرے، مچھلیاں، کیکڑے، گرگٹ اور چھپکلیاں، بھُس بھرے ہوئے پرند، معدوم جانوروں کی ہڈیاں اور ڈھانچے اور متحجرات (Fossils)۔ غرضیکہ ایسی ایسی عجوبہ چیزیں جن سے یورپ کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی واقف نہ تھا۔ ان کے علاوہ اس کے روزناچوں کے مندرجات بھی کم حیرت انگیز نہ تھے۔ جنوبی کرۂ ارض کے ان تجربوں اور مشاہدوں نے ڈارون کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کو ارتقائے حیات کا یقین ہوگیا۔ وہ انجیل کے اس دعوے کو پھر کبھی تسلیم نہ کر سکا کہ موجوداتِ عالم کو کسی طاقت نے ایک ہی وقت میں الگ الگ خلق کیا ہے۔

ڈارون کو معاش کی فکر نہ تھی کیونکہ اس کا باپ بہت دولت مند تھا لہٰذا وہ پوری یکسوئی سے سائنسی مشاغل میں مصروف ہوگیا۔ اس نے ضلع کینٹ کی ایک چھوٹی سی بستی ڈاؤن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تاکہ دیہات کے قدرتی ماحول میں پرورش پانے والے جانوروں اور پودوں کا بھی مطالعہ کر سکے۔ وہ آس پاس کے کاشت کاروں، مویشیوں کی نسل کشی کرنے

والوں، پھلواری کے مالیوں اور باغ بانوں سے ملتا اور بہتر نسل پیدا کرنے کے طور طریقوں کے بارے میں ان سے تبادلہء خیال کرتا۔

ڈارون کا خاص موضوع وہ جسمانی تبدیلیاں تھیں جو قدرتی یا مصنوعی حالات میں پرورش پانے سے پودوں اور جانوروں میں رونما ہوتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۳۷ء میں اس نے ان تبدیلیوں سے متعلق شواہد و واقعات کا خلاصہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ اپنے طریقہء کار کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ''میں بیکن کے استقرائی طریقوں کی تقلید کرتا تھا۔ میں نے بلا کسی کلیئے کے پالتو پیداواروں کے بارے میں کتابوں سے، مویشیوں کی عمدہ نسل کشی کرنے والے ماہروں سے اور باغ بانوں سے بات چیت کر کے یہ شواہد جمع کیے تھے۔ مجھ کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ جانوروں اور پودوں کی سفید نسلیں پیدا کرنے میں انسان کی کامیابی کی کنجی 'انتخاب' ہے۔ البتہ کچھ عرصے تک میرے لیے یہ بات ایک معمہ بنی رہی کہ قدرتی حالات میں رہنے والے اجسام پر اصولِ انتخاب کا اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے''۔[۱۲]

ڈارون ایک روز وقت گزاری کے لیے انگریز عالمِ اقتصادیات مالتھس (۱۷۶۶۔۱۸۳۴) کی کتاب ''آبادی کے اصول'' پڑھ رہا تھا۔ مالتھس کا دعویٰ تھا کہ آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے غذا کا سامان اس رفتار سے نہیں بڑھتا لہٰذا انسانوں کے درمیان جہد البقا جاری رہتی ہے۔ مالتھس کے خیال میں جنگ، سیلاب، قحط اور وبائیں وہ ''قدرتی ذرائع'' ہیں جن سے آبادی اور پیداوار میں توازن قائم ہوتا ہے۔ ''جانوروں اور پودوں کی عادتوں کا عرصے تک مطالعہ کرنے کی وجہ سے جہد البقا (Struggle for existence) کا نظریہ میرے لیے اچنبھے کی بات نہ تھا لہٰذا مجھ پر اچانک یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ جہد البقا کے دوران میں مفید تغیّرات (Variations) تو بچ جاتے ہوں گے البتہ ناموزوں تغیّرات ضائع ہو جاتے ہوں گے اور اس طرح (پودوں اور جانوروں کی) نئی نسلیں تشکیل پاتی ہوں گی۔''[۱۳]

ڈارون کو ایک کلیہ تو ہاتھ آ گیا مگر وہ بے حد محتاط اور منکسر المزاج سائنس داں تھا۔ وہ چار سال تک اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر قلم اس وقت اٹھایا جب اس کو یقین ہو گیا کہ ''انتخاب'' اور ''جہد البقا'' کے اصولوں کی روشنی میں اس نے ارتقائے حیات کا جو نظریہ

وضع کیا ہے وہ درست ہے۔ ابتدا میں اس نے ۳۵ صفحوں کی ایک یادداشت تیار کی۔ یہی مسودہ بڑھتے بڑھتے ۲۳۰ صفحوں کا ہوگیا مگر ڈارون پھر بھی اس کی اشاعت پر آمادہ نہ ہوا۔ البتہ اس دوران میں اس کی کئی کتابیں شائع ہوئیں (بیگل جہاز کے سفر کا روزنامچہ ۱۸۳۹ء، مونگے کی چٹانوں کی بناوٹ، ۱۸۴۲ء، آتش فشانی جزیرے، ۱۸۴۴ء، جنوبی امریکا کی ارضیاتی تحقیق، ۱۸۴۶ء، جہازوں کے پیندے میں چپکنے والے سمندری کیڑے، ۱۸۵۱ء، ۱۸۵۴ء، حیوانی پودے، ۱۸۵۷ء۔)

آخر جب دوستوں کا اصرار بہت بڑھا تو ڈارون ارتقائے حیات پر اپنے خلاصوں کو کتابی شکل دینے بیٹھ گیا لیکن کام ابھی ادھورا تھا کہ ۱۸۵۸ء کی گرمیوں میں ڈارون کو الفریڈ والیس (Wallace) کا ایک مقالہ ملا جس میں والیس نے ارتقائے حیات کے بارے میں وہی نظریات بیان کیے تھے جو ڈارون کے تھے۔ والیس کئی سال تک جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں رہ کر جانوروں اور پودوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ڈارون کی طرح وہ بھی سفر سے بے شمار نوادر لے کر لوٹا تھا لیکن جہاز میں آگ لگ گئی اور اس کا سارا اثاثہ ضائع ہوگیا۔ اُن دنوں وہ ملایا میں مقیم تھا اور وہاں کے قدیم باشندوں کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا۔ والیس بھی ڈارون کی مانند نام ونمود سے گریز کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ڈارون کو لکھا تھا کہ اگر آپ کو یہ مقالہ پسند آئے تو مہربانی کر کے پروفیسر لائل کو پڑھنے کے لیے دے دیں۔

والیس کا مقالہ پڑھ کر ڈارون بڑے شش وپنج میں پڑ گیا۔ کیونکہ یہ بات اب واضح ہوگئی تھی کہ دونوں سائنس دان اپنی اپنی تحقیق سے ارتقا کے بارے میں ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ آخر ڈارون نے پروفیسر لائل کے مشورے سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء کو اپنا مسودہ اور والیس کا مضمون علمائے سائنس کی انجمن (Linnean Society) کے روبرو پیش کر دیا۔ یہ دونوں مقالے انجمن کے رسالے میں شائع ہوئے مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔

اب حالات نے ڈارون کو اپنی کتاب جلد از جلد مکمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کتاب ''انواع کی ابتدا'' (Origin of species) کے نام سے ۱۸۵۹ء میں چھپی اور اتنی مقبول ہوئی کہ پہلا ایڈیشن ایک ہی دن میں بک گیا۔

''انواع کی ابتدا'' اُن تاریخ ساز تصنیفوں میں سے ہے جن سے فکرِ انسانی کے دھارے

بدل جاتے ہیں۔اس وقت تک زندگی کے بارے میں سائنسی زاویہ نظر قریب قریب مفقود تھا حتیٰ کہ لمارک کا سا نیچری بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتے وقت ماورائی اصولوں کا سہارا لیتا تھا۔ڈارون نے اپنی کتاب میں کسی مابعدالطبیعیاتی عنصر کا سہارا نہیں لیا بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو قدرتی مظاہر مان کر ان کے قدرتی اسباب تلاش کیے اور ایسے کلیے بنائے جن کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربے سے کرسکتا ہے۔اپنی تحقیق کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ڈارون لکھتا ہے کہ:

''یہ خیال کہ ہر نوع الگ الگ خلق ہوئی ہے غلط ہے۔مجھے کامل یقین ہے کہ انواع ناقابلِ تغیُّر (Immutable) نہیں ہیں بلکہ وہ انواع جو ایک ہی جنس (Genra) سے تعلق رکھتی ہیں کسی معدوم شدہ دوسری نوع کی براہِ راست نسل سے ہیں۔جس طرح کہ کسی ایک نوع کی تسلیم شدہ قسمیں ایک ہی نسل سے ہوتی ہیں۔مزید برآں مجھے یقین ہے کہ نوعی ترمیم و تغیّر کا سب سے اہم ذریعہ 'قدرتی انتخاب' رہا ہے لیکن واحد ذریعہ نہیں''۔

ڈارون کا مرکزی مقدمہ یہ ہے کہ ارتقا ''قدرتی انتخاب'' (Natural Selection) کے ذریعے ہوا۔پودوں اور جانوروں نے زندہ رہنے کے لیے قدرتی انتخاب کا طریقہ اختیار کیا کیونکہ بدلتے ہوئے ماحول اور دوسری انواع سے بلکہ خود اپنے ہم جنسوں سے مقابلے کے دوران میں وہی انواع زندہ رہ سکتی ہیں جن میں قدرتی انتخاب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ڈارون قدرتی انتخاب کو ارتقا کی ''حرکی قوت'' سے تعبیر کرتا ہے۔جن جانوروں یا پودوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ فنا ہو جاتے ہیں۔

قدرتی انتخاب کی تشریح کرتے ہوئے ڈارون لکھتا ہے کہ:

''ہر نوع کے افراد جتنی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں اتنے زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا وہ تحفُّظِ ذات کے لیے برابر جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی فرد زندگی کے پیچیدہ اور بعض اوقات تغیُّر پذیر حالات میں اگر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی غرض سے اپنے آپ میں تھوڑی تبدیلی بھی کرلے تو اس کی بقا کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔اس طرح یہ تبدیلی قدرتی طور پر منتخب ہو جاتی ہے اور یہ

منتخب شدہ وراثتی اصولِ وراثت کے مطابق اپنی نئی اور ترمیم شدہ ہیئت کی افزائش کا باعث بن جاتی ہے"۔[۱۴۱]

ڈارون نے "قدرتی انتخاب" کے اصولوں کی تشریح مصنوعی انتخاب کے حوالے سے کی۔ مصنوعی انتخاب سے مراد پودوں اور جانوروں کی نئی یا بہتر قسم کی نسل تیار کرنے کی وہ تدبیریں ہیں جو انسان اپنے فائدے کی خاطر اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ گزشتہ دس ہزار برس کے عرصے میں انسان نے جنگلی جانوروں، درختوں اور بوٹوں پر تجربے کر کے بے شمار نئی قسمیں پیدا کی ہیں جو قدرتی حالات میں موجود نہ تھیں۔ بعض اوقات ان مصنوعی پیداواروں اور ان کی ہم جنس قدرتی پیداواروں میں اتنا تفاوت ہوتا ہے کہ ناواقف شخص یقین ہی نہیں کر سکتا کہ قدرتی اور مصنوعی کے درمیان کوئی رشتہ ہے۔ مثلاً انجان آدمی یہ مشکل سے باور کرے گا کہ ہمارے روزمرّہ استعمال میں آنے والی گندم اور جو نوعی اعتبار سے جنگلی گھاسوں کی نسل سے ہیں۔ یہی حال گائے، بھیڑ، کتے، کبوتر اور دوسرے پالتو جانوروں کا ہے جن کی ابتدائی شکل وصورت موجودہ شکل وصورت سے بہت مختلف تھی۔ اس قسم کے تجربے آج بھی ہوتے رہتے ہیں اور دو ہم جنس درختوں میں پیوند کر کے نئے درخت پیدا کرنا یا دو ہم جنس جانوروں کو جوڑا کھلا کر نیا جانور پیدا کرنا افزائش نسل کے ماہروں کا روزمرّہ کا مشغلہ ہے۔ ماہرینِ زراعت چاول، گیہوں، چنا اور مٹر وغیرہ کے عمدہ سے عمدہ بیج تیار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تا کہ پیداوار کی فی ایکڑ مقدار بڑھے۔

ڈارون کا کہنا تھا کہ قدرت میں زراعت یا حیوانات کے ماہر نہیں ہوتے جو پرانی نوعوں میں تبدیلی کر کے نئی نوع پیدا کرتے ہوں۔ البتہ انتخاب کا یہ کردار خود قدرت ادا کرتی ہے۔ انتخاب یعنی جسم میں ترمیم یا تبدیلی کا عمل "بقائے اصلح" کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔

ڈارون نے ارتقا کے حق میں ناقابلِ تردید واقعات و شواہد کا انبار لگا دیا اور بے شمار معدوم و موجود جانوروں اور پودوں کی مثالوں سے ثابت کر دیا کہ ان نامیاتی اجسام کو کسی نے خلق نہیں کیا ہے اور نہ وہ ناقابلِ تغیّر ہیں بلکہ رزم گاہِ ہستی میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے جسم اور عادت و اطوار میں ضروری تبدیلیاں کرتے رہے ہیں۔ یہ تبدیلیاں نئی نسلوں میں منتقل ہوتی

رہی ہیں یہاں تک کہ وہ خود نئی نوع کا باعث بن گئی ہیں۔ البتہ ڈارون نے ''انواع کی ابتدا'' میں انسان کی نوعی ابتدا و ارتقا کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا۔ بس اتنا اشارہ کر دیا کہ ''آئندہ زیادہ اہم تحقیق کے لیے میدان کھلا ہے اور انسان کی ابتدا اور تاریخ پر بہت روشنی پڑے گی''۔۱۵ مگر ڈارون کی یہ احتیاط کام نہ آئی۔

''انواع کی ابتدا'' کا شائع ہونا تھا کہ اعتقاد کی دنیا میں بھونچال آ گیا۔ ہر چند کہ ڈارون نے اپنی کتاب میں ارتقائے آدم سے بحث نہیں کی تھی مگر پادریوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقا انجیل کے عقیدۂ تخلیق پر زبردست حملہ ہے۔ پادریوں کا تو ذکر ہی کیا بہت سے سائنس دانوں کو بھی ڈارون کی یہ جسارت پسند نہیں آئی حتیٰ کہ ڈارون کی اپنی درس گاہ ٹرینٹی کالج کیمبرج کے منتظمین نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ ''انواع کی ابتدا'' کا کوئی نسخہ کالج کے کتب خانے میں نہ رکھا جائے۔ اخباروں کے ایڈیٹر ڈارون کے خیالات کو دلیلوں سے تو رد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے طنز و تمسخر سے کام لیا اور ڈارون کے کارٹون چھاپ کر اپنے دل کو تسکین دی۔ خوش قسمتی سے ڈارون کو ٹامس ہکسلے اور چارلس لائل جیسے سائنس دانوں کی پوری پوری حمایت حاصل تھی۔ انھوں نے ڈارون پر ہونے والے تمام اعتراضوں کا مسکت جواب دیا اور آخر کار سچ جیتا اور جھوٹ کو منہ کی کھانی پڑی۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں ڈارون کا نظریہ ارتقا طلبا کے نصاب میں داخل نہ ہو۔

ڈارون نے ارتقائے انسانی کے بارے میں اپنا نظریہ ''انواع کی ابتدا'' کے بارہ سال بعد شائع کیا اور اس کا نام ''انسان کی پیڑھی'' (Descent of Man) رکھا۔ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ ''اس کتاب کا واحد مقصد اولاً اس بات پر غور کرنا ہے کہ آیا انسان بھی دوسری انواع کی مانند کسی معدوم جسم کی نسل سے ہے یا نہیں، دوئمش انسان کے ارتقا کا طریقہ کیا رہا ہے اور سوئمش انسان کی نام نہاد نسلوں کے مابین اختلافات کی حیثیت کیا ہے''۔۱۶

ڈارون کہتا ہے کہ یہ خیال کہ دوسری انواع کی طرح انسان بھی کسی قدیم، پست اور معدوم جانور کی نسل سے ہے نیا نہیں ہے بلکہ لمارک اور اس کے بعد ہکسلے، لائل، ووگٹ، لبک اور ہیکل بھی اسی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔

ڈارون نے اس مشابہت کے ثبوت میں جو انسانوں اور جانوروں میں پائی جاتی ہے بکثرت شواہد پیش کیے۔ مثلاً انسان کے جسم کی بناوٹ ویسی ہی ہے جیسی دوسرے دودھ پینے والے (Mammals) جانوروں کی ہے۔ اس کی ہڈیوں کا نظام وہی ہے جو بندر، چمگادڑ اور سیل مچھلی کا ہے۔ یہی حال اس کی رگوں، پٹھوں، اعصاب اور خون کے خانوں کا ہے اور انسان کا دماغ بھی دوسرے جانوروں کے دماغ کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان اور دوسرے حیوانات لبونہ میں تولیدِ نسل کا طریقہ۔ کورٹ شپ سے لے کر زچگی اور پرورش تک یکساں ہے۔ یہی نہیں بلکہ مادہ کے رحم میں جنین کی ترقی کا انداز بھی دونوں میں ایک ہے۔ ان کی بیماریاں مثلاً جذام، ہیضہ، مرگی وغیرہ بھی مشترک ہیں اور ان کا علاج بھی یکساں ہے۔ اسی طرح دونوں کے زخم بھی ایک ہی انداز میں بھرتے ہیں۔ ان مشابہتوں سے ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان اور دوسرے جانوروں پر قدرتی قانون یکساں لاگو ہوتے ہیں۔

ڈارون نے شواہد سے ثابت کیا کہ انسان کی جسمانی بناوٹ اور ذہنی صلاحیتوں میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں انھیں قوانین کے ماتحت ہیں جو پست درجے کے جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں، نئی انسانی نسلوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ ڈارون نے بتایا کہ ان تبدیلیوں کے اسباب بھی وہی ہیں جو دوسرے اجسام میں تبدیلیوں کے ہیں۔ اس کے علاوہ نسلِ انسانی بھی جہد البقا کے قانون کے تابع ہے۔ چنانچہ انسان نے بھی اس جہد کے دوران میں اپنے جسم اور دماغ میں ہونے والی مفید تبدیلیوں کو محفوظ کیا اور مضر کو رد کر دیا۔

سائنس نے گزشتہ سو سال کے عرصے میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ پودوں اور جانوروں پر کیا منحصر ہے پورے کرۂ ارض کی تشکیل اور عہد بہ عہد ارتقا کی تاریخ مرتب ہو گئی ہے اور اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ انسان بوزنہ ہی کی نسل کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس حقیقت کی مزید تصدیق ابتدائی انسان کے ان آثار سے ہوتی ہے جو گزشتہ اسّی نوے سال میں ایشیا اور افریقہ میں دریافت ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی دریافت ۱۸۹۱ء میں جاوا میں ایک ولندیزی ڈاکٹر دوبوائے (Eugene Dubois) کی تھی۔ اس کو جاوا کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بڑی تلاش کے بعد ایک کھوپڑی، ران کی ایک ہڈی اور دو دانت ملے۔ ان آثار کے سائنسی

مطالعے سے ایک ایسے جانور کا ڈھانچہ تیار کیا جاسکا جو موجودہ انسان اور بوزنہ (Ape) کی درمیانی کڑی تھا اور تقریباً دس لاکھ برس گزرے اس سرزمین پر موجود تھا۔ اس کی بھوؤں کی ہڈی موٹی تھی اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، ماتھا تنگ تھا۔ جبڑے بہت مضبوط، دانت بہت تیز، سینہ چوڑا اور کمر پتلی تھی اور اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ کے قریب تھا۔ وہ پاؤں کے بل قدرے جھک کر چلتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں پیکنگ کے قریب ایک غار میں نر، مادہ اور بچوں کے کئی درجن ڈھانچے ملے جو جاوا کے قدیم باشندوں سے نسبتاً کم پرانے ہیں۔

مشرقی افریقہ میں پروفیسر لیکی تیس سال تک ابتدائی انسان کے آثار کی تلاش میں مصروف رہے۔ اپنی دریافتوں کی بنا پر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مشرقی افریقہ کا ابتدائی انسان جاوا کے ابتدائی انسان سے بھی کئی لاکھ برس پرانا ہے۔ حال ہی میں ییل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ پل بیم (David Pillbeam) نے ایک مکمل جبڑا پوٹھوہار میں دریافت کیا جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک کروڑ برس پرانا ہے اور ایک ایسے جانور کا ہے جو بوزنہ اور انسان کی درمیانی کڑی ہے۔ (Rama Pithecus)۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی باقیات ہندوستان میں ۱۹۱۰ء میں، افریقہ میں ۱۹۶۲ء، یورپ میں ۱۹۷۲ء اور ترکی میں ۱۹۷۴ء میں دریافت ہو چکی ہیں۔ ۱۷

غرضیکہ سائنسی دریافتوں اور تجربوں کی مدد سے کائنات کی نوعیت اور اس کے وجود و ارتقا کے جو نظریات وضع ہوئے ہیں ان کی روشنی میں تخلیق کے پرانے عقیدے اب داستانِ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

حوالہ جات

1. John Burnet, *Early Greek Philosophy*, New York, 1957, p. 70, and Will Durant, *The Life of Greece*, New York, 1939, pp. 134-9

2. Benjamin Farrington, *Greek Science,* Pelican, 1953, p. 60

3. Will Durant, *op.cit,* p. 365

4. Ibid.

5. Aristotle, History of Animals viii, quoted in Durant.

6. Will Durant, *op.cit,* p. 530.

7. Charles Darwin, *Origin of Species,* New York, 1962, p.15

8. Ibid.

9. Stephen F. Mason, *A History of Science,* New York, 1970, p. 326.

10. Charles Darwin, *Autobiography,* New York, 1958, p.6

11. Ibid, p.21

12. Ibid, p.42

13. Ibid, p.43

14. Charles Darwin, *Origin of Species,* p.27.

15. Ibid, p. 483.

16. Charles Darwin, *Descent of Man,* p.2.

17. Dawn, 11 March 1976.

چودھواں باب

تقدیر اور لوحِ تقدیر

ہم نے کسی سابقہ باب میں قسمت، بھاگ اور تقدیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تصور دراصل انسانی معاشرے کے شکاری دور کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں ہر قبیلے کے اندر ایک شخص شکار تقسیم کرنے پر مقرر ہوتا تھا۔ یہ شخص عام طور پر قبیلے کا سب سے سن رسیدہ یا بزرگ شخص ہوتا تھا اور سب لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ قبیلے کی زندگی چونکہ قدیم اشتراکی اصولوں پر چلتی تھی اس لیے یہ ضروری نہ تھا کہ جس شخص نے شکار کیا ہو اس کو زیادہ حصہ ملے یا جو شخص شکار میں ناکام رہا ہو اسے کچھ نہ ملے بلکہ شکار کو ہر گھر کی ضرورت کے مطابق بانٹا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں شکار تقسیم کرنے والے کا رتبہ قبیلے والوں کی نظر میں رزق دینے والے کا ہوتا تھا۔ قبیلے کا کوئی فرد اس کے فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔

جب شکاری دور گزر گیا اور زراعتی دور آیا تو شکار تقسیم کرنے والے کا منصب بھی لامحالہ ختم ہو گیا لیکن خیالات جو چیزوں سے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں وہ آسانی سے نہیں مرتے لہٰذا رزق تقسیم کرنے والے کا تصور بدستور زندہ رہا، البتہ اس تصور کو دیوی دیوتاؤں سے منسوب کر دیا گیا اور عقیدت مندوں کو ان دیوتاؤں میں رزّاق اور بھگوان کے اوصاف نظر آنے لگے۔

اور جب تحریر کا فن ایجاد ہوا اور بادشاہوں کے فرمان، عدالتوں کے فیصلے، معبدوں کے حساب کتاب اور دیوتاؤں کے بھجن گیت اور منتر مٹی کی لوحوں پر لکھے جانے لگے تو انسان کی تقدیر کے لیے بھی لوح وضع کر لی گئی۔ اس لوح کا لکھا ہوا کوئی نہیں مٹا سکتا تھا کیونکہ پرانی قوموں کے عقیدے کے مطابق قسامِ ازل نے ہر شخص کی قسمت کو پہلے ہی سے ایک لوح پر لکھ دیا ہے اور یہ لوح انسانی دسترس سے محفوظ ہے۔

اس عقیدے کو پرانے سماج کے زرعی نظام نے اور پختہ کر دیا تھا۔ کیونکہ زراعت کے پیشے کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ کاشت کار اپنے آپ کو قدم بہ قدم مجبور اور پابند بناتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ماحول کا غلام اور اپنے موسم کا اسیر رہتا ہے۔ اس کے کام میں اس کی مرضی اور خواہش کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ حالانکہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے موسمی تغیرات سے براہِ راست متاثر نہیں ہوتے اور نہ بارش کی کمی یا کثرت سے ان کے معمولات میں کوئی فرق آتا ہے۔ باہر برف گر رہی ہو یا اولے پڑ رہے ہوں، دھوپ نکلی ہو یا رات کا گھپ اندھیرا ہو، ان کی مشینیں بدستور چلتی رہتی ہیں لیکن کاشت کار ہر لمحے موسم کے رحم و کرم پر رہتا ہے اور اس کے اوقات کار ہمیشہ موسم کے پابند ہوتے ہیں۔ پھر رسم و رواج کی زنجیریں ہوتی ہیں جن میں کاشت کار سدا جکڑا رہتا ہے۔ ان خارجی مجبوریوں کا اثر اس کے خیالات اور جذبات پر بھی پڑتا ہے۔ وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے قطعہء آراضی سے بھی بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

مطلق العنان بادشاہوں کا نظام اس پر مستزاد تھا۔ اس نظام میں بادشاہ کی اطاعت ہر شخص کا فرضِ منصبی تھا۔ کوئی شخص بھی اپنی مرضی کا مالک و مختار نہ تھا اور نہ بہ حیثیت فرد اس کے کچھ حقوق تھے۔ تمام حقوق کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات تھی اور تمام فرائض کا مرکز اس کی رعایا۔ مگر اطاعت کا یہ فرض بادشاہ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ مثلاً بیوی اپنے شوہر کی اطاعت پر مجبور تھی، گھر والے بزرگِ خاندان کی اطاعت پر مجبور تھے، غلام اپنے آقا کی اطاعت پر مجبور تھا، پجاری اپنے پروہت کی اطاعت پر مجبور تھا، کاشت کار اپنے زمیندار کی اطاعت پر مجبور تھا، کارگہ کا مزدور اپنے مالک کی اطاعت پر مجبور تھا۔ غرضیکہ ہر چہار جانب اطاعت کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور انسان کے لیے اس جال سے نکلنا محال تھا۔ حد تو یہ تھی کہ بعض ملکوں میں (مصر) آبائی پیشہ ترک کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور اگر کوئی شخص ایسا کرتا تو اس کی سزا موت تھی۔

یہ تھے وہ اسباب اور محرکات جن کے باعث قدیم معاشرے نے عقیدۂ تقدیر میں پناہ لی۔ حالانکہ یہ عقیدہ ایسی افیون تھا جس نے لوگوں کے ارادوں، حوصلوں اور قوائے عمل کو اور بھی

مضمحل کر دیا۔ البتہ اربابِ اقتدار اور ان کے پروہتوں اور نقیبوں کو اس سے بڑے فائدے پہنچے۔ کیونکہ اس عقیدے کی موجودگی میں کوئی شخص اصلاح حال کی جراءت نہیں کر سکتا تھا بلکہ اپنی تقدیر ہی پر قانع رہنے میں عظیم دیوتا کی خوشنودی دیکھتا تھا۔

سومیری اور عکادی دیو مالا میں لوح تقدیر کا کاتب اور محافظ اِن لیل تھا۔ اس کے اقتدار کی سب سے بڑی علامت یہی لوح تھی۔ اس لوحِ تقدیر کی بدولت اِن لیل کو انسانوں کی زندگی اور موت پر پورا پورا اختیار حاصل تھا مگر ظلمات یعنی بدی کی طاقتیں لوحِ تقدیر کی گھات میں لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ ایک بار ظلمات کا پرندہ جس کا نام زُو تھا کسی نہ کسی طرح عرش پر پہنچ گیا۔ وہاں اِن لیل کے دربار کی شان وشوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

زُو نے اِن لیل کی بادشاہت کے ٹھاٹھ دیکھے۔
اس کی فرماں روائی کا تاج اور اس کی زرق برق پوشاک دیکھی
وہ تقدیر کی لوح کو گھورنے لگا۔
اور اس کے دل میں اِن لیل کے شاہی نشان کو چرانے کا خیال آیا۔
''میں تقدیر کی تختیوں پر قبضہ کروں گا۔
اور تمام دیوتاؤں کا آقا بن جاؤں گا۔
میں اپنے تخت کو مضبوط کروں گا۔
اور سیاہ وسفید کا مالک بن جاؤں گا۔''
اس کے دل نے جب دغابازی کی یہ سازش کرلی
تو وہ معبد کے دروازے پر دن نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔
اور جس وقت اِن لیل پاک پانی میں غسل کر رہا تھا
اور اس نے اپنا تاج سر سے اتار کر تخت پر رکھ دیا تھا
تو زُو نے تقدیر کے لوحوں پر چپکے سے قبضہ کرلیا
اور اِن لیل کی بادشاہت کو لے کر اڑ گیا۔
اور اپنے پہاڑ میں جا چھپا

تب خدائی قانون ساقط ہو گئے
اور ہر طرف اندھا کر دینے والی روشنی پھیل گئی
اور سناٹا چھا گیا اور مندر میں اندھیرا ہو گیا۔
خداوند اِن لیل کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا
اور سب دیوتا حیران اور فکر مند تھے
پس وہ سب عظیم دیوتا اَنو کے گرد جمع ہوئے
اور انو نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا
اور دیوتاؤں سے یوں مخاطب ہوا
"میرے بچو! تم میں سے کون زُو کو ہلاک کرنے کا عہد کرے گا
اور نام و نمود کا مستحق ہوگا۔"
دیوتاؤں نے آب پاشی کے دیوتا اداد کو جو انو کا بیٹا تھا پکارا:
اور وہ حکم دیتا ہے (انو) اداد سے یوں مخاطب ہوا:
"اے اداد تو جو فاتحِ اعظم ہے اور جس کے حملوں کی کوئی تاب نہیں لا سکتا
اپنے ہتھیاروں سے زو پر بجلی گرا
تیرا نام سب دیوتاؤں میں افضل ہوگا
اور تیرا کوئی ثانی نہ ہوگا"

اداد نے جواب دیا: اے میرے باپ!
پہاڑ کے اَن جان راستوں پر کون دوڑے گا؟
تیرے بیٹوں میں کون زُو کی ہمسری کی تاب لا سکے گا؟
اس نے تو ایک دیوتا کو اس کی بادشاہت سے محروم کر دیا ہے اور اب
تقدیر کی لوحیں اس کی قبضے میں ہیں
اب کون اسے انصاف کے دروازے پر لا سکے گا؟
اس کا حکم اب اِن لیل کے حکم کی مانند ہے

جواس سے لڑنے جائے گا وہ مٹی بن جائے گا
پس اَنو نے ! اسے مہم پر جانے سے روک دیا۔ تب دیوتاؤں نے عشتار کے بیٹے
شارا کی طرف رجوع کیا جو آگ کا دیوتا تھا لیکن اس نے بھی معذرت کر دی
تب اِیا (اِن لیل) نے مَمی سے جو آلات کی دیوی ہے فریاد کی:
''اپنے چہیتے بیٹے نن گرسو کو بلا جو طاقت ور ہے۔
جس کا سینہ چوڑا ہے اور جس کے قبضے میں ساتوں ہوائیں ہیں''
مَمی نے اِیا کی درخواست منظور کر لی
اور زمین کے دیوتا خوش ہو کر مَمی کے پاؤں چومنے لگے
اور مَمی نے اپنے چہیتے بیٹے سے کہا:
''میں نے درد سے تڑپ تڑپ کر آسمان کے دیوتاؤں کو جنا ہے
اور یہی دیوتا روشنی پھیلاتے ہیں
آسمان کی بادشاہت خداوند اَنو اور میرے بھائی اِن دیل کے لیے ہے
پس تو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر
اور بھگوڑے زُو کو رام کر
اور زمین کو جسے میں نے پیدا کیا ہے شانتی دے اور
زُو کا گھونسلا برباد کر دے
اور اس کے دل کو خوف سے بھر دے
تاکہ وہ تیرے حملے کی ہیبت سے کانپنے لگے
میں نے اس کے خلاف بگولے بند کر دیے ہیں
کمان کو کھینچ اور تیروں کو زہر کا پیام بر بنا
اپنے جنگی نعروں سے زُو کا دل ہلا دے
تاکہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جائے
اور اس کی بینائی جاتی رہے

اسے میدانِ جنگ سے بھاگنے نہ دینا
بلکہ اس کے شہ پر توڑ دینا
اپنی شکل بھوت کی سی بنا لینا
اور طوفان لانا تا کہ وہ تجھے پہچان نہ سکے
اس کی سانس کو ہلاک کر دینا
میری دعا ہے کہ دن کی روشنی اس کے لیے غم کا اندھیرا ثابت ہو
اور آندھیاں اس کے پروں کو نامعلوم جگھوں پر بکھیر دیں
تا کہ بادشاہت ایکور میں دوبارہ واپس آ جائے
اور قانون کے معمولات تیرے باپ کے پاس لوٹ آئیں
جس کے نطفے سے تو پیدا ہوا ہے
اور مندر دوبارہ بنیں اور بلند ہوں
اور چاروں کونوں پر پوجا کی جگہیں دوبارہ قائم ہوں"
جب نن گرسو نے اپنی ماں کی یہ تقریر سنی
تو اس کا حوصلہ بڑھا
اور وہ پہاڑ کی جانب روانہ ہو گیا۔
اور جو ساتوں ہواؤں کو لگام دیتی ہے
اور ساتوں بگولوں کو (جو دھول کو نچاتے ہیں) حکم دیتی ہے
اس نے سب کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ کر دیا
عرش کی ہوائیں نِن گرسو کے ہمراہ تھیں
اور وہ زُو کے پہاڑ کی ڈھلوان پر نمودار ہوا
اور جب زُو نے نن گرسو کو دیکھا تو وہ اس کی طرف لپکا
اور شیر کی مانند ہونکا
اور اس نے بہادر نن گرسو کو للکار کر کہا

''میں قانون کی سب تختیاں اٹھالایا ہوں
بول، تو کون ہے جو مجھ سے لڑنے آیا ہے''
بہادر نن گر سو نے اپنا منھ بولنے کے لیے کھولا
اور زُو کو جواب دیا
''میں دُرانکی (اِن لیل) کے حکم سے جو تقدیروں کا فیصلہ کرتا ہے
تجھے کچلنے آیا ہوں
تو پہاڑی لٹیرا ہے اور عنقریب تو اپنے خون میں نہائے گا''
اپنی ماں کے حکم اور آنو کی اجازت سے
اس نے زُو پر تیر چلایا
لیکن زُو نے پکار کر کہا کہ
''او تیر! تو جو اس طرف آرہا ہے
اپنے ترکش میں لوٹ جا!''
اور تیر زُو کے قریب نہیں آیا
بلکہ زُو کی حکم سے واپس چلا گیا۔
کیونکہ زُو کے ہاتھ میں تقدیر کی لوحیں تھیں
نن گر سو نے اداد کو طلب کیا
اور اس سے کہا کہ عرش پر جا اور
جو ماجرا تیری آنکھوں نے دیکھا ہے
وہ اِیا سے بیان کر
اور اداد نے اِیا سے کہا کہ
''اے آقا! یوں ہوا کہ نن گر سو نے زُو کو زچ کر دیا تھا
اور وہ زُو کے مسکن پر حملے کر رہا تھا
اور اس نے تیر چلایا تھا

لیکن زُو نے لوحِ تقدیر کو ہاتھ میں لے کر اونچا کر دیا
اور تیر کو ڈانٹا تو تیر واپس لوٹ آیا
اور لڑائی تھم گئی
اور ہتھیار بے کار ثابت ہو گئے
نن گرسوزُو کو رام نہ کر سکا"
ایا نے یہ باتیں سن کر ادادلو کچھ راز کی باتیں بتائیں اور کہا کہ
"میں نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے
اس کو میرے بیٹے کے روبرو دہرانا
اور کہنا کہ ہراساں نہ ہو
اور نہ جنگ میں نرمی دکھا
بلکہ دھات کے چھلّے کی شست بنا
اور اس کی مدد سے تیر چلا
اور زُو کی ڈینے اور بازو شل کر دے
اور جس وقت وہ اپنے بازوؤں کی طرف دیکھے گا۔
تو اس کی گویائی سلب ہو جائے گی۔
پھر وہ تیروں کو واپسی کا حکم نہ دے سکے گا۔
گو وہ لاکھ گرجے کہ "پرَ کے او پرَ"
مگر تو خائف مت ہونا۔
اس کے سینے کو اپنے تیروں کا نشانہ بنانا
اور تیرے تیر بجلی کی مانند اڑ کر جائیں گے۔
اور اس کے پر اور پنکھ تتلی کی مانند پھڑ پھڑائیں گے
اس کے سانس کو برباد کر دینا اور اسے رام کر لینا
اور ہوائیں اس کے بازوؤں کو نامعلوم جگہوں پر اڑا لے جائیں گی۔

تاکہ بادشاہت دوبارہ ایکور میں داخل ہو
اور قانون تیرے باپ کو واپس آ جائیں۔
اور مندر کی عمارتیں بلند ہوں
اور تیرے مذہب کی ریت چاروں کونوں میں پھیلے۔
اور تیرا نام دیوتاؤں میں اونچا ہو۔"

نن گرسو نے اَیا کے مشوروں پر عمل کیا اور زُو کے پر توڑ دیے اور اس طرح تقدیر کی لوحیں دوبارہ ان لیل کے قبضے میں آ گئیں۔

یہ عقیدہ کہ ہر شے کی تقدیر پہلے سے مقرر ہے اور نوشتہء تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی پرانی قوموں میں صدیوں تک رائج رہا حتیٰ کہ حکمائے یونان بھی کسی نہ کسی شکل میں تقدیر کے قائل تھے۔ اپی کیرس (EPICURUS) (۳۴۲ ق م۔۲۷۰ ق م۔) غالباً پہلا ممتاز فلسفی ہے جس نے دیمقراطیس کی پیروی کے باوجود انسان کو اپنے فعل کا مختار ٹھہرایا۔

اسلام کا رجحان بھی تقدیر کی جانب ہے۔ غالباً اس وقت کا مروّجہ عقیدہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں متعدد آیتیں ایسی ملتی ہیں جن سے تقدیر کے حق میں استنباط کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یُّرِدْکَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (۱۰۷)	اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچا دے تو بجز اس کے اور کوئی تکلیف کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں ہے بلکہ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے مبذول فرما دے اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والا ہے۔

اور سورۂ الزمر میں فرماتا ہے کہ:

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِی انْتِقَامٍ (۳۷)

اور جس کو وہ ہدایت دے اس کا کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا خدا زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے؟۔

اور سورۂ الحدید میں لکھا ہے کہ:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. (۲۲)

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ میں۔ مولانا اشرف علی تھانوی) لکھی ہے قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں جو اللہ کے نزدیک آسان کام ہے۔

اس آیت سے تو یہ بھی واضح ہے کہ زمین پر اور انسانوں پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ ایک کتاب میں مصیبت آنے سے پہلے ہی لکھی ہوتی ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ احسن التفاسیر نے علمائے تفسیر کے چار قول نقل کیے ہیں اور چاروں میں لوح محفوظ پر تحریر کا ذکر موجود ہے۔ آخر میں مصنف نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ اس آیت سے قدریوں کی غلطی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ''اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ میں علم ازلِ الٰہی کے موافق پہلے سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے موافق ہوتا ہے۔''[۱]

احادیثِ نبویؐ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول صلعم بھی تقدیر کے قائل تھے چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں تقدیر کی تائید میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں۔ اس کے برعکس ایسی ایک حدیث بھی موجود نہیں جس سے قدریوں کی حمایت کا پہلو نکلتا ہو، کئی حدیثیں تو ایسی ملتی ہیں جن میں قدریوں کی صاف مذمت کی گئی ہے۔

مثلاً صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ ابنِ عمر سے مروی ہے کہ

قال قال رسول اللہ صلعم کتب اللہ مقادیر الخلائق ان یخلق السموات و الارض لخمسین الف سنة.

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے مخلوقات کے مقدر آسمان اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار برس قبل لکھ دیے تھے۔[۲]

اور ابو ہریرہؓ سے متفق علیہ روایت ہے کہ:

قال قال رسول اللہ صلعم ان اللہ کتب علی بن آدہ حظه من الزنا ادرک ذالک لامحالة

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ زنا میں ابنِ آدم کا جو حصہ ہے اسے اللہ نے تحقیق پہلے سے لکھ دیا ہے۔[۳]

امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ تینوں نے ابنِ دیلمی کا قول نقل کیا ہے کہ ایک روز میں ابی ابن کعب کے پاس گیا اور کہا کہ میرے ذہن میں تقدیر کے بارے میں چند شکوک پیدا ہوئے ہیں لہٰذا آپ کوئی حدیث بیان کریں تاکہ اللہ میرے یہ شکوک رفع کرے۔ انھوں نے کہا اگر تم سونے کا پہاڑ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو بھی اللہ اسے اس وقت تک قبول نہ کرے گا جب تک تم تقدیر پر ایمان نہ لاؤ گے۔ اس کے بعد میں عبداللہ ابن مسعود کے پاس گیا تو انھوں نے بھی یہی بات کہی تب میں حذیفہ کے پاس گیا تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ تب میں زید بن ثابت کے پاس گیا تو انھوں نے بھی حضرت رسولصلعم کے حوالے سے یہی بات کہی۔[۴]

مگر تقدیر کا مسئلہ اسلام کے بنیادی ارکان میں شامل نہ تھا۔ اس لیے عہدِ رسالت میں بھی صحابہ کے درمیان اس موضوع پر بحثیں ہوتی تھیں۔ البتہ آنحضرتصلعم صحابیوں کو فضول بحثوں میں الجھنے سے منع فرماتے تھے۔ چنانچہ ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ ایک بار ہم لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے کہ آنحضرتصلعم تشریف لائے اور غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا اور یہ نظر آتا تھا کہ گویا رخسارِ مبارک پر انار کے دانے بکھر گئے ہیں اور آنحضرتصلعم نے فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو اس کا حکم ملا ہے یا مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔ تم سے پہلے جو لوگ ان نزاعی بحثوں میں پڑے وہ ہلاک ہوگئے۔ میں نے تم لوگوں کی طرف سے

عہد کیا تھا کہ تم لوگ اس مسئلے پر آپس میں نہ لڑو گے۔ ۵

ابن ماجہ نے بھی اسی قسم کی روایت حضرت عائشہؓ سے منسوب کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسولصلعم کو یہ کہتے سنا تھا کہ جو لوگ تقدیر کے بارے میں باتیں کرتے ہیں ان سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گا اور جو لوگ اس بارے میں باتیں نہیں کرتے ان سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ ۶

دو تین حدیثوں میں آنحضرتصلعم نے قدریوں کی جو انسان کو اپنے فعل کا مختار مانتے تھے نام لے کر مذمت کی ہے۔ مثلاً احمد اور ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قدر یہ ہماری امت کے مجوسی ہیں۔ اگر وہ بیمار ہوں تو تم ان کی عیادت کو نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو تم ان کے جنازے میں شریک نہ ہو۔ ۷

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا کہ قدریوں کے ساتھ مت اٹھو بیٹھو اور نہ انھیں انصاف کا کام سونپو۔ ۸

لیکن ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ یہ گروہ انسان کو اپنے افعال کا ذمے دار قرار دیتا تھا اور دلیل یہ پیش کرتا تھا کہ اگر ہم انسان کو مجبورِ محض مان لیں تو جزا و سزا کی قرآنی تعلیم بے معنی ہو جاتی ہے اور عدل خداوندی پر حرف آتا ہے کیونکہ انسان اگر اپنے افعال میں مجبور ہے تو پھر اسے جزا و سزا کس بات کی ملے گی اور اللہ تعالیٰ عدل کیوں کر کرے گا۔ لطف یہ کہ یہ لوگ بھی اپنے دعوے کی تائید میں قرآن شریف کی آیتوں سے استنباط کرتے تھے مثلاً سورہ الشوریٰ کی مشہور آیت ہے کہ

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۳۰)	اور تم پر جو مصیبتیں پڑتی ہیں وہ تم نے اپنے ہاتھوں (عمل) سے کمائی ہیں اور وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

یا سورۂ النجم میں ارشاد ہوتا ہے کہ

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى. وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۳۸-۳۹)	کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور انسان کو کچھ نہیں ملتا مگر وہ جس کی انسان کوشش کرتا ہے۔

عام مسلمانوں کا روزانہ کا تجربہ بھی یہی تھا۔ وہ محنت کرتے تھے تو اُجرت ملتی تھی محنت نہیں کرتے تھے تو اُجرت نہیں ملتی تھی۔ کاشت کرتے تھے تو فصل پیدا ہوتی تھی۔ چوری اور غبن کرتے تھے تو اس کی سزا ملتی تھی اور وہ قانون کی زد سے یہ کہہ کر بچ نہیں سکتے تھے کہ ہم مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بنی امیہ کے دربار سے تعلق نہ رکھتے تھے یا جن کا مفاد اُموی خلافت سے وابستہ نہ تھا ان کو قدریوں کی تعلیمات بہت معقول نظر آتی تھیں۔

جبر و قدر فقط فقہی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کے مضمرات معاشرتی اور سیاسی بھی تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب اقتدار کی جنگ شروع ہوئی اور مسلمان مسلمان کا خون بہانے لگے تو جبر و اختیار کی بحث بھی سیاسی رنگ میں منظر عام پر آئی اور جب بنوامیہ کا دورِ استبداد شروع ہوا تو اس مسئلے کی شدت اور بڑھ گئی۔ اب مسلمان اعلانیہ طور پر دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ بنی امیہ کے حامیوں کا تھا اور دوسرا مخالفوں کا۔ بنی امیہ کے حامی عقیدۂ تقدیر کو اپنے جواز میں بطورِ سپر استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نوشتۂ تقدیر ہے لہٰذا ہمیں بلا چون و چرا خلافتِ بنوامیہ کی اطاعت کرنی چاہیے۔

اس کے برعکس بنوامیہ کے مخالفین کو چار و ناچار قدریوں کے طرزِ استدلال کو اپنانا پڑتا تھا کیونکہ انسان کو اپنے ارادے اور عمل میں خود مختار مانے بغیر نہ تو بنی امیہ کو ان کے مظالم کا ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا تھا اور نہ عامۃ الناس کو بغاوت پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔

بنی امیہ بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ فلسفۂ قدر کی زد براہِ راست ان کے اقتدار پر پڑتی ہے کیونکہ یہ عقیدہ آزادیِ عمل کی دعوت دیتا ہے لہٰذا انھوں نے قدریوں کی تحریک کو جس کا دوسرا نام اعتزال تھا بڑی سختی سے کچلا۔ چنانچہ کئی ممتاز علمائے اعتزال کو اپنے عقیدے کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان میں سب سے مشہور غیلان دمشقی تھا جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۷۲۱ء۔۷۴۳ء) کے حکم سے قتل کیا گیا۔

لیکن اعتزال کی تحریک ان سختیوں سے دب نہ سکی۔ اسی اثنا میں معتزلہ کو واصل بن عطا اور عمر بن عبید جیسے علما کی رہنمائی حاصل ہو گئی اور بنی عباس کے حامیوں نے بھی چپکے چپکے معتزلہ کی ہمت افزائی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دانش وروں کی بہت بڑی تعداد اس تحریک سے

تعاون کرنے لگی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ بنی امیہ کو شکست دینے اور بنی عباس کو تخت پر بٹھانے میں معتزلہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

عباسیوں نے ابتدا میں معتزلہ کی خوب سرپرستی کی اور ان کو عزت اور جاہ سے نوازا لیکن ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ان کو بھی وہی سیاسی مصلحتیں ستانے لگیں جن کے باعث بنی امیہ نے قدریوں پر ستم ڈھائے تھے۔ ظاہر ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی کوئی مطلق العنان بادشاہت آزادیٔ فکر و عمل کا فلسفہ قبول نہیں کر سکتی تھی اور نہ اس کو پھلنے پھولنے کی اجازت دے سکتی تھی لہٰذا معتزلہ معتوب قرار پائے اور علمائے جبر و تقدیر پر پھر عنایت کی نظریں پڑنے لگیں۔

یہ درست ہے کہ بنی امیہ کی شکست کے بعد جبریوں کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا لیکن یہ گردش بہت عارضی تھی کیونکہ عباسی معاشرے کی بنیاد بھی جبر پر تھی اور اس معاشرے میں اگر کوئی فلسفۂ حیات فروغ پا سکتا تھا تو وہ فلسفۂ جبر تھا۔ عجب اتفاق ہے امام ابوحنیفہ (وفات ۷۶۷ء)، امام مالک (۷۱۵ء۔۷۹۵ء)، امام شافعی (۷۶۷ء۔۸۲۰ء) اور امام احمد بن حنبل (وفات ۸۵۵ء) جیسے عظیم فقہائے اسلام بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئے اور امام بخاری (۸۱۰ء۔۸۷۰ء) اور امام مسلم (۸۲۱ء۔۸۷۵ء) جیسے محدثین نے احادیثِ نبوی صلعم کی ترتیب و تدوین بھی اسی زمانے میں کی (مگر ان بزرگوں میں سے کوئی بھی معتزلہ کا ہم خیال نہ تھا۔) ان کی تعلیمات نے معتزلہ کے اثر و رسوخ کو زائل کرنے میں بڑی مدد دی۔ بالخصوص احادیثِ نبوی صلعم کی تدوین نے کیونکہ عام مسلمانوں کی نگاہ میں رسول صلعم کے ارشادات کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ کسی ایسے فرقے یا گروہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے جس کے عقائد احادیث سے متصادم ہوتے ہوں۔

معتزلہ کا اثر یوں تو خلیفہ المتوکل (۸۴۷۔۸۶۱ء) کے عہد ہی میں ختم ہو چکا تھا لیکن آخری ضرب الاشعری (۸۷۳ء۔۹۳۵ء) نے لگائی۔ الاشعری مشہور معتزلہ عالم الجبائی کا شاگرد تھا لیکن اس نے جلد محسوس کر لیا کہ اس تحریک میں اب جان باقی نہیں ہے اور نہ مسائلِ حاضرہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں اب اس تحریک سے کسی رہنمائی کی امید ہے۔ چنانچہ اس نے عقل کے بجائے الہام و انکشاف کو علم کا ذریعہ قرار دیا اور معتزلہ کی دلیلوں کو ایک ایک کرکے رد

کیا۔اس نے معتزلہ کے آزادارادے کی نفی کی اور کہا کہ خدا قادرِ مطلق ہے۔[۵] البتہ جبریوں کے روایتی موقف سے ہٹ کر اس نے کسب واکتساب کا نظریہ پیش کیا جو دراصل انسان اور اس کے عمل کے درمیان ایک رشتے کا نام ہے۔الاشعری کی رائے میں اس اکتساب کے باعث انسان اپنے عمل کا جزاوسزا کی حد تک ذمہ دار ہوجاتا ہے اور اس طرح عدلِ خداوندی پر حرف نہیں آنے پاتا۔مسلمانوں میں یہی اشعری عقیدہ اب تک رائج ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مختصر یہ کہ تقدیر یا قسمت ابتدا میں ایک نہایت مفید سماجی عمل، ایک نہایت اہم معاشرتی منصب تھا۔زرعی دور میں اس منصب نے انسان کی مادّی مجبوریوں کے باعث ایک نہایت جابر، ایک نہایت مہلک عقیدے کی شکل اختیار کرلی۔صاحبِ اقتدار طبقوں نے جن میں مطلق العنان بادشاہ اوران کے امرا اور روحانی پیشوا بھی شامل تھے اس عقیدے کی خوب حوصلہ افزائی کی اور عقیدت مند عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ تمہاری مصیبتوں اور فلاکتوں کا ذمے دار معاشرے کا سیاسی اور معاشی نظام نہیں ہے بلکہ یہ ساری تکلیفیں توازل سے تمہاری قسمت میں لکھ دی گئی ہیں اور اب کوئی طاقت اس نوشتے کو بدل نہیں سکتی لہٰذا صبر کرو اور قناعت کی زندگی کرو کیونکہ حالات کو بدلنے کی کوشش کرنا نوشتہء تقدیر اور مشیّتِ ایزدی سے انحراف کرنا ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ص۔۸۲۹
۲۔مشکواۃ شریف، جلد سوئم، ص ۱۰۱
۳۔ایضاً، ص ۱۰۳
۴۔ایضاً، ص ۱۱۴
۵۔ایضاً، ص ۱۰۹۔۱۱۰

۶۔ایضاً،ص ۱۱۳

۷۔ایضاً،ص ۱۱۲

۸۔ایضاً۔

پندرھواں باب

حیات بعد الموت

موت کا ذاتی تجربہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ قصّے کہانیوں میں تو مُردے بے شک زندہ ہو جاتے ہیں اور لاشیں منہ سے بولنے لگتی ہیں لیکن حقیقت کی دنیا میں آج تک کسی مُردے نے زندہ ہو کر آپ بیتی نہیں سنائی ہے البتہ دوسروں کی موت ہمارا روز کا مشاہدہ ہے۔ اسی بنا پر انسان اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہوگا۔

لیکن موت کیا زندگی کی انتہا ہے؟ کیا مرنے کے بعد انسان کے عناصرِ ترکیبی بالکل منتشر ہو جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک کا رزق بن جاتے ہیں یا موت کے بعد کوئی زندگی بھی ہوتی ہے۔

سائنسی تحقیقات سے قطعِ نظر موت کے بارے میں فی زمانہ دو عقیدے رائج ہیں۔ ایک عقیدے کے مطابق انسان عبارت ہے جسم اور روح کے مرکب سے، جس وقت روح انسان کے جسم سے نکل جاتی ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ اس عقیدے میں انسان کی مثال ربڑ کے غبارے یا گیند کی سی ہے جو ہوا نکلنے کے بعد بے کار ہو جاتی ہے تب جسم کو تو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے مگر روح عالمِ ارواح میں چلی جاتی ہے لیکن قیامت کے دن جب اسرافیل فرشتہ اپنا صور پھونکے گا تو تمام مُردے جی اٹھیں گے اور میدانِ حشر میں جمع ہوں گے اور خدا ان کی نیکیوں اور بدیوں کو تولے گا اور ان سے سوال و جواب کرے گا۔ جن لوگوں کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا ان کو جنت میں حیاتِ جاوداں ملے گی اور جو بدکار ثابت ہوں گے ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

دوسرے عقیدے کے مطابق انسان کا جسم ایک عارضی شے ہے لیکن اس کی آتما امر ہوتی ہے وہ کبھی نہیں مرتی بلکہ اپنے کرم (اعمال) کے مطابق جون بدلتی اور نئے نئے جسموں

میں حلول کرتی رہتی ہے۔ آتما کو نروان (نجات) اس وقت نصیب ہوتا ہے جب وہ خواہشوں کے جال سے نکل جاتی ہے۔ آواگون یا تناسخ کا عقیدہ یہی ہے۔ اس عقیدے کے پیرو اپنے مُردوں کو جلاتے اور راکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں کیونکہ جسم ان کے نزدیک مر کر پھر کبھی زندہ نہیں ہوتا۔ حکیم فیثا غورث اور ہنود کا عقیدہ یہی ہے۔

ابتدائی انسان زندگی اور موت میں بالکل فرق نہیں کرتا تھا۔ وہ موت کو ماندگی کا ایک وقفہ یا طویل خواب خیال کرتا تھا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ موت کی نیند سونے والا ایک نہ ایک دن ضرور جاگے گا اسی لیے وہ اپنے مردوں کو نہ دفن کرتا تھا نہ جلاتا تھا اور نہ اپنے سے جدا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ رواج بعض وحشی قوموں میں اب بھی ملتا ہے۔

برفانی دور کے غاروں میں جو مدفون ڈھانچے ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے چالیس پچاس ہزار سال پہلے انسان اپنے مُردوں کو باقاعدہ زمین میں دفن کرتا تھا۔ وہ مُردے کے گھٹنوں کو پیٹ سے ملا دیتا تھا۔ اس طرح مُردے کی پوزیشن وہی بن جاتی تھی جو بچے کی ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ لاش کے سر کے نیچے پتھر کا تکیہ رکھ دیا جاتا تھا اور پاس ہی گوشت کے ٹکڑے، ہڈیاں اور شکاری آلات واوزار قرینے سے سجا دیے جاتے تھے تاکہ مُردہ جب نیند سے جاگے تو اس کی ضرورت کی سب چیزیں قبر میں موجود ہوں تب قبر کا منھ بند کر دیا جاتا تھا اور اوپر پتھر کی سِل رکھ دی جاتی تھی۔ یہ قبریں آباد غاروں میں ملی ہیں۔ بعض قبریں تو چولھے کے بالکل قریب بنی ہیں شاید قدیم انسان کا خیال ہو کہ آگ سے مُردے کا ٹھنڈا جسم دوبارہ گرم ہو جائے گا۔

لاش کو دفنانے کا رواج خود ظاہر کرتا ہے کہ برفانی دور کے انسانوں میں موت کا مبہم سا تصور پیدا ہونے لگا تھا۔ انھیں اگر یہ خیال ہوتا کہ مُردہ نیند سے بیدار ہو کر دوبارہ ان سے آملے گا تو وہ قبر کو پتھر کی سلوں سے کبھی بند نہ کرتے۔ غالباً وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ مرنے کے بعد آدمی کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے اور وہاں اس کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر وہ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں زادِراہ کے طور پر مُردے کے ساتھ کر دیتے تھے۔ سقارہ (مصر) کے مصطبوں میں تو ہم نے دوسری چیزوں کے علاوہ بیت الخلا بھی بنے دیکھے ہیں اور خوفو کے عظیم

ہرم میں تازہ ہوا کا بھی خفیہ انتظام ہے تا کہ فرعون کو سانس میں دشواری نہ ہو۔

سانس زندگی کی علامت ہے۔ سانس کی آمدورفت بند ہو جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ آج کل کے انسان کو تو معلوم ہے کہ سانس کے ذریعے ہم اپنے جسم کو آکسیجن فراہم کرتے ہیں اور کاربن خارج کرتے ہیں اور یہ کہ ہوا بدن کے اندر نہیں ہوتی بلکہ باہر سے جاتی ہے۔ لیکن پرانے زمانے کے لوگ سائنس کی ان باریکیوں سے واقف نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا جسم اندر سے کھوکھلا ہے اور اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اور جب یہ ہوا نکل جاتی ہے تو آدمی مر جاتا ہے۔ چنانچہ جنوبی امریکہ کے قبیلہء اتو تاما کے لوگ مرتے ہوئے آدمی کے منھ، ناک اور آنکھوں کو بند کر دیتے تھے تا کہ اندر کی ہوا بھاگنے نہ پائے۔ اس ہوا کو روح یا پران کہتے ہیں۔ ان لفظوں کے لغوی معنی بھی ہوا کے ہیں۔

پرانی قوموں کی نظر میں روح کا اپنا ایک پیکر بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ بعض روحیں موٹی تھیں، بعض دبلی پتلی، بعض لمبی چوڑی اور بعض بہت چھوٹی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ آدمی جب سو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو اس کی روح جسم سے نکل کر دوسری روحوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ قدیم انسان غالباً خواب کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کیونکہ وہ بیداری اور خواب کے مشاہدات میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا بلکہ دونوں کو حقیقی سمجھتا تھا چنانچہ جب وہ کسی مُردے کو خواب میں دیکھتا تو یہی خیال کرتا تھا کہ ہو نہ ہو میری روح سوتے وقت میرے جسم سے باہر نکلی تھی اور مُردہ لوگوں کی روحوں سے ملی تھی۔

مختصر یہ کہ دورِ حاضر کے مذاہب کی مانند عہدِ عتیق کے لوگ بھی حیات بعد الموت میں پورا پورا یقین رکھتے تھے البتہ بعض قومیں جسم اور روحیں دونوں کی ابدیت کی قائل تھیں اور بعض قوموں کا عقیدہ تھا کہ جسم تو مرنے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے۔

جمدۃ النصر اور العبید کے زمانے کی جو قبریں ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادیِ دجلہ و فرات کے باشندے بھی حیات بعد الموت میں یقین رکھتے تھے۔ ان قبروں سے کھانے پینے کے برتنوں کے علاوہ ملکہء ظلمات اریشؔ کی گل کی مٹی کی مورتیاں بھی نکلی ہیں۔

اہلِ سومیر و عکاد موت کی ملکہ اریشؔ کی گل سے بہت ڈرتے تھے اسی لیے وہ ملکہ کی

خوشنودی اور رضا جوئی کی خاطر اپنی قبروں میں اریش کی گل کی مورتیاں رکھ دیتے تھے۔ اریش کی گل بڑی بدمزاج دیوی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ انسان کیا دیوتا بھی اس کے خوف سے لرزتے رہتے تھے۔ اس نے اپنی سگی بہن عشتار (انانا) اور اس کے شوہر تمّوز کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور سومیر کی ایک پرانی داستان کے مطابق خداوند آیا نے اپنے بیٹے نرگل کی پشت پناہی نہ کی ہوتی تو نرگل کا بھی وہی حشر ہوتا جو تموز کا ہوا تھا۔

نرگل اور اریش کی گل کی کہانی طل امرنا (مصر) میں چودھویں صدی قبل مسیح کی ایک تختی پر لکھی ہوئی ملی ہے۔ یہ کہانی ہے تو بابلی تصنیف لیکن عکادی زبان سیکھنے والے مصری طلبا اس کہانی کو بطور مشق استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے میں عکادی زبان پورے مشرق قریب کی تہذیبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ دیوتاؤں نے ایک ضیافت ترتیب دی
اور اپنی بہن اریش کی گل کے پاس ایلچی بھیجا کہ
ہر گاہ ہم پاتال میں تیرے پاس آ سکتے ہیں
لیکن تو ہمارے پاس نہیں آ سکتی۔
لہٰذا اپنے نائب کو بھیج تا کہ وہ تیرے حصے کا کھانا کھا سکے۔
پس اریش کی گل نے اپنے وزیر نمتار کو بھیجا۔
اور نمتار عرشِ اعلیٰ پر گیا
جہاں دیوتا بیٹھے بات چیت کر رہے تھے
انھوں نے اپنی بہن کے نائب کا خیر مقدم کیا۔

البتہ نرگل دیوتا نمتار کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ نمتار نے واپس جا کر یہ ماجرا اپنی ملکہ سے بیان کیا تو اریش کی گل نرگل کی اس بے توجہی پر سخت برہم ہوئی اور اس نے نمتار کو حکم دیا کہ

جا اور اس دیوتا کو جس نے تیری توہین کی تھی
میرے روبرو لے آ تا کہ میں اسے قتل کروں

نمتار دیوتاؤں کے پاس گیا
اور اریش کی گل کا حکم انھیں سنایا
دیوتاؤں نے جواب دیا کہ جس نے کھڑے ہو کر تیرا استقبال نہیں کیا۔
اس کو اریش کی گل کے پاس لے جا۔
جب نمتار دیوتاؤں کو شمار کرنے لگا
تو ایک دیوتا کو چھینک آ گئی۔
اور نمتار نے کہا کہ جس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال نہیں کیا تھا
وہ یہاں موجود نہیں ہے۔

نرگل کو جب خبر ہوئی کہ ملکۂ ظلمات نے اسے طلب کیا ہے تو وہ روتا ہوا اپنے باپ ایا کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے میرے باپ مجھے بچا ورنہ اریش کی گل مجھے جیتا نہ چھوڑے گی۔ ایا نے جواب دیا کہ تو گھبرا مت۔ میں بیماریوں کے سات عفریت تیرے ساتھ کر دوں گا وہ تیری حفاظت کریں گے۔

جب نرگل ظلمات کے پھاٹک پر پہنچا
تو اس نے دربان کو آواز دی کہ پھاٹک کھول
تا کہ میں اندر آؤں
مجھے تیری ملکہ اریش کی گل کے سامنے حاضر ہونا ہے
دربان بھاگا بھاگا نمتار کے پاس گیا۔
اور نمتار سے کہا کہ کوئی دیوتا پھاٹک پر کھڑا ہے
تو اسے چل کر پہچان
تا کہ وہ اندر آ سکے۔
نمتار نے جا کر دیکھا تو واقعی نرگل وہاں کھڑا تھا۔
وہ خوش خوش ملکۂ ظلمات کے پاس گیا
اور کہا کہ ملکہ یہ وہی دیوتا ہے

جو بہت دنوں سے غائب ہے۔
کیونکہ وہ میری تعظیم کو کھڑا نہیں ہوا تھا۔
ملکہ نے کہا کہ اسے اندر لا تا کہ میں اسے قتل کروں
تمتار پھاٹک پر گیا اور زرگل سے مخاطب ہو کر بولا:
میرے آقا! اندر تشریف لائیے۔
اپنی بہن کے مکان میں
زرگل نے جواب دیا "تیرا دل میرے باعث خوش ہو۔"

زرگل نے ایک عفریت کو پھاٹک کی نگرانی کے لیے وہیں چھوڑا اور آگے بڑھا جو دوسرا پھاٹک آیا تو اس نے دوسرے عفریت کو وہاں پہرے پر مقرر کیا۔ اسی طرح زرگل نے ظلمات کے چودہ پھاٹک پار کیے اور ہر پھاٹک پر اپنا عفریت متعین کرتا گیا۔

جب وہ اریش کی گل کے محل میں داخل ہوا۔
تو اس نے ملکہ ظلمات کو چوٹی پکڑ کر گھسیٹا۔
اور تخت سے نیچے گرا دیا اور چاہتا تھا کہ اس کا سر قلم کر دے
کہ ملکہ چلائی۔ میرے بھائی مجھے قتل مت کرو۔
مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔
زرگل نے اس کی التجا سنی۔
تو اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔
تب ملکہ ظلمات رو رو کر کہنے لگی:
تم میرے خاوند بن جاؤ۔
میں تمہاری بیوی بن کر رہوں گی۔
میں تمہیں سارے پاتال کی آقائی سونپ دوں گی
اور لوحِ دانائی تمہارے حوالے کر دوں گی۔
تم میرے آقا ہو گے اور

میں تمہاری کنیز ہوں گی
نرگل نے ملکۂ ظلمات کی باتیں سنیں
تو اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔
اور پیار کیا اور اس کے آنسو پونچھے
اور کہا کہ تو جو منصوبے بنا رہی تھی
وہ پورے ہوئے۔

غرض یہ کہ سومیری اور عکادی داستانوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وادیِ دجلہ وفرات کے لوگ ظلمات سے بہت ڈرتے تھے لیکن پرانے نوشتوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے عقیدے کے مطابق جسم اور روح دونوں کو ظلمات میں رہنا پڑتا تھا یا فقط ایک کو۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ نیک اور بدسب کو ظلمات میں جانا پڑتا تھا یا ظلمات کی سزا بُرے لوگوں ہی کے لیے مخصوص تھی۔

درحقیقت عکادی ادب میں حیات بعد الموت کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ اگر کوئی تاثر ملتا ہے تو وہ ہے زندگی کی بے ثباتی کا یا موت سے خوف کا۔ چنانچہ وادیِ دجلہ وفرات کا بڑے سے بڑا سورما بھی موت کے خیال سے لرزتا ہے۔ یہ خوف خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس علاقے کے لوگ حیات بعد الموت کے چنداں قائل نہ تھے۔ ہمارے اس خیال کی تصدیق ان داستانوں سے بھی ہوتی ہے جن میں ہیرو آبِ حیات یا شجرِ زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اسے دنیاوی زندگی ہی میں بقائے دوام نصیب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر حیات مابعد کوئی خوشگوار حقیقت ہوتی تو یہ لوگ موت سے ہرگز نہ ڈرتے اور نہ موت سے بچنے کی تدبیریں اختیار کرتے۔

اداَپا کی داستان اسی تصور کی ترجمانی ہے۔ اس داستان کے کئی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک نسخہ چودھویں صدی قبل مسیح کا ہے جو طل امرنا (مصر) کی کھدائی میں ملا ہے۔ دوسرا نسخہ اشور بنی پال کے کتب خانے میں ملا ہے اور ساتویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس داستان میں حضرتِ آدمؑ کی داستان کی جھلک نظر آتی ہے۔ داستان کا ہیرو اداَپا ہے جس کو ربّ النوع انوناَن

زندگی اور آبِ حیات عطا کرتا ہے مگر وہ دوسرے دیوتا آیا کے کہنے میں آ کر ان چیزوں کو قبول نہیں کرتا کہ مبادا وہ نانِ مرگ اور آبِ مرگ ہوں چنانچہ اَنو دیوتاؤں کو حکم دیتا ہے کہ اس آدمی کو زمین پر واپس لے جاؤ۔

آیا شہر اریدو کا دیوتا ہے اور اداپا اس کے مندر کا پجاری۔ آیا نے اپنے بندے کی خدمات سے خوش ہو کر اسے عقل، فہم اور فراست بخشی ہے اور زمین کے سب راز اسے بتا دیے ہیں۔ البتہ حیاتِ ابدی کا راز اس سے پوشیدہ رکھا ہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اداپا سمندر میں مچھلیاں پکڑنے گیا لیکن بادِ جنوب کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کی کشتی الٹ گئی۔

بادِ جنوب نے اسے غرقاب کر دیا
اور وہ سمندر کی تہہ میں مچھلیوں کے ملک میں پہنچ گیا۔
تب اداپا کو سخت غصہ آیا اور اس نے للکار کر کہا:
بادِ جنوب! میں تیرے پنکھ توڑ دوں گا۔
یہ کہنا تھا کہ بادِ جنوب کے پر ٹوٹ گئے
اور بادِ جنوب سات روز تک زمین پر نہ چل سکی۔
تب خداوند اَنو نے اپنے وزیر الِ براط کو بلا کر پوچھا کہ
پچھلے سات دن سے بادِ جنوب زمین پر کیوں نہیں آئی؟
اس کے وزیر الِ براط نے جواب دیا کہ
خداوند آیا کی اولاد اداپا نے بادِ جنوب کے پر توڑ دیے ہیں۔
اَنو نے یہ بات سنی تو وہ زور سے چیخا۔
اور اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور حکم دیا کہ
اداپا کو میرے روبرو پیش کرو۔
تب آیا نے جس کو آسمان کے ہر واقعے کی خبر رہتی ہے
اور اداپا سے کہا کہ تو اپنے سر کے بال نوچ ڈال

اور ماتمی لباس پہن لے۔
کیونکہ تجھے عنقریب خداوند انو کے روبرو حاضر ہونا پڑے گا۔
تجھے شاہراہِ عرش پر چلنا ہوگا
جب تو آسمان پر جائے گا اور انو کے پھاٹک پر پہنچے گا
تو تجھے تموز اور گزیدا کھڑے ملیں گے
وہ تجھے دیکھ کر پوچھیں گے کہ اے انسان!
تو کس غم میں مبتلا ہے؟
اداپا! تو نے یہ ماتمی لباس کیوں پہنا ہے؟
تب تو ان کے جواب میں کہنا کہ
دو دیوتا ہمارے دیس سے چلے گئے ہیں
وہ پوچھیں گے کہ وہ دو دیوتا کون ہیں؟
جو تیرے ملک سے چلے گئے ہیں
تو تو جواب دینا کہ تموز اور گزیدا۔
وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں گے
اور انو سے تیری سفارش کریں گے
اور تجھے انو کا چہرہ دکھائیں گے
اور جب تو انو کے سامنے کھڑا ہو
اور تجھے انو کا چہرہ دکھائیں گے
تو اس روٹی کو ہرگز نہ کھانا۔
اور جب تجھے آبِ مرگ پیش کیا جائے
تو خبردار اس پانی کو نہ پینا
البتہ جب تجھے پوشاک دی جائے
تو اسے بے شک پہن لینا

اور جب تجھے تیل دیا جائے
تو تیل مل لینا۔
میرے اس مشورے کو کبھی نہ بھولنا۔
اور جو باتیں میں نے تجھے بتائی ہیں
ان پر عمل کرنا۔
اتنے میں اَنو کا ایلچی آن وارد ہوا اور کہنے لگا
اداپا تو نے بادِ جنوب کے پر توڑے ہیں
لہٰذا اَنو نے تجھے طلب کیا ہے۔
ایلچی اداپا کو آسمان پر لے گیا
اور جب وہ اَنو کے پھاٹک پر پہنچا۔
تو تموزا اور گزیدا وہاں کھڑے تھے
وہ اداپا کو دیکھتے ہی چلائے
''اے آدمی تو نے کس غم میں یہ صورت بنا رکھی ہے
اور یہ ماتمی لباس کیوں پہنا ہے؟
زمین سے دو دیوتا غائب ہو گئے
اس لیے میں نے ماتمی لباس پہنا ہے۔
تموزا اور گزیدا۔''
ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔
اور جب اداپا اَنو کے روبرو پہنچا
تو اَنو نے اسے دیکھ کر کہا:
تو نے بادِ جنوب کے پر کہاں توڑے؟
اداپا نے جواب دیا کہ خداوند
میں اپنے آقا کے لیے مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔

اور سمندر آئینے کی طرح شفاف تھا۔
لیکن بادِ جنوب اڑتی ہوئی آئی
اور اس نے مجھے پانی میں ڈبو دیا
یہاں تک کہ میں مچھلیوں کے ملک میں پہنچ گیا
اور غصے میں میں نے بادِ جنوب کو سراپ دیا
تموز اور گزیدہ نے جو پاس ہی کھڑے تھے
اداپا کی سفارش کی
تب اَنو کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اس نے کہا
''اَیا نے آسمان اور زمین کے ایک حقیر انسان کو
اپنے دل کا راز کیوں بتا دیا
اب وہ ممتاز بن گیا ہے اور اس کو نام بھی مل گیا ہے۔
اب ہم کیا کریں
لٰہذا نانِ زندگی لے آؤ اور اسے کھلاؤ۔''
جب وہ اداپا کے لیے نانِ زندگی لے آئے
تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا
جب وہ آبِ حیات لے آئے
تو اس نے آبِ حیات پینے سے انکار کر دیا
البتہ جب وہ اس کے لیے پوشاک لے آئے
تو اس نے پوشاک پہن لی۔
اور جب وہ تیل لے آئے تو اس نے تیل مل لیا۔
اَنو اسے دیکھ کر ہنسا اور پوچھا:
''اداپا! کیا بات ہے تو نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔
تجھے ابدی زندگی نصیب نہیں ہوگی

الٹی کھوپڑی کے انسان۔"

"اداپانے کہا کہ میرے آقا اِیانے

مجھے کھانے پینے سے منع کیا تھا

تب اُنو نے حکم دیا کہ اس شخص کو زمین پر واپس لے جاؤ۔

وادیِ دجلہ و فرات کے باشندے اگر دنیاوی زندگی کو بقائے دوام دینے کے خواب دیکھا کرتے تھے تو وادیِ نیل کے باشندوں کا نہایت محبوب مشغلہ حیات بعد الموت کو خوش گوار بنانے کی تدبیریں اختیار کرنا تھا۔ مصریوں نے اس حقیقت کو دراصل ایک مبسوط ضابطہء حیات، ایک اہم مذہبی عقیدے کی شکل دے دی تھی۔

مگر مصری عقیدے کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اب سے پانچ چھ ہزار برس پہلے دریائے نیل کی کئی ہزار میل لمبی وادی میں مختلف قبیلے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں دُور افتادہ مقامات کے باشندوں سے ربط و اختلاط بڑھانے کی چنداں ضرورت بھی تھی۔ اس کے علاوہ آمدورفت کے ذرائع بہت محدود تھے۔ کشتی ان کی سواری تھی اور کشتی کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں بعض اوقات کئی کئی ہفتے لگتے تھے۔ مزید برآں بیرونی قبیلے بھی آس پاس کے علاقوں سے آ آ کر مصر میں آباد ہوتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کے عقائد اور رسم و رواج قدیم باشندوں سے مختلف ہوتے تھے۔ ان عقائد کا اثر بھی مقامی آبادی پر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مصریوں کے عقائد میں یکسانیت کے بجائے بڑا تنوع ملتا ہے۔

مثلاً مُردوں ہی کو لیجیے۔ بعض مصری قبیلے اپنے مُردوں کو خوراک اور برتن بھانڈوں سمیت دفن کر دیتے تھے اور بعض قبیلے لاشوں کو دریا میں بہا دیتے یا صحرا میں پھینک دیتے تھے جہاں گِدھ اور چیل کوّے لاش کو کھا جاتے تھے۔ ان پرندوں کو جو تمام غلاظتوں اور گندگیوں کو قدرتی طور پر صاف کر دیا کرتے تھے مصریوں نے دیوتاؤں کا مرتبہ دے رکھا تھا۔

مصریوں میں اس بات پر بھی اتفاق نہیں تھا کہ مرنے کے بعد جسم اور جان دونوں دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں یا فقط جان ہی کو یہ شرف حاصل ہے اور اگر جسم بھی دوسری دنیا

میں زندہ رہتا ہے تو مجموعی طور پر یا جسم کا کوئی خاص حصہ۔ بعض قبیلے آواگون کے بھی قائل تھے۔ مگر ان اختلافات کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ من حیث القوم مصریوں میں تجہیز و تکفین کی رسمیں بڑے پیمانے پر منائی جاتی تھیں۔ یہ رسمیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق جسم مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتا۔ اگر انھیں یقین ہوتا کہ مُردے کا جسم، احساس، ارادے اور عمل سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے تو شاید وہ اپنے مُردوں کی ممی نہ بناتے اور نہ ان کے لیے مقبرے اور اہرام تعمیر کرتے۔

روح کے بارے میں ان کے عقیدے یکساں نہ تھے۔ بعض گروہوں کا خیال تھا کہ روح دراصل انسان کا سایہ ہے جو مرنے کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ انسان کا نام ہی اس کی روح ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ روح انسان کے دل میں رہتی ہے جو قدما کے نزدیک ذہن اور احساس کا مرکز تھا۔ بعض لوگ روح کو پرند سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ طائر جب قفس عنصری سے پرواز کر جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے لیکن روح کا سب سے قدیم مصری تصور کا کا ہے۔ یہ کا دیوتاؤں، انسانوں حیوانوں حتیٰ کہ پودوں، پھلوں اور پھولوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بہر حال روح کو خواہ کوئی نام دیا جائے مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کے جسم کے اندر کوئی حیات بخش قوت ضرور ہوتی ہے۔ یہ قوت جسم کے اندر رہتے ہوئے بھی جسم سے الگ ہوتی ہے۔ وہ جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، جسم کے ساتھ زندگی گزارتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔[۱]

مصریوں کا خیال تھا کہ مُردوں کی دنیا جسے وہ دُوات (DUAIT) کہتے تھے مغرب میں ہے۔ ان کے تصور میں مغرب دارِ فنا تھا۔ چنانچہ جب کوئی مر جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ فلاں شخص مغرب میں چلا گیا ہے۔ غالباً سورج کے مشاہدے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے اسی لیے قدیم مصریوں کے قبرستان عام طور پر بستی کے مغربی سمت ریگستانوں میں ہوتے تھے اور فراعنہ کے اہرام بھی دریائے نیل کے مغربی ساحل پر تعمیر کیے گئے ہیں اور مسطبوں میں مغربی جانب ہی ایک روشن دان ہوتا تھا تا کہ مُردے کے کا کو آنے جانے میں سہولت ہو۔

مگر دُوات تک پہنچنا آسان نہ تھا کیونکہ دُوات بحرِ ذخار کے بیچ میں ایک جزیرہ تھا اور

سمندر میں سانپ اور اژدہے تیرتے رہتے تھے۔ اس خطرناک سمندر کو عبور کرنے کے لیے فقط ایک کشتی تھی۔ اس کشتی کے ملاح کا منہ پیٹھ کی طرف تھا اور وہ صرف ان لوگوں کو کشتی میں بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جو ملاح کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتے تھے کہ "ہم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا ہے اور ہم عرش، زمین اور جزیروں کی نگاہ میں راست باز ہیں۔" اس جان جوکھم سفر کے پیشِ نظر مصری اپنے مُردے کی قبر میں ایک عدد کشتی ضرور رکھ دیتے تھے۔ ایسی کشتیاں پرانے مقبروں اور اہرام میں کثرت سے ملی ہیں۔

عکا دیوی کے دلمون کی مانند مصریوں کا دُوات بھی بڑا سرسبز و شاداب مقام تھا۔ وہاں اناج کے لہلہاتے کھیت تھے جن میں وادیِ نیل سے بھی اچھی فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ وہاں نہ قحط تھا نہ خشک سالی، نہ فاقہ اور نہ بیماری اور موت۔ جنت کا یہ تصور خالص طبیعیاتی تجربوں اور دنیاوی خواہشوں کا عکس تھا لیکن اس جنت میں داخلے کی شرطیں اخلاقی تھیں۔ وہی شخص اس جنت میں جا سکتا تھا جس کے اعمال نیک ہوں۔ جنت کا یہ اخلاقی تصور سب سے پہلے مصریوں نے پیش کیا اور وہ بھی اب سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے۔

اب تک مصریات کا کوئی محقق کا کی جامع تعریف نہیں کر سکا ہے۔ کیونکہ قدیم مصریوں نے اس اصطلاح کو مختلف معنی میں استعمال کیا ہے۔ کا کے لفظی معنی طاقت یا توانائی کے ہیں لیکن مصری زبان میں محنت اور غذا کو بھی کا کہتے ہیں۔ یہی لفظ تندرستی اور سلامتی کے معنی میں بھی بولا جاتا تھا۔ مثلاً لوگ مزاج پرسی کرتے وقت کہتے تھے کہ آپ کے کا کی خیر ہو۔ مرد کی جنسی قوت کا نام بھی کا تھا اور کا کے معنی اجداد کے بھی ہیں چنانچہ جب مصری کہتے تھے کہ فلاں شخص اپنے کا میں مل گیا تو ان کی یہی مراد ہوتی تھی کہ وہ شخص فوت ہو کر اپنے پرکھوں میں شامل ہو گیا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ اجداد کے کا بستی کے قبرستان میں رہتے ہیں اور جب بستی کا کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو وہ قبرستان سے نکل کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

پہاڑ اس کے لیے اپنی آغوش پھیلائے گا
اور زندہ کا اس کے ہمراہ ہوں گے

اوراس کے پُرکھے، ان کے کاآس کا بازو پکڑیں گے۔

اجداد پرستی کے محرکات سے بحث کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ پرانی قوموں کی نظر میں اجداد کی سچی یا روایتی قوت وشجاعت اوران کے حقیقی یا افسانوی کارنامے مثالی حیثیت رکھتے تھے۔لوگوں کی دلی تمنا یہی ہوتی تھی کہ اجداد کے نقشِ قدم پر چل کر قوم، قبیلے یا خاندان کا نام روشن کریں۔ یہ اجداد انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتے تھے۔ ان کے اوصاف ایک فرد کے نہیں بلکہ پورے معاشرے کے مجموعی اوصاف ہوتے تھے۔قدیم ایران کے لوگ اجداد کے ان اوصاف کو فراوَشی کہتے تھے۔رومی ان کو (MANES) کہتے تھے اور چینی زُو (TZO)۔مصری زبان میں ان اوصاف کا نام کاآ تھا۔مصر کے ہیروغلائی رسم الخط میں انسان کے دونوں ہاتھوں — شانے سے انگلیوں تک — کی تصویر اس کاآ کی علامت تھی — ہاتھ جو توانائی، محنت اور تخلیق کا سرچشمہ ہوتے ہیں مگر کاآ کی تصویر اس طرح بنتی تھی گویا دونوں ہاتھ کسی سے بغل گیر ہو رہے ہوں یا کسی کی حفاظت کر رہے ہوں۔مراد یہ تھی کہ کاآ کے ذریعے اجداد کی طاقت وتوانائی پس ماندگان میں منتقل ہوتی ہے اسی لیے اجداد کا لقب ''کاآ کے آقا'' تھا۔اجداد اگر اپنی اولاد سے خوش ہو کر اپنے بازوؤں میں لے لیں تو اولاد کو ان کے اوصاف بھی مل جائیں گے۔اجداد کے مرقد اور مقبرے ان کے کاآ کے مسکن ہوتے تھے اور لوگ وہاں قبر پرستی کرنے نہیں جاتے تھے بلکہ اجداد کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے چڑھاوے، قربانیاں اور نذریں پیش کرتے تھے تاکہ زندوں کی طاقت وتوانائی میں اضافہ ہو۔(پیروں، پیشواؤں کے مزاروں پر لوگ آج بھی اسی جذبے کے تحت منتیں مرادیں مانگنے جاتے ہیں) پس مصری تہذیب میں مقبروں کا ایک نہایت اہم معاشرتی مقصد تھا — وہاں انسانوں کو نئی توانائی عطا ہوتی تھی۔ ہر قبیلے یا خاندان کا اپنا قبرستان ہوتا تھا جہاں اجتماعی کاآ کو منتروں اور دعاؤں سے راضی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اہرام بھی فقط ایک فردِ واحد کا مقبرہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے گرد شاہی خاندان کی تمام قبریں ہوتی تھیں۔سالِ نو کے جشن کی ایک ضروری رسم قبروں کی زیارت تھی۔اس دن لوگ اپنے اجداد کے مسکن کو اس امید اور آرزو کے ساتھ جاتے تھے کہ جس طرح دریائے نیل کی طغیانی سے ان کے کھیتوں میں نئی زندگی پھوٹتی ہے اسی طرح ان کے جسموں کو بھی اجداد کے کاآ کی نوازشوں سے نئی طاقت نصیب ہوگی۔

اِزریس پرستی نے حیات مابعد کے ان تصورات میں چند نئے گوشوں کا اضافہ کیا۔ اِزریس افزائشِ فصل و نسل اور نمود و حیات کا دیوتا تھا۔ اس نے موت کا جام پیا تھا تاکہ کائنات زندہ رہے۔ وہ ہر سال خزاں میں مرتا تھا اور بہار کے موسم میں جی اٹھتا تھا۔ چنانچہ ایک قدیم مصری تصویر میں ایک دیوی جس کا سر گائے اور دھڑ عورت کا ہے ایک برتن سے زمین پر پانی بہا رہی ہے اور زمین سے اناج کے پودے قطار اندر قطار اُگ رہے ہیں اور اس کے اوپر ایک پرند بیٹھا ہے جس کا سر انسان کا سا ہے۔ دیوتا ازریس کی بیوی اِزیس ہے جو دریائے نیل کے پانی سے مصر کی سرزمین سیراب کر رہی ہے اور پرند ازریس کا آکا ہے، ازریس جو ہر سال مر کر زندہ ہوتا ہے۔

یہی ازریس ''دیارِ مغرب کا فرماں روا'' بھی تھا۔ اور ''دیارِ مغرب'' کے ہر مسافر کو ازریس کی تقدیر یعنی مرنے کے بعد نئی زندگی عطا ہوتی تھی۔ چنانچہ مصر کے سب سے قدیم نوشتوں میں جو فرعون اُونس (UNIS) اور پے پی دوئم (PEPI-11) کے اہرام (سقارہ) میں کندہ ہیں لکھا ہے:

> بادشاہ اُونس! تو مر کر نہیں گیا ہے بلکہ زندہ گیا ہے کیوں کہ تو ازریس کے تخت پر بیٹھا ہے۔ تیرے ہاتھ میں تیرا شاہی عصا ہے تاکہ تو زندوں کو حکم دے سکے اور جو پوشیدہ ہیں ان پر حکومت کر سکے۔ تیرا بازو اتوم ہے، تیرے شانے اتوم ہیں، تیرا پیٹ اتوم ہے، تیری پشت اتوم ہے، تیرے پاؤں اتوم ہیں۔ حوریس کی دنیا تیری خدمت کرتی ہے اور ساتت کی دنیا تیری خدمت کرتی ہے (شمالی اور جنوبی مصر)۔
>
> دوسرے منتر میں لکھا ہے:
>
> خداوند اتوم! یہ شخص تیرا بیٹا ازریس ہے جسے تو نے بچایا اور جو زندہ ہے۔ جس طرح ازریس زندہ ہے، اسی طرح بادشاہ اُونس بھی زندہ رہے گا۔ جس طرح ازریس نہیں مرا، اسی طرح اونس بھی نہیں مرے گا، جس طرح ازریس سے حساب نہیں مانگا گیا اسی طرح اونس سے بھی حساب نہیں مانگا جائے گا۔

یہ فراعنہ کے پانچویں اور چھٹے خاندان کے منتر ہیں (2750-2475 ق م)۔ ابتدا میں

یہ منتر فقط بادشاہوں کے لیے مخصوص تھے۔ پھر شہزادے اور شہزادیاں بھی ان سے فیض یاب ہونے لگے اور فراعنہ کے 11 ویں خاندان (21 ویں صدی ق م) کے عہد میں اس قسم کے منتر عام لوگوں میں بھی رائج ہو گئے۔

ایک اور نوشتے میں مُردوں کو حیاتِ جاوداں کا مژدہ ان سنہرے لفظوں میں سنایا گیا ہے۔

جنت کے دروازے تیرے لیے کھول دیے گئے ہیں اور پھاٹکوں کی بلّیاں ہٹادی گئی ہیں۔ خداوند رعؔ تیرے روبرو کھڑا ہے۔ وہ تجھے ہاتھ پکڑ کر جنت کے مقدس مقام پر لے جاتا ہے اور ازریس کے تخت پر بٹھادیتا ہے تاکہ تو اس زرّیں تخت سے برگزیدوں پر حکومت کر سکے۔ معبود کے ملازم تیرے پیچھے ادب سے کھڑے ہیں اور معبود کے امرا تیرے سامنے کھڑے ہیں اور آواز لگاتے ہیں کہ دیوتا! آ دیوتا آ۔ ازریس کے تخت پر بیٹھنے والا خوش آمدید ازریس تجھ سے ہم کلام ہے اور نفتیسؔ تجھے سلام کرتی ہے۔ برگزیدہ لوگ تیرے سامنے آتے ہیں اور جھک جاتے ہیں تاکہ تیرے قدموں کی خاک کو بوسہ دے سکیں۔ تو دیوتا کی مانند محفوظ اور مسلح ہے، تجھے اُزریس کا پیکر ملا ہے اور تو ''دیارِ مغرب'' کے سلطان کے تخت پر جلوہ افروز ہے۔ تو اپنے مکان (ہرم) کو پائدار اور ابدی بنا اور اپنی اولاد کو غم سے محفوظ رکھ۔

ازریس کے تخت پر بیٹھنے کا شرف ظاہر ہے کہ فقط فراعنہ کو حاصل تھا لیکن ازریس کی جنت میں ہر وہ شخص پہنچ سکتا تھا جس نے دنیا میں اچھے کام کیے ہوں۔

ڈواتؔ کے ملاح کی طرح ازریس نے بھی جنت میں داخل ہونے والوں کے لیے اخلاقی معیار مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ فراعنہ کے اہرام اور امرائے سلطنت کے مقابر میں ایسے نوشتے بکثرت ملتے ہیں جن میں ان لوگوں نے اپنی راست بازی، انصاف پروری اور غربا نوازی کے دعوے کیے ہیں۔

مثلاً رخمانے جو 14 ویں صدی قبل مسیح میں فرعون کا وزیرِ اعظم تھا اپنے مقبرے کی دیوار پر یہ عبارت کندہ کروائی تھی:

میں نے غریب اور امیر کے ساتھ یکساں انصاف کیا۔ میں نے کمزور کو

مضبوط آدمی کے غصے سے بچایا۔ میں نے (بڑے آدمی کو) سزا دے کر رونے والے کے آنسو پونچھے، میں نے بیوہ کی سرپرستی کی۔ میں نے بیٹے کو باپ کا جائز ترکہ دلوایا۔ میں نے بوڑھے آدمی کو اپنے عصا کا سہارا دیا اور بوڑھی عورت کی خدمت کی یہاں تک کہ اس نے کہا کہ ''واہ کتنا اچھا کام کیا تو نے۔''

ستائیسویں صدی قبل کا ایک امیر لکھتا ہے:

میرا یہ مقبرہ منصفانہ ملکیت ہے، میں نے آج تک کسی دوسرے شخص کی کسی چیز پر قبضہ نہیں کیا۔ میں نے آج تک کسی شخص پر تشدد نہیں کیا۔

ایک اور امیر لکھتا ہے:

میں نے اپنے ضلعے میں بھوکوں کو روٹی دی، جو ننگا تھا اسے کپڑے پہنائے، میں نے کسی پر سختی کر کے اس کی جائداد غصب نہیں کی کہ مبادا وہ شہر کے دیوتا سے میری شکایت کر دے۔ میری حکومت میں کسی کو اپنے سے قوی کا خوف نہ ستاتا تھا اور نہ کسی نیا اس بات کی فریاد دیوتا سے کی۔

ایک عام آدمی کا دعویٰ بہت دلچسپ ہے:

پیدائش سے آج تک میں کسی افسر کے سامنے پیٹا نہیں گیا۔ میں نے تشدد کر کے کسی کی جائداد پر قبضہ نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ وہ کام کیے جو سب آدمیوں کو پسند تھے۔

مگر بے گناہی کے ان دعوؤں سے اُزریس کو فریب نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اُزریس کا عملہ بہت چوکس اور ہوشیار تھا۔ اس کے پاس ایک ترازو تھی جس میں ہر شخص کی نیکیاں اور بدیاں تولی جاتی تھیں۔ اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوتا تو آدمی کو جنت میں داخلہ مل جاتا ورنہ وہ جہنم کا ایندھن بن جاتا تھا۔[۲]

ترازو اور میزان کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید یہ تصور تجارت کے فروغ پانے کے ساتھ ابھرا ہو۔ البتہ فراعنہ کے 18 ویں خاندان (1375-1857) میں جو مصری تہذیب کا نقطۂ عروج تھا ترازو کا عقیدہ پختہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ کتاب الاموات کے قرطاسوں پر میزان کی منظر کشی بہت عام ہے۔ ان تصویروں میں

مُردے کا کا ترازو کے پاس کھڑا ہے تاکہ تولنے والے ڈنڈی نہ ماردیں۔ ایک پلے میں انسان کا دل رکھا ہوتا ہے اور دوسرے میں صداقت کی دیوی مات کا بت۔ تولنے کا فرض موت کا دیوتا انوبس سرانجام دیتا تھا۔ دیوتاؤں کا میر منشی تحوت وزن کو قلم بند کرتا جاتا ہے۔ تحوت کے پیچھے ایک خوف ناک جانور کھڑا ہے جو صورت شکل میں کتے سے ملتا جلتا ہے۔ وہ بدکاروں کو کھا جاتا ہے۔ جب وزن ہو چکتا ہے تو تحوت اُزریس کے عملے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "تحقیق اُزریس کے دل کا وزن کر لیا گیا ہے۔ اس کا کا بطور گواہ موجود تھا۔ میزان پر اس کا وزن ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی بدی نہیں ملی۔ اس نے معبدوں کے چڑھاوؤں کو ضرر نہیں پہنچایا۔ زمین پر قیام کے دوران میں اس نے زبان سے کوئی کلامِ بد نہیں نکالا"۔ تب اُزریس کا عملہ کہتا ہے کہ "تیرے منہ سے جو بات نکلی ہے وہی ہمارا فیصلہ ہے۔ کاتب نے بالکل درست لکھا ہے۔ پس اس کو اُزریس کے روبرو روٹی کا ٹکڑا دیا جائے اور حوریس کے ماننے والوں کے مانند امن کے کھیت میں سے کھیت دیا جائے"۔ تب حوریس مُردے کا کو ہاتھ پکڑ کر اُزریس کے روبرو لاتا ہے۔ اُزریس اپنے تخت پر بیٹھا ہے جو پانی پر قائم ہے اور اس میں کنول کا ایک پھول کھلا ہوا ہے۔ حوریس اُزریس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "میں اس شخص کو تیرے سامنے لایا ہوں۔ اس نے کسی دیوتا یا دیوی کا گناہ نہیں کیا ہے۔ انوبس نے اس کا وزن کر لیا ہے۔ یہ سچا اور راست باز آدمی ہے پس خداوند اس کو روٹی اور شراب عطا ہو"۔

تب مُردہ اپنی صفائی میں ایک تقریر کرتا ہے۔

> مغرب کے آقا! میرے جسم میں کوئی بدی نہیں ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ کبھی کسی کو دھوکا دیا۔ مجھے اپنے ہمراہیوں میں داخل ہونے کی اجازت دے۔

اس کے بعد اس آدمی کو ان کاموں میں مشغول دکھایا جاتا ہے جو دنیا میں اسے بہت پسند تھے۔

مصر میں یومِ حساب بڑا سخت دن سمجھا جاتا تھا اور ہر شخص میزان کے خیال سے خوف زدہ رہتا تھا۔ چنانچہ پروہتوں نے لوگوں کے اس خوف سے خوب فائدہ اٹھایا اور طرح طرح کی دعائیں اور تعویذیں تیار کر لیں اور خوش اعتقاد مصریوں کو یہ یقین دلایا کہ اگر تم ان دعاؤں اور

تعویذوں کو ساتھ لے جاؤ گے تو اُزریس کے دربار میں تمہارے اعمال کی پوچھ گچھ نہ ہوگی بلکہ تم بلا روک ٹوک سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ اس قسم کا پروانہء جنت کلیسائے روم کے پادری بھی اپنے معتقدین کے ہاتھ فروخت کیا کرتے تھے اور یہی وہ پروانہء راہ داری تھا جس کے خلاف مارٹن لوتھر نے جرمنی میں 16 ویں صدی عیسوی میں بغاوت کی آواز بلند کی تھی۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ تو اب تک اپنے امام سے اسی قسم کے پروانے حاصل کرتا ہے۔

تجہیز و تکفین کی رسمیں تو ہر مذہب میں موجود ہیں لیکن اپنے مُردوں کو دفنانے کے سلسلے میں جو اہتمام مصری قوم کرتی تھی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ دراصل مصریوں نے اس رسم کو ایک فن بنا دیا تھا۔ ہم نے قاہرہ، پیرس، لندن، نیویارک، بوسٹن اور برمنگھم کے عجائب گھروں میں بے شمار ممیاں، تابوت اور ضریحیں دیکھی ہیں جو مصریوں کی ہنر مندی اور ذوقِ جمال کا بہترین نمونہ ہیں۔ قاہرہ کا عجائب خانہ تو ممیوں اور تابوتوں سے اٹا پڑا ہے۔ وہاں شاید ہی کوئی کمرہ ہو جس میں دس بارہ ممیاں الماریوں میں نہ رکھی ہوں اور دو چار تابوت دیواروں کے سہارے نہ کھڑے ہوں۔ عجائب خانے کی زیریں منزل میں تو بکثرت تابوت قطار اندر قطار زمین پر رکھے ہوئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی قتل گاہ میں پہنچ گئے ہیں جہاں سپاہیوں کی لاشوں کو ترتیب سے لٹا دیا گیا ہے۔ بعض تابوت سونے چاندی کے ہیں، بعضوں پر سونے چاندی کے پانی سے منظر کشی کی گئی ہے، بعض تابوت سیاہ پتھر کے ہیں اور بعض لکڑی کے۔ ان کے سرخ، زرد، نیلے اور سیاہ نقش و نگار تین چار ہزار برس گزرنے کے باوجود آج بھی نہایت روشن اور تازہ ہیں۔ یہ تابوت ظاہر ہے کہ بادشاہوں، شہزادیوں اور امرائے دربار کے ہیں جو اہراموں اور مسطبوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ عام مصریوں کے پاس اتنی دولت کہاں تھی جو موت کے حسن و زیبائش پر بے دریغ خرچ کی جاتی۔

مصریوں کے تابوت خواہ سونے چاندی کے ہوں یا پتھر اور لکڑی کے انسان کے سر اور دھڑ کی ہو بہو نقل ہوتے تھے اور تابوت کا چہرہ مُردے کی شکل کا چربہ ہوتا تھا۔ مُردے کی ممی کو اسی تابوت میں بند کر کے پتھر کے مسطبوں میں دفن کر دیتے تھے۔ عجائب گھروں میں ہم نے بہت سی ممیاں بھی دیکھیں جن کا گوشت مدت ہوئی سڑ گل گیا لیکن کھوپڑیاں اور ڈھانچے باقی رہ

گئے ہیں۔ بعض ڈھانچوں پر لٹھوں کی پٹیاں اب تک بدستور لپٹی ہوئی ہیں۔

ممی سازی مصریوں کا نادرِ روزگار فن تھا۔ اس فن کو انھوں نے تجارتی راز کی طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھا۔ البتہ جب مصر پر عیسائیوں کا غلبہ ہوا تو مصری تہذیب کے ساتھ ممی سازی کا ہنر بھی موت کے ملبوں تلے دب کر ختم ہو گیا۔

یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے 5 ویں صدی قبلِ مسیح میں مصر کا سفر کیا تھا۔ وہ ممی سازی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ممیاں عام طور پر تین قسم کی ہوتی ہیں۔ بہت قیمتی، اوسط قیمت کی اور معمولی درجے کی۔ اعلیٰ درجے کی ممیوں کی تیاری کا طریقہ یہ تھا:

ممی ساز سب سے پہلے ایک آنکڑے سے مُردے کا مغز نتھنوں کے راستے نکال لیتے ہیں۔ مغز کا جو حصہ اندر رہ جاتا ہے اس کو دوائیں اندر ڈال کر خارج کرتے ہیں پھر ایک تیز پتھر سے پیٹ کے ایک طرف گہرا شگاف ڈالتے ہیں اور انتڑیاں نکالتے ہیں۔ اس کے بعد لاش کو اندر باہر سے کھجور کی شراب سے خوب دھوتے ہیں اور لوبان کی دھونی دیتے ہیں تب لوبان، تیز پات اور دوسرے خوشبودار مسالوں کا سفوف لاش کے اندر بھر دیتے ہیں اور شگاف اور سوراخوں کو سی دیتے ہیں۔ اس کے بعد لاش 70 دن تک نطرون (شوار) کے پانی میں ڈوبی رہتی ہے۔ 70 دن کے بعد لاش کو غسل دیا جاتا ہے اور عمدہ لٹھے کی پٹیاں گوند لگا کر لاش کے گرد لپیٹ دی جاتی ہیں تب لاش کے ورثا لاش کو لکڑی کے ایک بکس میں جو انسان کی شکل کا ہوتا ہے رکھ دیتے ہیں اور بکس کا ڈھکنا بند کر کے مقبرے میں دفن کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی استطاعت اوسط درجے کی ہوتی ہے ان کی لاش میں سے شگاف دے کر غلاظت نہیں نکالی جاتی بلکہ مقعد میں چندن کے تیل کی پچکاری دی جاتی ہے اور مقعد کا سوراخ بند کر دیا جاتا ہے تاکہ تیل باہر نکلنے نہ پائے۔ تب لاش کو 70 دن تک نطرون کے پانی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ آخری دن مقعد کو کھول دیا جاتا ہے تاکہ تیل خارج ہو جائے۔ یہ دوا اتنی کارگر ہوتی ہے کہ ساری غلاظت اور انتڑیاں رقیق مادے کی شکل میں باہر آجاتی ہیں اور نطرون گوشت کو گلا دیتا ہے چنانچہ کھال اور ہڈیوں کے علاوہ کچھ باقی

نہیں رہتا۔ اس کے بعد لاش بلا پٹی لپیٹے اور مسالہ بھرے ورثا کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بالکل ہی کم استطاعت ہوتے ہیں ان کی لاش کو مسہل دے کر اور 70 دن تک نظرون کے پانی میں ڈبو کر واپس کر دیا جاتا ہے۔

فراعنہء مصر بڑے دور اندیش لوگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے بعد ہمارے جانشینوں کی سعادت مندی کو اتنی فرصت کہاں ملے گی کہ ہماری آخری آرام گاہ تیار کریں اور جس ذوق و شوق سے یہ عمارت ہم بنوائیں گے اس ذوق و شوق سے ہماری اولاد کیوں بنوانے لگی لہٰذا وہ اپنے اہرام اور مقبرے اپنی زندگی ہی میں بنوا لیتے تھے اور اس شان سے بنواتے تھے کہ شاہی خزانے کا بیش تر سرمایہ حیاتِ جاودانی کے انتظام ہی میں خرچ ہو جاتا تھا۔ امرائے سلطنت بھی بادشاہ کی تقلید کرتے تھے۔

لیکن مصر کو جن حیرت انگیز اہرام اور چٹان کے اندر ترشے ہوئے شاہی مقبروں پر بجا طور پر ناز ہے ان کا رواج فراعنہ کے تیسرے خاندان (3000 ق م) کے بانی ژوسر کے عہد میں شروع ہوا۔ ژوسر سے پہلے شاہی مقبرے کچی اینٹوں سے بنتے تھے اور اونچائی میں ریت کے ٹیلوں سے بڑے نہ ہوتے تھے۔ ژوسر بڑا اولوالعزم اور عالی حوصلہ فرماں روا تھا۔ اس نے سینا کے ریگستان میں تانبے کی کانیں دریافت کیں۔ (اس زمانے میں تانبے کو امن و جنگ کی صنعتوں میں وہی مقام حاصل تھا جو اِن دنوں لوہے یا پیٹرول کو حاصل ہے) اور اپنے لشکر دور دراز علاقوں کو بھیجے۔ ان فتوحات سے ژوسر کو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور اس کا خزانہ زر و جواہر سے بھر گیا۔

ژوسر پر امون رعٓ (سورج) کے پروہتوں کا بڑا اثر تھا۔ چنانچہ اس نے رعٓ کے ایک پروہت امؔ ہوتپ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ امؔ ہوتپ نے اپنے حسنِ تدبیر سے فرعون کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا۔ وہ بڑا عالم و فاضل آدمی تھا۔ سحر و حکمت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور انشا پرداز اس رتبے کا تھا کہ بڑے بڑے دبیرانِ سلطنت امؔ ہوتپ کا نام لے کر قلم اٹھاتے تھے۔ اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ صدیوں بعد جب مصر یونانیوں کے زیرِ نگیں آیا تو انھوں نے ازراہِ عقیدت امؔ ہوتپ کو صحت کا دیوتا بنا کر ممفس میں اس کا مندر تعمیر کر دیا۔ امؔ ہوتپ کو عمارتوں کا بھی بڑا شوق تھا اور اس فن میں اس نے وہ مہارت پائی تھی کہ بطلیموسی دور کے ماہرینِ

تعمیرات بادشاہ کے روبرو عمارتوں کا نقشہ پیش کرتے وقت یہی دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارا نقشہ امؔہوتپ کے اصولوں کے مطابق ہے۔

زُوسرا اور امؔہوتپ کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر امون رؔع کے پروہت اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے لگے۔ انھوں نے نئی نئی رسمیں وضع کیں اور مذہبی عقیدوں میں بھی نئے نئے حاشیے چڑھائے۔ سب سے پہلے انھوں نے زُوسر کو امون رؔع کی پرستش پر آمادہ کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ بادشاہ کے علاوہ کسی کو رؔع کی عبادت کا اختیار نہ ہوگا۔ ممی سازی کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی اور اہرام کی تعمیر بھی مصری تاریخ کے اسی دور میں شروع ہوئی۔ مصر کی دو چیزیں آج بھی قابلِ دید ہیں ایک دریائے نیل، دوسرے اہرام۔ دریائے نیل کے ساحل پر کھڑے ہو تو پانی کی ہر موج آج بھی ماضی کے نغمے گنگناتی گزر جاتی ہے اور تصور کی آنکھوں سے دیکھو تو ہر کشتی قلوپطرہ در آغوش نظر آتی ہے۔ وہاں پہنچ کر انسان تاریخ کے افسانوں میں گُم ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ نے اسی دریا کے کنارے قیام کیا تھا اور حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین سے بھاگ کر یہیں پناہ لی تھی۔ (قاہرہ کے ایک قبطی کلیسا میں کھجور کے تین بہت پرانے درخت صحن میں اب بھی کھڑے ہیں اور پادریوں کا کہنا ہے کہ حضرت مریمؑ نے اپنے شوہر یوسف اور نومولود عیسیٰؑ کے ہمراہ سب سے پہلے انھیں درختوں کے نیچے آرام کیا تھا) کیا یہی دریا ہے جس کے کنارے زلیخا کا محل اور یوسفؑ کا زنداں تھا۔ کیا یہی وہ دریا ہے جس میں اخناطون اپنی ملکہ نیفرؔتی تی کے ہمراہ سیر کو نکلتا تھا۔ کیا حضرت موسیٰؑ کی ماں نے اپنے شیر خوار بچے کو اسی دریا کی حفاظت میں سونپا تھا۔ کیا دارا اور سکندر کی فوجوں نے اسی دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے تھے۔ کیا جولیس سیزر اور انطونی نے عیش و نشاط کی محفلیں اسی دریا کے سینے پر سجائی تھیں۔ کیا عمرو ابن عاص نے اسی دریا کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔ کیا حسینؑ کے خون آلودہ سر اور زینبؓ کے جسدِ پاک کو اسی دریا کے کنارے آخری آرمگاہیں نصیب ہوئی تھیں۔[۳] کیا سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسی دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر صلیبی حملہ آوروں کو للکارا تھا۔

فراعنہ کے اہرام اسی دریا کے مغربی ساحل پر واقع ہیں۔ ان کا سلسلہ قاہرہ کے جنوب

میں دور تک چلا گیا ہے۔ بعض اہرام بالکل نیست و نابود ہو چکے ہیں اور چبوتروں کے علاوہ اب ان کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ البتہ چار پانچ اہرام ابھی تک اچھی حالت میں ہیں۔ ان میں سب سے پرانا اور علمائے آثار کے نزدیک سب سے شان دار ہرم زُوسر کا ہے۔

زُوسر کا ہرم مصر کے قدیم دارالسلطنت مِمفس کے نواح میں سقارہ کی پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے۔ یہ جگہ قاہرہ سے تقریباً 15 میل دور ہے۔ کسی زمانے میں دریائے نیل سقارہ کی پہاڑیوں کے نیچے سے گزرتا تھا لیکن اب مشرق کی طرف پانچ چھ میل دور ہٹ گیا ہے۔ سقارہ کا ہرم پتھر کی ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جو کسی مثلث شکل کی مانند نیچے چوڑی ہے اور پھر بتدریج پتلی ہوتی چلی گئی ہے۔ دراصل یہ ہرم ایک نہایت وسیع چبوترے پر قائم ہے۔ اس چبوترے کا ہر ضلع 127 فیٹ لمبا ہے اور اس کے اوپر چاروں طرف تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ کر دوسرا چبوترہ بنا ہے۔ اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے پانچ چبوترے ہیں اسی لیے زُوسر کے ہرم کو ہرم المدرج کہتے ہیں۔ زینے کی ایک سطح سے دوسری سطح تک کا فاصلہ تقریباً 25، 26 فیٹ ہے۔ یہ ہرم زُوسر کے زمانے میں چاروں طرف عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان عمارتوں میں تجہیز و تکفین کی مختلف رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ ایک صدر دروازہ تھا جس کے اندر سے لاش کا جلوس گزرتا تھا۔ ایک کنواں تھا جس کے اندر انتڑیاں اور جسم کے اندر کی غلاظتیں دفن کی جاتی تھیں۔ ہرم کے قریب ہی ایک مندر تھا اور مندر سے ملے ہوئے پروہتوں کے حُجرے تھے۔

ہرم میں جانے کا راستہ نہایت تنگ اور سطحِ زمین سے نیچے ہے۔ اندر داخل ہونے کے لیے یکے بعد دیگرے تین دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بادشاہ کی قبر ہرم کے نیچے ایک تہہ خانے میں ہے۔ اس تہہ خانے میں دو نہایت خوش منظر کمرے ہیں تقریباً 16 فیٹ لمبے چوڑے اور اتنے ہی اونچے، دیواریں بڑی بڑی پتھر کی سلوں کی ترشی ہوئی ہیں۔ سِلوں کے درمیان جوڑائی کا چونا یا سیمنٹ نظر نہیں آتا۔ پھر بھی یہ سِلیں آپس میں اس طرح وصل ہیں کہ پانچ ہزار برس گزرنے کے بعد بھی ان میں کہیں بال برابر جوف یا دراز نہیں ملتی۔ چھت کو روکنے کے لیے کوئی ستون یا کھمبا نہیں ہے اور نہ بلّیاں ہیں بلکہ چھت کی سِلیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ کمروں کی سب دیواروں پر چھت سے فرش تک زُوسر کے کارنامے مصر کے تصویری خطوط میں بڑی

صفائی سے کندہ ہیں۔ بادشاہ کی ضریح سادی ہے۔ اس کا پتھر گرینائٹ کا ہے جو اسوان میں ملتا ہے۔ ضریح کے آس پاس کا فرش سنگِ مرمر کا ہے۔ ژُوسر کی ممی اسی ضریح میں رکھی گئی تھی۔

لاش کو دفنانے کے بعد دروازوں کو سِلوں سے چُن دیا گیا تھا مگر چنائی کا طریقہ عجیب و غریب تھا۔ ژُوسر کے جانشینوں نے پہلے سب سے اندر والے دروازے کو بند کیا وہ اس طرح کہ دروازے کے سائز کی ایک سِل کو لکڑی کی چوکھٹ کے اوپر قائم کیا اور پھر لکڑی کو آگ لگا دی۔ لکڑی جب جل گئی تو سِل خود بخود پھسل کر نیچے آ رہی اور دروازہ بند ہو گیا۔ یہی عمل تینوں دروازوں کے ساتھ ہوا۔ دروازوں کو اتنی مضبوطی سے بند کرنے کا مقصد یہ تھا کہ چور یا ڈاکو یا پروہت لاش کے ساتھ مدفون شاہی خزانے کو چرا نہ سکیں۔ مگر ڈاکوؤں نے غالباً پروہتوں کی سازش سے دروازے کے اوپر سوراخ کھودا اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ یہ سوراخ اب بھی نظر آتا ہے۔

سقارہ دراصل ممفس کے شاہی خاندان اور امرائے سلطنت کا مخصوص قبرستان تھا۔ چنانچہ ہرم کے احاطے کے باہر متعدد مقبرے اور مسطبے ملے ہیں۔ ان کی دیواروں کے رنگین نقش و نگار فنی اعتبار سے بہت دلکش ہیں اور ان میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں ان سے قدیم مصر کے طرزِ معاشرت اور آداب و رسوم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہمیں ایک مقبرے کی دیوار پر بنی ہوئی کئی رنگین دو سطحی تصویریں نظر آئیں۔ بالائی حصے میں دو سانڈ آگے پیچھے چل رہے ہیں ایک آدمی سانڈ کی رسی پکڑے ہوئے ہے اور دوسرا اسے ہنکار رہا ہے۔ چار آدمیوں اور دو بیلوں کے اس قافلے کی رہنمائی ایک پروہت کر رہا ہے۔ غالباً بیلوں کی قربانی ہونے والی ہے۔ تصویر کے زیریں حصے میں بہت سی مرغابیاں، سارس اور بطخیں بڑے سلیقے سے الگ الگ قطاروں میں کھڑی ہیں اور ایک آدمی شاید نہار رہا ہے۔ ایک تصویر میں شکار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ پانچ شکاری ایک کشتی میں بھالے لیے کھڑے ہیں۔ ان کے نیچے دریائی گھوڑوں کی ایک قطار بنی ہے اور اوپر متعدد پرندے اُڑ رہے ہیں۔

مگر سب سے دلچسپ مناظر ملکہ تی کے مقبرے میں ملتے ہیں۔ تی بیسویں خاندان کے مشہور فرعون راموزا سوئم (1198-1167 ق م) کی ملکہ تھی۔ تی کی خواہش تھی کہ راموزا کے

بعداس کا بیٹا بنتے ور باپ کے تخت پر بیٹھے لیکن راموزآ نے راموزآ چہارم کو ولی عہد مقرر کیا تھا جو فرعون کی کسی دوسری بیوی کے بطن سے تھا۔ تی کو یہ گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ محل میں بیٹھی بیٹھی اپنے بیٹے کے حق میں منصوبے بناتی رہتی تھی۔ قضارا بوڑھا فرماں روا سخت بیمار ہوا اور جب اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو ملکہ تی نے دربار کے بعض امیروں اور حرم سرا کے حاجیوں سے مل کر بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش کی مگر بادشاہ کو اس سازش کا سراغ مل گیا۔ مجرم گرفتار ہوئے ملکہ تی بندی خانے میں قید کر دی گئی۔ سازشیوں پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں خودکشی کی سزا دی گئی لیکن دستاویزوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ملکہ تی کو بھی خودکشی کرنی پڑی یا بادشاہ نے ملکہ کی خطا معاف کر دی۔ چند ماہ بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

ملکہ تی کے مقبرے کی دیواریں رنگین مناظر سے لپی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ ایک سیاہ فام لڑکا پیٹھ پر ایک نومولود بچھڑے کو لادے نہر پار کر رہا ہے۔ اس کے پیچھے تین گائیں ہیں۔ ایک گائے پانی پی رہی ہے۔ دوسری جو بچھڑے کی ماں ہے اپنے بچے کے لیے ڈاہ رہی ہے۔ تیسری گائے کی پیٹھ پر کسی مرد کا ہاتھ ہے۔ بچھڑا مڑ کر اپنی ماں کو دیکھ رہا ہے۔ ایک جگہ کشتی سازی کے تمام مراحل بڑی صناعی سے دکھائے گئے ہیں۔ ایک جگہ ایک دریائی گھوڑی بچہ جن رہی ہے۔ بچے کا آدھا دھڑ باہر آ چکا ہے۔ اس کے نیچے ایک گھڑیال پانی سے سر نکالے بچے کو بڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا منھ کھلا ہوا ہے اور وہ اس انتظار میں ہے کہ بچہ پیٹ سے نیچے گرے تو میں اسے نگل جاؤں۔ مرغابیوں اور مچھلیوں کے شکار کے بھی بکثرت مناظر ہیں۔ ایک مقام پر 32 عورتیں بڑے انداز سے بادشاہ کے سامنے رقص کر رہی ہیں۔ ایک جگہ پر بیلوں کی قربانی کا بڑا تکلیف دہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس زمانے میں بیل کے چاروں پاؤں باندھ دیتے تھے۔ اس کے بعد پہلے اگلے پاؤں کاٹتے تھے پھر پچھلے پاؤں، تب سر اور جسم کے ان حصوں کو الگ الگ بطور نذر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سب مناظر ملکہ تی کی دیواروں پر منقوش ہیں۔

سقارہ میں انجینئری کا ایک کمال بھی نظر سے گزرا۔ یہ چھٹیں خاندان (2625-2475 ق م) کے فرعون پپی دوئم ——کے وزیر مینخو کی ضریح ہے۔ اس ضریح کا وزن تقریباً چھ سو من (24 ٹن) ہے۔ یہ ضریح واحد پتھر سے بنی ہے اور ڈیڑھ سو فیٹ گہری پختہ باؤلی میں رکھی

ہوئی ہے۔ مگر اتنی وزنی ضریح کو باؤلی میں اتارا کیسے گیا۔ میں نے جب مصری گائڈ سے پوچھا تو پہلے وہ ہنسا۔ پھر اس نے مجھے تین اندھے کنوئیں دکھائے جو باؤلی کے تین کناروں پر بنے ہیں۔ اس نے بتایا کہ انجینئروں نے پہلے یہ پختہ باؤلی بنائی پھر اس سے ملحق تین کنوئیں کھودے۔ جن کی تہہ باؤل کی ہم سطح تھی تب باؤلی کو ریت سے لبالب بھر دیا اور کنوؤں اور باؤلی کی ملحقہ دیواروں میں سوراخ کر دیا۔ اس کے بعد وزیر میتخو کی ضریح کو شہتیروں کے سہارے سے باؤلی ریت پر رکھ دیا گیا۔ ضریح کے دباؤ سے ریت کنوؤں میں خارج ہو جاتی تھی اور مزدور اسے کنوئیں سے نکال کر باہر پھینکتے جاتے تھے۔ اس طرح باؤلی آہستہ آہستہ بالو سے خالی ہوگئی اور ضریح بلا کسی ضرر کے باؤلی کی تہہ میں بیٹھ گئی۔ یہ ضریح اب تک وہیں رکھی ہے اور اتنی وزنی ہے کہ اس کو باؤلی سے نکالنا دشوار ہے۔

مگر جن اہرام نے دنیا میں شہرت پائی وہ گیزہ کے اہرام ہیں۔ 50، 60 سال پہلے تک گیزہ دریا کے مغربی ساحل سے چند میل کے فاصلے پر ایک ویران اور سنسان مقام تھا لیکن اب یہ علاقہ بھی قاہرہ کی نواحی بستی ہو گیا ہے۔ قاہرہ تین حصوں میں آباد ہے۔ قدیم حصہ جو دریا کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ جزیرہ جو بیچ دریا میں ایک نہایت شاداب جزیرہ ہے اور جس میں امرائے مصر کی کوٹھیاں، بلدیہ کے خوبصورت باغات اور اکثر ملکوں کے سفارت خانے قائم ہیں۔ اسی جزیرے کی نوک پر شاہ فاروق کا محل بھی ہے جہاں یہ کھلنڈرا بادشاہ رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ تیسرا حصہ دریا کے مغربی ساحل سے گیزہ تک پھیلا ہوا ہے۔ دراصل یہ نئی بستی ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں آباد ہونا شروع ہوئی تھی۔ ان تینوں حصوں کو آپس میں ملانے کے لیے دریا پر کئی خوبصورت اور کشادہ پل بنے ہوئے ہیں۔

گیزہ کے اہرام جو اہرامِ خوفو کے نام سے مشہور ہیں ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ وہاں سے نیچے دیکھو تو ایک طرف جزیرے کے درخت نظر آتے ہیں دوسری طرف صحرائے اعظم کے ریت کے ٹیلے ہیں اور تیسری طرف مقّتم کی پہاڑی جس پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنا قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اہرامِ خوفو کے لیے پتھر مقّتم کی پہاڑیوں ہی سے آتا تھا۔

خوفو فراعنہ مصر کے چوتھے خاندان (2900-2750 ق م) کا بانی تھا۔ وہ ممفس کے شاہی

خانوادے سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ وسطی مصر کے کسی امیر کا بیٹا تھا۔ معلوم نہیں ممفس کا تخت وتاج اس کو کیسے ملا اور اس نے کون کون سے کارنامے انجام دیے۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ خیفو ژوسر کے برعکس پروہتوں کے اقتدار کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے پروہتوں کی وہ ساری جائدادیں ضبط کر لیں جو ژوسر نے انھیں دے رکھی تھیں۔ اس نے اکثر مندروں میں بھی تالے ڈلوائے اور ان رسموں اور قربانیوں کو بند کر دیا جو ژوسر کے پروہتوں نے وضع کی تھیں۔ اس طرح خوفو نے پروہتوں کا زور توڑ دیا بلکہ رعایا کو پروہتوں کی لوٹ سے بھی کسی حد تک نجات دلوائی۔ یہی وجہ ہے کہ پروہتوں نے جو دستاویز نویس بھی ہوتے تھے اپنے نوشتوں میں خوفو کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا ہے اور تعمیرِ ہرم کی فضول خرچیوں پر خوب خوب آوازے کسے ہیں حالانکہ خوفو کے عہد کی تحریریں گواہ ہیں کہ ہرم کی تعمیر کا کام سال میں فقط تین مہینے ہوتا تھا اور وہ بھی طغیانیِ نیل کے موسم میں جب فلاحین کے پاس کوئی کام نہ ہوتا تھا۔

گیزہ میں تین اہرام ہیں: سب سے بڑا خوفو کا ہرم، اس سے چھوٹا خفرع کا ہرم جو خوفو کے عقب میں واقع ہے اور سب سے چھوٹا منکورا کا ہرم۔ خفرع اور منکورا خوفو کے بعد بادشاہ ہوئے۔

خوفو کا ہرم دنیا میں پتھر کی سب سے اونچی اور وزنی عمارت ہے۔ اس کی بلندی 481 فیٹ ہے اور اس کے مثلث نما چبوترے کا ہر ضلع 55 فیٹ لمبا ہے۔ خوفو کے انجینیروں اور معماروں کی لیاقت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ چبوترہ کی ہموار سطح اور ضلع کی پیمائش میں 1/10000 انچ سے بھی کم کا فرق ہے۔ حرم کی تعمیر میں 23 لاکھ پتھر کی سلیں صرف ہوئیں اور ہر سل کا اوسطاً وزن ڈھائی ٹن یعنی 60 من ہے۔ جڑ میں 30، 30 فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ موٹی سلیں لگیں ہیں اور چوٹی پر چھوٹی سے چھوٹی سلیں بھی 8 فیٹ لمبی ہیں۔ ہرمِ خیفو کا کل وزن 68 لاکھ 40 ہزار ٹن اور رقبہ 13 ایکٹر ہے۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ ہرم ایک لاکھ آدمیوں کی محنت سے بیس برس میں بن کر تیار ہوا تھا۔

ہرمِ خیفو کا راستہ ہزاروں سال تک ایک سربستہ راز رہا۔ سلاطین مصر نے فرعونی خزانے کی تلاش میں کئی بار اس ہرم کو کھودنے کی کوشش بھی کی مگر ناکام ہوئے۔ چنانچہ اس شکست وریخت کے نشان ہرم کی دیواروں پر اب بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً شمالی جانب سے تقریباً 50

فیٹ کی بلندی پر کئی چٹانیں اکھڑی ہوئی ہیں۔اس راز کو بلاآخر دانایانِ فرنگ نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہرم کا دروازہ سلوں کے اٹھادویں زینے میں پوشیدہ ہے۔ وہیں سے ایک سرنگ اوپر کی طرف خیفو کے مقبرے کو جاتی ہے۔ یہ سرنگ اتنی تنگ ہے کہ آدمی اگر دہرا ہو کر نہ چلے تو اس کا سر چٹانوں سے ٹکرا جائے۔ سرنگ کا فرش بھی پتھر کا ہے اور بہت چکنا ہے مگر منتظمین نے سیاحوں کی سہولت کے لیے اب اس فرش پر لکڑی کے تختوں سے پشتی بان بنا دیے ہیں اور ہاتھ ٹیکنے کے لیے لوہے کی باڑھیں لگا دی ہیں لیکن 225 فیٹ کی یہ کٹھن چڑھائی طے کرنے کے بعد جب ہم فرعون کے مقبرے میں بڑے اشتیاق سے داخل ہوتے ہیں تو سخت مایوسی ہوتی ہے کیونکہ وہاں نہ خیفو کے کارنامے دیواروں پر کندہ ہیں نہ رنگین تصویریں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ بس 16 فیٹ چوڑا اور 12 فیٹ لمبا ایک کمرہ ہے بالکل سادہ اور سپاٹ البتہ ایک گوشتے میں 7 فیٹ لمبے اور 4 فیٹ چوڑے پتھر کی ایک ضریح رکھی ہوئی ہے۔اس ضریح پر بھی کوئی نقش و نگار نہیں ہے۔ضریح کے پائنتی ایک تہہ خانہ ہے جس میں خیفو کے زروجواہر دفن تھے لیکن اب تہہ خانہ بالکل خالی پڑا ہے۔ مقبرے کی دیواریں گرے نائٹ پتھر کی ہیں اور جڑائی کے لیے کوئی مسالہ استعمال نہیں ہوا ہے۔ کمرے میں ایک ہوادان بھی ہے مگر ہوا نہ جانے کہاں سے آتی ہے۔ایک اور سوراخ بھی دیکھا جس میں منہ رکھ کر آواز لگاؤ تو سارا کمرہ گونجنے لگتا ہے۔واپسی کا اتار چڑھائی سے بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ آدمی کو الٹے پاؤں اترنا پڑتا ہے۔

شاید خیفو کے جاہ و جلال کو یہ منظور نہ تھا کہ کوئی شخص واپس جاتے وقت اس کی طرف پیٹھ کر کے اترے بلکہ ہر زائر آج بھی خیفو کی روح کو جھک کر کورنش بجالانے پر مجبور ہے۔

حیات بعدالموت کے آرام و آسائش کے لیے اہرام بنانے والے فرماں روا ہزاروں برس گزرے خاک میں مل گئے لیکن ابدیت کی آرزو انسان کے دل سے کبھی نہ نکل سکی۔ وہ موت پر فتح پانے کے خواب برابر دیکھتا رہتا ہے۔ چنانچہ سائنس دان اور ڈاکٹر آج بھی عرصہء حیات کو وسیع سے وسیع تر بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور کیوں نہ ہوں، زندگی اپنی تمام بے انصافیوں اور سخت گیریوں کے باوجود آج بھی کائنات کی سب سے دلکش اور حسین حقیقت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر بریسٹڈ، تاریخ مصر، ص ۶۴

۲۔ ترازو کا تذکرہ قرآن میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں لکھا ہے کہ:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ. (سورۂ اعراف:۸۔۹)

اور تول اس دن ٹھیک ہے۔ سو جن کی تولیں بھاری پڑیں سو وہی ہیں جن کا بھلا ہوا اور جن کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو ہارے اپنی جان ۔ اس پر کہ ہماری آیتوں سے زبردستی کرتے تھے۔

اسی طرح سورۂ القارعہ میں قرآن قیامت کا بڑا بھیانک نقشہ کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان پتنگوں کی مانند بکھر جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی مانند ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور

وَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ.

پھر اعمال کے وزن کے بعد جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانہ گڑھا ہوگا اور تجھ کو معلوم ہے کہ یہ کیا چیز ہے ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

ممکن ہے کہ قریش بھی مصریوں کی مانند میزان پر اعتقاد رکھتے ہوں مگر مغربی محققین کا خیال ہے کہ عربوں میں میزان کا تصور یہودیوں کی کتاب صحیفہ ابراہیمی سے آیا۔ اس کتاب کو مصر کے ایک یہودی نے جو عیسائی ہو گیا تھا تیسری صدی عیسوی میں تحریر کیا تھا۔

۳۔ قاہرہ میں حضرت امام حسینؓ اور حضرت زینبؓ کے روضے آج بھی مرجعِ خلائق ہیں۔ مصریوں کا عقیدہ ہے کہ امام شہید کا سرِ مبارک یہیں دفن ہے اور حضرت زینبؓ نے بھی قاہرہ میں وفات پائی تھی۔

سولھواں باب

شجرِ مراد کی جستجو

پرانی قوموں کی زندگی میں تاریخی دور سے پہلے ایک نیم اساطیری اور نیم تاریخی دور ضرور آتا ہے۔ اس دور میں انسان کو اپنے جنسوں میں بھی خداوندی صفات نظر آنے لگتے ہیں۔ اس میں خودشناسی کی صلاحیت ابھرتی ہے اور وہ انسان کو بھی ان کارناموں کا اہل سمجھنے لگتا ہے جو اس سے پیش تر فقط دیوی، دیوتاؤں سے منسوب کیے جاتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی ثناخوانی کے پہلو بہ پہلو اب انسانی عظمتوں کے گیت بھی گائے جاتے ہیں اور انسان کی فراست اور شجاعت کی داستانیں بھی تصنیف ہونے لگتی ہیں۔ یہ سورماؤں کا دور کہلاتا ہے۔ ایسے سورما جن میں چند صفات دیوتاؤں کی ہوتی ہیں اور چند انسانوں کی۔

وادیٔ دجلہ وفرات کی تاریخ بھی اس دور سے گزر چکی ہے۔ چنانچہ وہاں کے باشندوں نے بھی اپنے ہیروؤں کو ہر قسم کی صفات سے سنوارا، البتہ مصر، ہندوستان اور رومۃ الکبریٰ کی مانند ہیروؤں کو دیوتا کا درجہ کبھی نہیں دیا اور نہ اوتار مان کر ان کی پرستش کی۔ ان کا سب سے بڑا ہیرو، گل گامش تھا مگر گل گامش بھی فقط ''دوتہائی دیوتا'' بن سکا اور بالآخر اسے بھی موت کا جام پینا پڑا کہ ''ابدی زندگی تو فقط دیوتاؤں کی قسمت میں لکھی ہے۔''

انسان کے تخیّل نے حقیقت اور مجاز کے امتزاج سے بڑے بڑے فنّی شاہ کار تخلیق کیے ہیں۔ ایسے شاہ کار جنہیں اہلِ ذوق اب تک لطف لے لے کر پڑھتے ہیں۔ ایلیڈ اور اوڈیسی، مہابھارت اور رامائن، فردوسی کا شاہ نامہ، امیر حمزہ کی داستان، حاتم طائی اور چہار درویش کے قصے غرضیکہ ہر زبان کے ادب میں اس امتزاج کے نمونے ملیں گے۔

عراق کا نیم اساطیری اور نیم تاریخی دور تین ہزار قبل مسیح کے قریب شروع ہوا۔ اس دور

کے تین ہیرو ہیں جن کی داستانیں ہم تک پہنچی ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں سورما۔ اِن مے گر، لُوگل باندہ اور گِل گامش، سومیر کی ریاست اریک ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ گونیفر، اُر، کیش اور اُریدو کی شہری ریاستیں اریک سے کم اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن ان ریاستوں کے کسی بادشاہ یا سورما کو قومی ہیرو کا رتبہ نصیب نہیں ہوا۔

اریک کے ان سورماؤں سے دس نظمیں منسوب ہیں۔ دو نظموں کا ہیرو اِن میکر ہے۔ دو کا لوگل باندہ اور پانچ یا چھ کا ہیرو گل گامش ہے۔

اِن میکر کی نظموں میں اریک اور اراتا کے درمیان تصادم کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس داستان کے مطابق اَراتا اِریک سے بہت دور شمال میں ایک ملک تھا۔ وہاں سونا چاندی اور جواہرات کی بہتات تھی۔ (اراتا غالبًا ایشیائے کوچک میں کوہِ ارارات کے آس پاس واقع تھا) اراتا کا راستہ بھی بہت دشوار گزار تھا کیونکہ راہ میں سات اونچے اونچے پہاڑ حائل تھے لہٰذا اِن میکر نے جو اریک کا فرماں روا تھا اریک کی محبوب دیوی اناتا (عِشتار) سے التجا کی کہ:

بہن اناتا!

اراتا کے لوگوں سے اریک کے لیے سونے چاندی کے زیور بنوا۔

وہ پہاڑ سے خالص لاجورد اور قیمتی پتھر لے کر آئیں اور تیرا
مسکن تعمیر کریں۔

اراتا کو اریک کا مطیع کردے۔

ملک گیری کی خواہش اور مال و زر کی ہوس کتنی قدیم ہے۔ اس ہوس پر پردہ ڈالنے کے لیے انسان نے کبھی مذہبی فریضے کی نقاب اوڑھی ہے، کبھی احکام خداوندی کی آڑ لی ہے، کبھی دیوی دیوتاؤں کی اہانت کا عذر تراشا ہے، کبھی عورتوں کی بے آبروئی کو انتقام کا بہانہ بنایا ہے اور کبھی وحشی قوموں کو تہذیب سکھانے کا مقدس عزم ظاہر کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو ان پردوں کے پیچھے معاشی مفاد کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔

محبت کی دیوی عشتار نے اِن میکر کی التجا سن لی اور اسے مشورہ دیا کہ اپنا کوئی ہوشیار ایلچی اراتا روانہ کر تو تیری آرزو پوری ہوگی۔ ''اراتا کے لوگ تیرے سامنے اپنے گھٹنوں کو پہاڑی

بھیڑوں کی مانند بھگا دیں گے۔" چنانچہ اِن میکر نے اپنے ایلچی کے ذریعے اراتا کو پیغام بھیجا کہ میری اطاعت قبول کرلو ورنہ میں شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔

میں شہر کے لوگوں کو اس طرح بھاگنے پر مجبور کروں گا
جیسے پرند درختوں سے بھاگتے ہیں
وہ اپنے گھونسلوں میں چھپ جائیں گے
مگر میں اراتا کو ویران کھنڈر بنادوں گا
وہ مٹی کا ڈھیر ہوجائے گا
میں شہر کو اس طرح برباد کردوں گا
جیسے شہر برباد کیے جاتے ہیں
لہٰذا مناسب یہی ہے کہ
اراتا کے لوگ میری اطاعت کریں
اور میرے لیے اِنانا کا محل اریک میں تعمیر کریں
اور اسے یوں سنواریں جیسے درخت موسمِ بہار میں سنورتے ہیں
اور یوں روشن کریں جیسے اُتو (سورج) طلوعِ سحر کے وقت
روشن ہوتا ہے۔

اِن میکر کا ایلچی سات دریاؤں اور سات پہاڑوں کو عبور کرکے اراتا کے شاہی دربار میں پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ:

میرے بادشاہ نے
میرے باپ نے جس کا سر پیدائش ہی سے تاج کے لیے موزوں تھا جو
جو اریک کا فرماں روا ہے۔ جو سومیر کا مارِ عظیم ہے۔
جو شاہی طاقت رکھنے والا مینڈھا ہے۔
جو ایوانِ شاہی کی بلندیوں پر وفادار گڈریے کے پیٹ سے پیدا ہوا۔
اِن میکر، اُتو کے بیٹے نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔

وہ اراتا کے بادشاہ کو اِن میکر کا پیغام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ
''اس کے بارے میں تیری جو مرضی ہو مجھے بتا تا کہ اسے میں اپنے آقا تک پہنچادوں۔''
اراتا کا تاج دار جواب دیتا ہے۔

اپنے بادشاہ، کلاب کے آقا سے جا کر کہہ دے کہ
مقدس اِنانا (عشتار) جو زمین و آسمان کی ملکہ ہے
جس کا قانون ہر جگہ چلتا ہے۔
وہی مجھے اراتا لائی تھی۔ مقدس قانون کی سرزمین پر
پھر میں اریک کی اطاعت کیوں کروں؟
اراتا کبھی اریک کے تابع نہ ہوگا۔

''اور اگر قوت آزمائی منظور ہے تو اپنے کسی منتخب سورما کا مقابلہ میرے کسی سورما سے کر۔ جو فریق ہار جائے اس کا ملک اطاعت قبول کر لے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تیرا سورما نہ کالا ہو نہ گورا، نہ گندمی رنگ کا ہو نہ پیلے رنگ کا۔''

یہ نظم ایک ٹوٹی ہوئی لوح پر کندہ ملی ہے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اِن میکر نے اراتا کی دعوتِ مبازرت قبول کی یا نہیں۔ آخر میں فقط یہ معلوم ہوتا ہے کہ اراتا نے اِن میکر کا بنیادی مطالبہ مان لیا اور سونا، چاندی، لاجورد اور دوسرے قیمتی پتھر بطور خراج ادا کرنے لگا۔

مگر کچھ عرصے کے بعد اراتا نے نہ صرف خراج دینا بند کر دیا بلکہ اریک سے خراج کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس وقت اراتا کے بادشاہ کا نام ان سوکش سرانا تھا اور اس کے وزیر کا نام ان سی گاریا۔ چنانچہ ان سوکش سرانا نے ندومانامی ایک ایلچی کو اریک بھیجا اور اِن میکر سے مطالبہ کیا تو انانا کی مورت کو اراتا کے حوالے کر دے یعنی اراتا کا مرید ہو جا مگر اِن میکر اِنانا کی مورت کو اراتا بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوا اور اس مسئلے کو اراتا کی مجلسِ شوریٰ کے روبرو پیش کیا۔ مجلسِ شوریٰ نے اِن میکر کو ان سوکش سرانا کی اطاعت قبول کرنے کا مشورہ دیا لیکن بادشاہ نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا، تب اراتا کے مشماش (مہا پروہت) نے اریک کو اکیلے فتح کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مشماش بڑا عیار اور چالاک سیاست دان تھا۔ وہ اریک کے مویشی خانے میں بھیس بدل کر گیا اور وہاں کے گائے

بھیڑوں کو بھڑکانے لگا۔

مشماش گائے سے پوچھتا ہے۔

گائے تیری ملائی کون کھاتا ہے اور

تیرا دودھ کون پیتا ہے؟

میری ملائی ننداآبا کھاتی ہے

میرا دودھ ننداآبا پیتی ہے۔

مشماش گائے سے کہتا ہے کہ تیرے اپنے بچے ملائی دودھ سے کیوں محروم رہیں لہٰذا تو شاہی محل اور لنگر خانے کو دودھ بھیجنے سے انکار کیوں نہیں کر دیتی۔ یہ دلیل گائے کے دل کو لگ جاتی ہے اور اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اراتا کے کسی ہوشیار سیاست دان نے ریاست اریک کی زرعی آبادی میں بغاوت پھیلا دی تھی۔ زراعت پیشہ لوگ مویشی پالتے اور شہر کو خوراک کا سامان فراہم کرتے تھے۔ ان کی بغاوت کے نتائج ریاست کی آزادی اور بقا کے لیے نہایت خطرناک ہو سکتے تھے۔ شہریوں اور دیہاتیوں کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ ممکن ہے اریک کی دیہاتی آبادی شہریوں سے اس بات پر ناراض رہی ہو کہ وہ دیہاتیوں کی ساری پیداوار سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور اراتا نے ان کی اس بے چینی سے فائدہ اٹھا کر ان کو بغاوت پر آمادہ کر لیا ہو۔ بہر حال اس واقعے سے یہ تو معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ حملہ آور طاقتیں اس وقت بھی اپنے دشمن کی داخلی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

مویشیوں کے دودھ خشک ہونے کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں اور انھوں نے شہریوں پر اپنا قہر نازل کیا ہے۔ مگر اِن میگر بڑا ذی فہم تھا اس نے دو گڈریے مویشی خانے بھیجے تاکہ دودھ خشک ہونے کے اسباب معلوم کریں۔ گڈریوں نے مشماش کو گرفتار کر لیا اور اسے مشک باندھ کر دریائے فرات میں پھینک دیا مگر مشماش نہیں ڈوبا کیوں کہ وہ منتر جانتا تھا۔ گڈریوں نے اسے پانچ بار پکڑا اور دریا میں پھینکا۔ آخر وہ لوٹ گیا اور اراتا کے بادشاہ نے اِن میگر کی اطاعت قبول کر لی۔

لوگل باندہ کی رزمیہ داستانیں

''فہرستِ شاہاں'' کے مطابق لوگل باندہ اِن میکر کا جانشین تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اِن میکر کی فوج کا سپہ سالار رہا ہو لیکن فہرستِ شاہاں کے اس بیان سے کہ لوگل باندہ گڈریا تھا اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ وہ دیہاتی تھا یا دیہات کا کوئی صاحبِ اثر سردار یا زمیندار۔ لوگل باندہ سے جو رزمیہ نظمیں منسوب ہیں ان کا تعلق اس کی بادشاہی کے زمانے سے نہیں ہے بلکہ یہ کارنامے اس نے اپنے آقا اِن میکر کے عہد میں سرانجام دیے تھے۔

پہلی نظم میں لوگل باندہ زابو کے دُور افتادہ ملک میں پڑا ہوا ہے، وہ اریک واپس جانے کے لیے بے چین ہے مگر راستہ بہت کٹھن اور سفر اتنا خطرناک ہے کہ یہ منزل اِم دوگوڑ پرندے کی مدد کے بغیر ہرگز طے نہیں ہو سکتی۔ اِم دوگوڑ لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے اور کوئی شخص اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا لیکن لوگل باندہ اس پرند کی خوشنودی کیسے حاصل کرے۔ اتفاقاً ایک دن اِم دوگوڑ چرائی پر گئی ہوئی تھی اور اس کے بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ لوگل باندہ نے انھیں چارہ شہد اور روٹی کھلائی۔ ان کے چہروں کو رنگا اور ان کے سروں پر شوگورا تاج رکھا۔ اِم دوگوڑ جب واپس آئی تو بچوں نے ماں سے سارا ماجرا بیان کیا۔ پس اِم دوگوڑ لوگل باندہ کے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور اس سے پوچھنے لگی بتا تو کیا چاہتا ہے، لوگل باندہ نے کہا کہ میں اریک واپس جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اِم دوگوڑ نے اسے صحیح سلامت اریک پہنچا دیا۔ وہاں اس کا آقا اِن میکر خطرے میں تھا کیونکہ سامی نسل کے مارتو قبیلے نے شہر اریک کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اِن میکر کو اپنی بہن اناناکے پاس کمک کا پیغام بھجوانا تھا۔ مگر کوئی شخص ارانا (جہاں انانا مقیم تھی) کے سفر پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ لوگل باندہ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور ارانا پہنچ کر اِن میکر کا پیغام انانا کو دیا۔ انانا نے جواب دیا کہ اِن میکر فلاں دریا کا سفر کرے، فلاں مچھلی پکڑے، فلاں فلاں جہاز بنوائے اور دھات اور پتھر کے کاری گروں کو شہر میں آباد کرے تو اس کی مشکل آسان ہو جائے گی۔

اس کہانی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِن میکر یا اریک کے کسی اور بادشاہ نے ارانا کی اطاعت قبول کر لی تھی کیونکہ انانا جو اقتدارِ اعلیٰ کی علامت تھی اب اس کی مورتی ارانا میں تھی۔

شاید اس زمانے میں شمال یا مغرب کے سامی قبیلے اریک پر حملے کیا کرتے تھے اور اریک حملہ آوروں کو شکست دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا اس لیے اس نے اراتا کی مدد مانگی مگر اراتا نے امداد دینے کی بجائے اریک کے بادشاہ کو مشورہ دیا تھا کہ شہر میں صنعت وحرفت کو فروغ دو، جہاز بنواؤ، دریائی راستوں کی حفاظت کرو تو تمہاری ریاست بیرونی حملوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

دوسری نظم میں لوگل آ باندہ اپنے آقا اِن میکر کے ہمراہ کسی مہم پر جا رہا ہے۔ کوہِ حروم پر پہنچ کر وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھی اسے مُردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لوگل آ باندہ ڈھائی دن تک مُردہ پڑا رہتا ہے جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر اکیلا پاتا ہے۔ تب لوگل آ باندہ خداوند شمس سے التجا کرتا ہے کہ مجھے کوہِ حروم پر مرنے سے بچا۔

اس جگہ جہاں ماں پاس میں نہ ہو،
جہاں باپ پاس میں نہ ہو،
جہاں کوئی عزیز پاس میں نہ ہو،
جہاں ماں، اے میرے بیٹے کہہ کر بین نہ کر سکے،
جہاں بھائی، اے میرے بھائی کہہ کر آہ وزاری نہ کر سکے،
اے میرے آقا مجھے وہاں مرنے نہ دے۔

گِل گامش کی داستان

مگر اِن میکر اور لوگل آ باندہ کی یہ رزمیہ داستانیں گِل گامش کی داستان کے مقابلے میں بہت مختصر اور کم رتبے کی ہیں۔ گِل گامش ایک عظیم شخصیت ہے۔ اس کی مہم جوئیوں اور رزمیہ کارناموں کے سامنے اس کے پیش رو ہیروؤں کے کارنامے بچوں کا کھیل نظر آتے ہیں۔ گِل

گامش کی داستان ایک طویل، باربط اور مسلسل داستان ہے۔ اس داستان میں حیات و ممات کے ابدی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ انسان کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور معاشرے کے قدیم اور جدید اقدار کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ اس داستان کا ہیرو ماحول کو بدلنے اور قدرت کو تسخیر کرنے کے شوق میں دیوی دیوتاؤں سے بھی ٹکر لینے سے نہیں جھجکتا۔

گِل گامش کی داستانِ رزم و الم کا شمار دنیا کے قدیم ترین نوشتوں میں ہوتا ہے۔ اس داستان میں گِل گامش کی فوقِ فطرت مہموں اور حیاتِ جاوداں کی ناکام جستجو کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ گِل گامش اٹھائیسویں صدی قبلِ مسیح میں جنوبی عراق کی شہری ریاست اریک کا فرماں روا تھا۔ وہ بہت مہم جو اور حوصلہ مند بادشاہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی طاقت، تدبر اور فراست سے گرد و پیش کے کئی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ گِل گامش کے کارنامے ممکن ہے کہ اس کے عہد میں شعر کا موضوع بن گئے ہوں لیکن اس نوع کی جو متفرق نظمیں ہم تک پہنچی ہیں وہ گامش کی وفات کے سات آٹھ سال بعد قلم بند ہوئیں تھیں۔ یہ نظمیں سومیری اور عکادی زبانوں میں ہیں۔

گِل گامش کی داستان کا مکمل نسخہ وہ ہے جسے ساتویں صدی قبلِ مسیح میں شہنشاہ اشور بنی پال کے حکم سے نینوا کے شاہی کتب خانے کے لیے مرتّب کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ کچی مٹی کی بارہ لوحوں پر پیکانی خط میں مرقوم ہے اور عکادی زبان میں ہے۔

عہدِ قدیم کے دیگر فنی شاہ کاروں کی مانند اس نظم کے مصنف کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ غالباً یہ نظم کسی ایک شاعر کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے اور نہ ایک وقت میں لکھی گئی ہے بلکہ اس کی تصنیف و تہذیب میں پوری قوم کی آرزومندی اور جمالیاتی حس شامل ہے۔ پرانے زمانے میں قومی ہیروؤں کے کارناموں کو درباروں اور مندروں میں تیوہاروں، نجی تقریبوں اور جنگ کے موقعوں پر گا کر سنانے کا دستور عام تھا۔ تحریر کا رواج بہت کم تھا اس لیے شاعر اور سامع دونوں اپنی اپنی ضرورت، خواہش اور مذاق کے مطابق ان نظموں میں وقتاً فوقتاً ترمیم یا اضافے کرتے رہتے تھے۔ صدیوں بعد جب ان نظموں کو قلم بند کرنے کی نوبت آئی تو نقشِ اوّل کے نشان ذہنوں سے مٹ چکے تھے اور کوئی یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ ان کارناموں کو سب سے پہلے کس نے اور کب نظم کیا تھا یا

اس نظم کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ گل گامش کی داستان انھیں مرحلوں سے گزری ہے۔

اس داستان کے مطابق گل گامش بڑا جابر اور عیش پسند بادشاہ ہے۔ وہ شہریوں کی مقدس رسوم کی بے حرمتی کرتا تھا۔ نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرتا تھا اور جس لڑکی کو چاہتا ہے اپنے حرم میں داخل کر لیتا ہے۔ لوگ تنگ آ کر دیوتاؤں سے فریاد کرتے ہیں۔ آخر دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں فیصلہ ہوتا ہے کہ گل گامش کا حریف پیدا کیا جائے تا کہ لوگوں کو چین نصیب ہو چنانچہ اِن کدو پیدا ہوتا ہے۔ وہ صحرا میں جنگلی جانوروں کے ساتھ رہتا ہے۔ اتفاقاً وہاں ایک دن ایک بہلیے کا گزر ہوتا ہے۔ اس نئی مخلوق کو دیکھ کر وہ ڈر جاتا ہے اور بھاگ کر سارا ماجرا اپنے باپ سے بیان کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے کہ تو اریک کے شہر میں جا اور گل گامش کو اس واقعے کی خبر دے۔ وہ مندر کی ایک حسین و جمیل دیوداسی کو تیرے حوالے کرے گا۔ اسے لا کر چشمے کے پاس برہنہ بٹھا دینا۔ جنگلی آدمی اس پر فریفتہ ہو جائے گا اور جب اس کی خواہش پوری ہو جائے گی تو اس کا جنگلی پن جاتا رہے گا اور بے ضرر انسان بن جائے گا۔ بہلیہ باپ کے مشورے کے مطابق اریک جاتا ہے اور گل گامش ایک دیوداسی کو اس کے ہمراہ کر دیتا ہے۔

اِن کدو جواب تک جنگلی جانوروں کا دوست اور انسان کا دشمن تھا دیوداسی کی صحبت میں انسان کا دوست اور محافظ بن جاتا ہے اور دیوداسی سمیت بہلیے کے پڑاؤ میں رہنے لگتا ہے۔ ایک دن ادھر سے ایک مسافر گزرتا ہے تو اِن کدو اس سے سفر کا سبب اور اس کی پریشانی کا باعث پوچھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اریک کے لوگ گل گامش کی سخت گیریوں اور عیش کوشیوں سے عاجز ہیں اسی لیے میں شہر سے بھاگ کر جا رہا ہوں۔

اِن کدو دیوداسی کے ہمراہ اریک روانہ ہوتا ہے تا کہ گل گامش کو اس کی بدعنوانیوں کی سزا دے۔ گل گامش کو جب خبر ہوتی ہے کہ ایک پہلوان اس سے لڑنے کے ارادے سے شہر میں آیا ہے تو وہ بھی مقابلے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اِن کدو کو پچھاڑ دیتا ہے۔ اِن کدو، گل گامش کو اپنا آقا تسلیم کر لیتا ہے اور گل گامش اِن کدو کو اپنا رفیق اور دستِ راست بنا کر محل میں لے جاتا ہے۔

اب گل گامش کی مہمیں شروع ہوتی ہیں۔ وہ لبنان کے چندن کے جنگل کا رخ کرتا ہے

اور جنگل کے محافظ حمبابا کو قتل کر دیتا ہے۔

اس فتح یابی کی خبر عِشتار کو ہوتی ہے۔ وہ گِل گامِش کے حسن اور شجاعت پر عاشق ہو جاتی ہے اور گِل گامِش سے کہتی ہے کہ تو میرے ساتھ شادی کر لے۔ گِل گامِش اسے ہرجائی اور بیسوا کہہ کر اس کی توہین کرتا ہے اور اس کی درخواست کو رد کر دیتا ہے۔

عِشتار اَنو سے گِل گامِش کی گستاخی کی شکایت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے ثورِ فلک عطا کرتا کہ وہ گِل گامِش سے میرا بدلہ لے۔ ثورِ فلک ایرک میں آفتِ ناگہانی بن کر آتا ہے۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں مگر گِل گامِش اور اِن کِدو ثورِ فلک کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ دیوتاؤں کے مقرر کیے ہوئے پاسبان حمبابا کے قتل کی پاداش میں گِل گامِش اور اِن کِدو میں سے کس کو ہلاک کیا جائے۔ شمس اس تجویز کی مخالفت کرتا ہے مگر اس کی پیش نہیں چلتی بالآخر اِن کِدو کی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اِن کِدو بیمار پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔

گِل گامِش کو اپنے دوست کی موت کا اتنا صدمہ ہوتا ہے کہ وہ راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔ اسے یہ غم کھائے جاتا ہے کہ ایک دن میرا بھی یہی حشر ہوگا۔

ایک دن اسے خبر ملتی ہے کہ کسی جزیرے میں ایک شخص رہتا ہے جس کو دیوتاؤں نے امر بنا دیا ہے اور اسے بقائے دوام کا راز معلوم ہے۔ اس کا نام خِضی ساترا KHAZISASTRA یا اُتنا پشتیم ہے۔ گِل گامِش خِضی ساترا یا اُتنا پشتیم کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ ایک جگہ ایک شراب ساز عورت ملتی ہے جو گِل گامِش کو ''کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ'' کا مشورہ دیتی ہے کیونکہ ''حیاتِ جاوداں تمہاری قسمت میں نہیں ہے حیاتِ ابدی تو فقط دیوتاؤں کے لیے مخصوص ہے۔'' مگر گِل گامِش مردِ بزرگ اُتنا پشتیم سے ملنے پر اصرار کرتا ہے۔ عورت اسے اُتنا پشتیم کے ملاح کا پتہ بتا دیتی ہے۔ گِل گامِش ملاح کی مدد سے اُتنا پشتیم کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اس سے شجرِ حیات مانگتا ہے۔ اُتنا پشتیم اسے سیلابِ عظیم کا قصہ سناتا ہے۔ یہ قصہ انجیل اور قرآن کے طوفانِ نوح سے حرف بہ حرف ملتا ہے۔ جب گِل گامِش بہت اصرار کرتا ہے تو اُتنا پشتیم اسے شجرِ شباب کا پتہ بتاتا ہے جو کنوئیں میں اگتا ہے۔ گِل گامِش کنوئیں میں اترتا ہے اور شجرِ شباب حاصل کر لیتا ہے۔ اب

وہ خوش ہے کہ حیاتِ جاودانی نہیں ملی تو کیا ہوا، اس بوٹے کی مدد سے اریک کے سب بوڑھے اور وہ خود جوان ہو جائیں گے۔

مگر راستے میں اسے ایک باؤلی نظر آتی ہے۔ گل گامش شجرِ شباب کو کنارے پر رکھ کر باؤلی میں نہانے لگتا ہے۔ باؤلی میں ایک سانپ رہتا ہے۔ وہ بوٹے کی خوشبو پا کر باہر آتا ہے اور شجرِ شباب کو کھا جاتا ہے۔ گل گامش باؤلی سے باہر آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بوٹا غائب ہے۔ وہ روتا پیٹتا ناکام و نامراد اریک کی راہ لیتا ہے۔

گل گامش کی داستان دراصل ایک ہیرو متھ ہے۔ اس قسم کے ہیرو متھ قریب قریب ہر پرانی قوم اور ہر زبان میں موجود ہیں مثلاً فردوسی کے شاہ نامے میں رستم، نوشیرواں اور سکندر وغیرہ۔ ہومر کی اوڈیسی میں ہیراکلیس، مہابھارت میں ارجن، بھیم اور کرشن مہاراج اور رامائن میں رام اور لچھمن۔ اردو ادب کا دامن بھی اس دیو مالائی خزانے سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ امیر حمزہ اور حاتم طائی کی داستانیں ہیرو متھ کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ پنجاب کی لوک کہانیوں میں راجہ رسالو کا کردار بھی ہیرو متھ ہی ہے۔ ان سب فوقِ فطری داستانوں میں زمان و مکان کے فرق کے باوجود بہت سی باتیں مشترک ہیں اور یہ وہی باتیں ہیں جن سے متھ اور متھ کے کرداروں کی تشکیل ہوتی ہے۔

متھ قدیم انسان کا فلسفۂ حیات و کائنات ہے۔ قرونِ وسطیٰ اور اس سے پیش تر کا انسان مظاہرِ قدرت کی تخلیق اور موجوداتِ عالم کے اندازِ عمل و تغیر کی تشریح متھ کے ذریعے سے کرتا تھا۔ متھ ہی کی مدد سے وہ تخریبی طاقتوں کو خیالی طور پر تسخیر کرتا تھا اور مہربان طاقتوں کی حمایت حاصل کرتا تھا۔ متھ قدیم انسان کی پروازِ تخیل کی معراج ہے۔ اس کی سماجی آرزوؤں کا رنگین مرقع ہے اور اس کی تشنہ تمناؤں کی ذہنی تکمیل ہے۔ متھ اسے جہادِ زندگانی میں اعتماد، عزم اور قوتِ عمل عطا کرتا تھا۔ متھ کی دنیا اس کی خواہشوں کی تابع ہوتی تھی۔ متھ اس کی زندگی کو خوشگوار، بامعنی اور بامقصد بناتا تھا، اس کی جدوجہد کی راہیں متعین کرتا تھا اور ان راہوں کو ہموار کرتا تھا۔ متھ اس کے ہر ارادے کو پورا کر دیتا تھا اور اس ارادے کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوتی تھیں ان کو خیالی طور پر دور کر دیتا تھا۔ سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو متھ انسان کا بہت کارآمد حربہ تھا۔

متھ کی نوعیت خوابوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جس طرح ہمارے خواب ہماری تمام ممکن اور محال خواہشوں کو حقیقت کے روپ میں پیش کرتے ہیں اسی طرح متھ فوقِ فطرت باتوں کو بھی فطری پیکر میں پیش کرتا ہے۔ خواب کی مانند متھ میں عجوبہ اور ان ہونی باتیں روزمرہ کی چیزیں بن جاتی ہیں اسی لیے اساطیری داستانوں میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔ مُردے زندہ ہوسکتے ہیں، زندہ آدمی پتھر کا ہوکر دوبارہ انسان بن سکتا ہے، انسان کاٹھ کے گھوڑے یا سیم رُغ کی پیٹھ پر یا اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر دور دراز کا سفر پلک جھپکتے طے کرلیتا ہے اور سلیمانی ٹوپی اوڑھ کر لوگوں کے درمیان سے غائب ہوجاتا ہے۔ اس کے اشارے پر پہاڑ سنگ ریزے ہوجاتے ہیں اور سمندر کے اندر خشک راستہ نکل آتا ہے۔ اس کا عصا اژدہا بن جاتا ہے اور اژدہوں، درندوں اور گزندوں کو وہ یوں ہلاک کردیتا ہے جس طرح ہم مکھی مچھر ہلاک کرتے ہیں۔ جن، پری اور دیو، اس کے تابع ہوتے ہیں اور اس کے حکم سے چشمِ زدن میں عالی شان محل تعمیر کردیتے ہیں۔ اسے تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ غیبی طاقتیں ہر مشکل وقت پر اس کے کام آتی ہیں۔

دنیا کی سبھی زبانوں میں کہ معاشرے کے عہدِ طفلی کی تخلیق ہیں ایسی کہاوتیں بکثرت ملیں گی جن سے متھ اور خواب کی بنیادی خصوصیات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''رہیں جھونپڑی میں خواب دیکھیں محلوں کا'' یا ''بلّی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔'' یہ کہاوتیں اس سچائی پر دلالت کرتی ہیں کہ خواب میں ہم لاشعوری طور پر اپنی ان دبی ہوئی خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں جو بیداری میں پوری نہیں ہوتیں۔ متھ بھی قدیم انسان کے لیے سنہری زندگی کا سنہرا خواب تھا۔ محکوم انسان آزادی کے خواب دیکھتا ہے یا بھوکا لذیذ کھانوں کے خواب دیکھتا ہے، اسی طرح قدیم انسان عالمِ بیداری میں ان چیزوں کے خواب دیکھا کرتا تھا جن سے وہ محروم تھا۔ دونوں میں بس اتنا فرق ہے کہ خواب ہماری انفرادی خواہشوں کی تکمیل کا پرتو دکھاتے ہیں اور متھ سماج کی مجموعی خواہشوں کی منظر کشی کرتے ہیں اسی لیے متھ قوم کے اجتماعی خواب سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

خواب کی مانند متھ کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ متھ کا اندازِ اظہار تصویری ہوتا

ہے۔ جس طرح خواب میں انسان کا لاشعور قوتِ باصرہ کے علاوہ دوسرے حواس سے کم کام لیتا ہے اسی طرح متھ میں بھی الفاظ اور فقرے تصویریں بناتے ہیں اور پڑھنے یا سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ سینما کے پردے پر فلمی تصویریں دیکھ رہا ہے یا کسی نگار خانے کی سیر کر رہا ہے۔ چنانچہ اساطیری داستانوں کا تاثر بھی تصویری ہوتا ہے۔ مثلاً گل گامش کی داستان میں ہر واقعہ تصویروں کا ایک مرقّع ہے۔ اس داستان کو کہیں سے پڑھیے، آپ کے ذہن میں واقعات کی تصویر کھنچ جائے گی۔

اظہارِ خیال کا تصویری انداز قدیم انسان کے ذہنی ارتقا کے عین مطابق تھا کیونکہ اس کا ذہن فقط ٹھوس چیزوں کا ادراک کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تجریدی رشتوں کو بھی تصویر کی شکل دے دیتا تھا۔ چنانچہ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ ہمارے پرکھوں کی فنی تخلیق کے ابتدائی نمونے سب کے سب تصویری ہیں مثلاً مشرق میں جھیل بیکال سے لے کر مغرب میں فرانس تک اور شمال میں سویڈن سے لے کر جنوبی افریقہ تک غاروں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر جانوروں کی ہزاروں رنگین اور سادی تصویریں دستیاب ہوئی ہیں جو چالیس پچاس ہزار برس پرانی ہیں۔ یہ تصویریں دراصل ہماری سب سے پہلی کتابیں ہیں جن میں شکاری دور کے انسان نے اپنے قبیلے یا گروہ کو مسائلِ حیات اور ان کے حل سے آگاہ کیا ہے۔ یہ تصویریں بڑی معنی خیز ہیں اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ہم ان سے قدیم انسان کے مفہوم کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ابتدائی رسم الخط بھی تصویری ہوتے تھے۔ مثلاً اگر کتا بتانا ہو تو کتے کی تصویر بنا دیتے تھے، اگر مرد یا عورت بتانا ہو تو مرد یا عورت کی تصویر بنا دیتے تھے، گھر بتانا ہو تو گھر کی تصویر بنا دیتے تھے، دوستی کا رشتہ ظاہر کرنا ہوتا تو دو آدمیوں کو نیزہ یا کمان لیے ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دکھاتے تھے۔ رسم الخط کی شکلیں گو بدل چکی ہیں مگر تصویری علامتیں ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہیں۔ مثلاً ترازو ہنوز عدل کی علامت ہے۔ اظہارِ خیال کا یہ تصویری انداز بڑا اثر انگیز ہوتا تھا۔ چنانچہ آج بھی جب ہم کسی شاعر کے کلام کی تعریف کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ اس نے الفاظ کے ذریعے واقعات و احساسات کی تصویر کھینچ دی ہے۔

ہیرو متھ تین چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ اوّل ہیرو، دوئم مہم اور سوئم شجرِ مراد۔ ہیرو وہ

قوت ہے جس کے وسیلے سے متھ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کرتا ہے۔ مہم وہ شرطیں، رکاوٹیں، دشواریاں اور مخالف طاقتیں ہیں جو ہیرو اور اس کے مقصد کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔ متھ کے اندر وہ اژدہا، دیو، جادوگر اور دوسری بھیانک شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ شجرِ مراد وہ مقصد ہے جس کے لیے مہم اختیار کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ مہموں کو سر کرنا اور شجرِ مراد تک پہنچنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے حوصلے، جرأت اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ہیرو کی بڑائی کو ناپنے کا پیمانہ یہی ہے۔ جو ہیرو جتنا بڑا ہوگا اس میں یہ خصوصیات اتنی ہی زیادہ ہوں گی مگر ہیرو ایک فرد نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے کی قوتِ ارادی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے کارناموں کی اہمیت ذاتی نہیں بلکہ سماجی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق کسی ورائے شخصی واقع کی اجتماعی معنویت سے ہوتا ہے۔ اس کی خواہشیں اس کے اضطرابات و ہیجانات اور اس کی صعوبتیں روحِ عصر کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے متھ کے ہیرو اور "انسانِ کامل" (SUPER MAN) میں بنیادی فرق یہ ہے۔ انسانِ کامل کا نظریہ تاریخ کے اہم واقعات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی اور روحانی — افراد (بادشاہ، سیاسی لیڈر، فوجی جنرل یا پیر مرشد) کے ذاتی اعمال و رجحانات کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہیرو کی زندگی کے انفرادی واقعات ورائے شخصی اور اجتماعی حقیقتوں کا پرتو ہوتے ہیں۔ متھ اپنے ہیرو کی نجی زندگی کی تفصیلات میں نہیں جاتا بلکہ انھیں پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو ARCHETYPAL نمائندہ ہوتے ہیں۔

ہیرو متھ اَبوی نظامِ معاشرہ کی تخلیق ہیں چنانچہ سبھی دیومالائی داستانوں کے ہیرو مرد ہوتے ہیں مگر ان کی یہ مردانگی کئی مدارج سے گزری ہے۔ ہیرو اُموی نظام اور اس کے اثر سے جتنا قریب ہوگا مردانگی کا جوہر اس میں اسی نسبت سے کم ہوگا اور جو ہیرو اُموی نظام اور اس کے اثرات سے جتنا دور ہوگا جوہرِ مردانگی بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوگا۔ لیکن اموی نظام سے ہیرو کی قربت یا دوری زمانی نہیں بلکہ کیفیتی ہوتی ہے۔ اُموی نظام سے متاثر ہونے والے ہیرو میں شعور لاشعور کے تابع ہوتا ہے، اس پر نسوانیت کا غلبہ ہوتا ہے، وہ قوتِ عمل سے قریب قریب محروم ہوتا ہے، اس کی زندگی عورت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اس کی مثال چھوٹے بچوں کی

سی ہے جو ماں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے ہیں، اسی کی مرضی پر چلتے ہیں اور ان کی اپنی کوئی انفرادیت یا ذاتی شخصیت نہیں ہوتی۔ اندر سبھا کا ہیرو گلفام اور مثنوی سحرالبیان کا ہیرو بے نظیر ایسے ہی کردار ہیں۔ اندر سبھا کی داستان میں وہ برائے نام ہیرو ہیں۔

سبز پری گلفام نامی ایک کمسن شہزادے پر عاشق ہوتی ہے جو بام پر سو رہا ہے۔ وہ شعورِ خوابیدہ رکھنے والے ان صاجزادے کو اپنے گھر اٹھوا منگواتی ہے اور انھیں لاڈلا کہہ کر جگاتی ہے۔

سوتے ہو کیا بے خبر چھوڑ کے تم گھر بار
آنکھیں کھولو لاڈلے نیند سے ہوشیار

شہزادہ جاگتا ہے تو اسے اجنبی ماحول اور اجنبی عورت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے مگر ان نئے حالات میں اس کا طرزِ عمل کسی دلیرانہ اور پختہ کار نوجوان کا سا نہیں ہوتا بلکہ وہ بچوں کی طرح گھر والوں کے لیے روتا اور فریاد کرتا ہے اور سبز پری اسے یوں دلاسا دیتی ہے، جیسے ماں بچے کو دِلاسا دیتی ہے۔

سر پہ آنکھوں پہ کلیجے پہ بٹھاؤں تجھ کو
آمری جان گلے سے میں لگاؤں تجھ کو
دل و جاں سے مجھے بھاتی ہیں ادائیں تیری
پاس لا چاند سا منھ لے لوں بلائیں تیری

شہزادہ گلفام کی ضدیں بھی بچوں کی سی ہیں۔ وہ راجہ اندر کے دربار کا منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ سبز پری ایک دانا اور تجربہ کار عورت کی مانند اسے سمجھاتی ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دے مگر گلفام اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ آخر سبز پری اسے اپنے ہمراہ لے جاتی ہے۔ راجہ اندر کو گلفام کے آنے کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ شہزادے کو کنوئیں میں بند کر دیتا ہے آخر کار گلفام سبز پری کی کوششوں سے رہائی پاتا ہے۔ اس پوری داستان میں گلفام کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔ یہی کیفیت مثنوی سحرالبیان کے ہیرو شہزادہ بے نظیر کی ہے۔ جس وقت ماہ رخ پری اسے اٹھا لے جاتی ہے تو اس کی عمر بارہ برس کی ہوتی ہے۔

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ
ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

گلفام راجہ اندر کے حکم سے کنوئیں میں قید ہوتا ہے اور شہزادہ بے نظیر کو ماہ رخ پری، بدرِ منیر کے عشق کی پاداش میں کنوئیں میں قید کردیتی ہے۔ غرض دونوں ہی مجہول اور بے عمل ہیرو ہیں۔ عشق میں وہ پہل نہیں کرتے بلکہ پریاں ان پر عاشق ہوتی ہیں اور یہ پریاں ان کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہیں جس طرح ماں اپنے کم سن لڑکے کے ساتھ پیش آئے۔

دوسری قسم ان ہیروؤں کی ہے جن کا شعور بیدار ہوچکا ہے مگر وہ ہنوز لاشعور کے اثر میں ہیں۔ وہ سنِ شعور کو پہنچنے کے باوجود عورت کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اُموی نظام کی گرفت ڈھیلی ہوچکی ہے مگر بندھن ابھی تک ٹوٹے نہیں ہیں۔ وہ دلیر بھی ہوتے ہیں اور مہم کی سختیوں سے ڈرتے بھی نہیں مگر ان میں جرأتِ عمل اور جوہرِ مردانگی کی کمی ہوتی ہے۔ ان کا عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں عورت کہیں زیادہ صاحبِ عزم و حوصلہ کہیں زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ وہ حصولِ مقصد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتی۔ اسے نہ اپنی بدنامی کی پرواہوتی ہے اور نہ موت کا ڈر۔ پنجاب کی کلاسیکی داستانوں میں عورت مرد کے کردار کا یہ فرق بہت واضح ہے۔ چنانچہ ہیر کا کردار رانجھا سے کہیں زیادہ عظیم کردار ہے۔ وہ سماج کی مقدس اور مروّجہ قدروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ احتیاط اور مصلحت کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور قوتِ ارادی اور قوتِ عمل میں رانجھا سے بھی دو قدم آگے ہے۔ سسّی پنوں اور سوہنی مہینوال میں بھی ہیروئن کو ہیرو پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ عاشقوں کے سرتاج میاں مجنوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی دشت نوردی اور آبلہ پائی دراصل راہِ عمل سے فرار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں شجرِ مراد کو حاصل کرنے کی قوت اور صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ اس قسم کے تمام ہیروؤں کو ہم اُموی نظام کے درمیانی اور عبوری دور کا نمائندہ کہیں گے۔ اس عبوری دور میں شعور اور لاشعور کی کشمکش بڑی شدت اختیار کرجاتی ہے۔ شعور لاشعور پر اور اَبوی نظام اُموی نظام پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر شعور میں ابھی اتنی طاقت نہیں آئی ہے کہ وہ لاشعور کو مکمل طور پر اپنے تابع کرلے۔ دراصل ابھی

لاشعور کا پلہ بھاری ہے۔ ابھی اُموی نظام کو فوقیت حاصل ہے۔

کچھ عرصہ گزرا لاہور کے ایک اخبار میں کسی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مشرق کی اکثر رومانی داستانوں کی ابتدا عورت سے کیوں ہوتی ہے۔ مثلاً شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسّی پنوں، اور سوہنی مہینوال میں ہیروئن کا نام ہیرو سے پہلے کیوں آتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا باعث فقط صوتی روانی ہو مگر ان داستانوں کی اصل نوعیت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ہیرو دراصل عورت ہے اور مرد کا کردار اس سے کم رتبہ ہے۔ یعنی ان داستانوں پر اُموی نظام کا غلبہ ہے اور اسی وجہ سے عورت کو مرد کے کردار پر فوقیت ملی ہے۔ کیونکہ اموی نظام میں مرد کی حیثیت ثانوی ہوتی تھی۔

ہیرو کی تیسری قسم وہ ہے جس میں شعور لاشعور پر مکمل فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ ہیرو اُموی نظام اور اس کی اقدار کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔ اب وہ عورت کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں کرتا بلکہ عورت اس کی تابع ہوتی ہے۔ ہیرو کا جوہرِ مردانگی اب پورے عروج پر ہے۔ اس کا شعور اب بالکل بیدار ہے۔ اس کی ہر مہم لاشعور کی فتح کو اور مستحکم کرتی ہے اور اس کی مردانہ شخصیت کو اور ابھارتی ہے۔ اُموی نظام کے باقی ماندہ اثرات کو زائل کرتی ہے اور ابوی نظام کو تقویت بخشتی ہے۔ اب وہ نسوانی آزمائشوں کے جال میں نہیں پھنس سکتا۔ اب کوئی شے اسے نخلِ مراد تک پہنچنے اور اپنی خواہش پوری کرنے سے روک نہیں سکتی۔ گل گامش، ارجن، رام چندر، ہرا کلیس، رستم، سکندر، راجہ رسالو اور حاتم طائی ایسے ہی ہیرو ہیں۔ وہ ہیرو متھ کی معراج ہیں۔

ہیرو سورج کے قبیلے کا متھ ہے۔ سورج جو شعور ہے، علم ہے، روشنی ہے اور زندگی ہے۔ چنانچہ آرین دیو مالا کے اکثر ہیرو ''سورج بنسی'' ہوئے ہیں۔ کیونکہ سورج دیوتا نے ان کی ماں کے ساتھ صحبت کی تھی۔ گل گامش بھی سورَنہ بنسی ہے لہٰذا شمس دیوتا ہر نازک موقع پر گل گامش کی حفاظت اور حمایت کرتا ہے۔ گل گامش کی ہر التجا منظور کرتا ہے۔ اسے نیک مشورہ دیتا ہے اور اسے تاریکی سے نکالتا ہے۔ سورج ہیرو کی علامت ہے۔ سورج جو ہر صبح تاریکی کے بطن سے نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا جاتا ہے مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے اپنی موت سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے تا آنکہ شام ہو جاتی ہے اور اس کا سفینۂ

حیات مغرب کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ دیومالائی ہیرو بھی اسی طرح ماں کے بطن سے جو تاریک ہے پیدا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ماں کے تسلّط سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔ اس کا شعور بیدار ہوتا جاتا ہے۔ کامیابیاں اس کا قدم چومتی ہیں مگر آخر کار اس کا نقطۂ عروج آ پہنچتا ہے اور آفتاب کی مانند اسے بھی شامِ زندگی کا خوف ستانے لگتا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا لیکن اس کا ہر قدم اسے موت سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔ گِل گامش، اُتنا پشتیم سے شجرِ حیات کا طالب ہوتا ہے۔ سکندر خضر سے آبِ حیواں کی راہ پوچھتا ہے۔ گِل گامش کو شجرِ حیات تو نہیں ملتا البتہ نخلِ شباب مل جاتا ہے مگر وہ بھی سانپ کی نذر ہو جاتا ہے اور اب وہ اپنی تقدیر پر قناعت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سکندر آبِ حیواں کا راستہ بھول جاتا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں عزرائیل اسے موت کی پیشین گوئی سناتا ہے۔

گِل گامش کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک تاریخی دوسری دیو مالائی۔ مگر زیرِ بحث داستان کو گِل گامش کی تاریخی شخصیت سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ تاریخی شخصیت محدود شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اساطیری شخصیت بڑی لامحدود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داستان میں فقط تمہید کے طور پر یا داستان کو صداقت کا رنگ دینے کی خاطر گِل گامش کی ملک گیری اور مطلق العنانی اور عیش پسندی کی جانب ہلکا سا اشارہ کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی سبب سے گِل گامش اور آگا فرماں روائے کیش کے تصادم کے تذکرے کو داستان میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ یہ خالص تاریخی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں نہ کسی دیوی دیوتا کا ذکر ہے اور نہ فریقین کوئی فوق الفطرت کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس داستان میں گِل گامش کی اساطیری شخصیت کو اچھی طرح سے نمایاں کیا گیا ہے۔ داستان کی ابتدا دراصل اس مقام سے ہوتی ہے جہاں پہنچ کر گِل گامش کی تاریخی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔

اِن کدو کا کردار اور گِل گامش سے اس کا رشتہ بظاہر بڑا پیچیدہ معلوم ہوتا ہے مگر عہدِ قدیم کے قصوں میں دو متضاد شخصیتوں کا اتحاد بڑی عام بات تھی۔ دراصل یہ متضاد شخصیتیں ایک ہی ہستی کے متضاد پہلو ہیں جن کے میل سے پوری شخصیت کی تعمیر کی جاتی تھی۔ ان جڑواں شخصیتوں میں کبھی بھائی بھائی کا رشتہ ہوتا تھا، کبھی باپ بیٹے کا، کبھی میاں بیوی کا، کبھی آقا

اور غلام کا اور کبھی دو دوستوں کا۔ ان میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہابیل اور قابیل، رستم اور سہراب، یزداں اور اہرمن (پانچویں صدی عیسوی کے ارمنی مؤرخ کوگھپؔ کے بیان کے مطابق یہ دونوں جڑواں بھائی تھے)۔ رام اور لچھمن، موسیٰ اور ہارون، ابراہیم اور اسماعیل اور تھیلو اور ایاگو، میکبتھ اور لیڈی میکبتھ، ڈان کوئیک زوٹ اور سانچو پانزا، گل گامشؔ اور اِن کدوؔ سب جڑواں شخصیتیں ہیں۔ نفسیات کے عالم ان میں سے ایک کو انسان کے شعور اور دوسرے کو اس کے لاشعور سے تعبیر کرتے ہیں۔

قدیم انسان واحد شخصیت کی تعبیر دو متضاد شخصیتوں کو ملا کر اس لیے کرتا تھا کہ وہ حقیقت کا شعور اس کی ضد کے بغیر کر ہی نہیں سکتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ہیراکلؔ لائیٹس سے مارکس تک اکثر فلسفیوں نے قانونِ تغیر کی تشریح اجتماعِ ضدین ہی کے نظریے سے کی ہے اور سائنس کا نظریہ ’ارتقا بھی قدیم انسان کے اسی اندازِ فکر کی تائید کرتا ہے۔ ان فلسفیوں کے مطابق ہر شے کے اندر ہی اس کی نفی بھی موجود ہوتی ہے اور دونوں کے تصادم سے ایک تیسری حقیقت ظہور میں آتی ہے۔ ہر شے اپنے داخلی تناؤ سے ترقی کرتی ہے جیسے کمان کہ کھنچتی بھی ہے اور تیر کو آگے بھی پھینکتی ہے۔ قدیم انسان ساری کائنات کو تضادات کا مجموعہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک دن رات، سردی گرمی، روشنی تاریکی، پستی بلندی سب متضاد وحدتیں تھیں۔ وہ کسی حقیقت کا اس کی ضد کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں فرائڈ نے کے ایبلؔ کی ایک تصنیف کا حوالہ دیا ہے جس میں لسانیات کے اس جرمن عالم نے دنیا کی قدیم زبانوں سے بہت سے ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے ہیں جو کسی شے اور اس کی ضد دونوں کی بیک وقت نمائندگی کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں دیوتا اور دیو، اندھیرا اور اجالا، اونچا اور نیچا، بڑا اور چھوٹا، موٹا اور دُبلا، قوی اور ضعیف اور اسی نوع کے دوسرے بہ کثرت متضاد تصورات کو واحد لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

”ہمارے تصورات موازنے اور مقابلے سے ابھرتے ہیں۔ اگر ہمیشہ روشنی ہوتی تو ہم روشنی اور تاریکی میں تمیز ہی نہ کر سکتے۔ چنانچہ نہ ہم روشنی کا تصور کر سکتے اور نہ ہمارے پاس روشنی کے لیے کوئی لفظ ہوتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کرۂ

ارض پر ہر شے اعتباری ہے۔ وہ اسی حد تک آزاد وجود رکھتی ہے جس حد تک اسے دوسری چیزوں سے تمیز کیا جا سکے۔ چونکہ ہر تصور اپنی ضد کا جڑواں بھائی ہے اس لیے اس ضد کے پیمانے سے ناپے بغیر اس کا خیال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس خیال کو دوسروں تک پہنچایا کیسے جا سکتا تھا۔ چونکہ قوت کا کوئی تصور ضعف کے تصور کے بغیر محال تھا لہٰذا جو لفظ قوی کی علامت بنا اسی نے ضعیف کی یاد دہانی بھی کی۔ انسان نے اپنے سب سے قدیم اور سب سے سہل تصورات بھی ان کی ضد کا تصور کیے بغیر حاصل نہیں کیے۔ اس نے ANTITHESIS کے دونوں پہلوؤں کو الگ کرنا اور ان کا دوسرے سے مقابلہ کیے بغیر علیحدہ تصور کرنا آہستہ آہستہ سیکھا۔"

اِن کدو پر گل گامش کی فتح لاشعور پر شعور کی فتح تھی۔ اب لاشعور شعور کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کا بھائی اور رفیق بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ عقل عشق کی رہنمائی کرنے لگتی ہے۔ فکر اور جذبے کا یہ آہنگ نہایت صحت بخش اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان اگر سرتا پا شعور ہو جائے اور اس کے کردار میں عشق و جذبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تو سماج کا جمالیاتی پہلو مجروح ہو جائے۔ تہذیب اپنی تمام لطافتوں اور نفاستوں سے محروم ہو جائے۔ کیونکہ شعر و نغمہ، رقص و مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا وجود جذبے ہی کے دم سے ہے۔ شعور اور لاشعور کا یہ توازن جب تک گل گامش اور اِن کدو کی دوستی کی شکل میں قائم رہتا ہے ہمارا ہیرو ہر مہم میں کامیاب ہوتا ہے مگر اس کی فتح لاشعور کو مجہول بناتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کدو، گل گامش کو ان مہم بازیوں سے بار بار منع کرتا ہے اور حمابا کے پھاٹک کو اکھاڑنے کے بعد تو اس کے بازو ہی شل ہو جاتے ہیں۔ انجام کار شعور کا غلبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ لاشعور کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن لاشعور کی موت زندگی کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنی شعور کی موت۔ چنانچہ اِن کدو کی موت کے بعد گل گامش کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ موت کے خوف سے وہ قریب قریب دیوانہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اصل نظم کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے ان علامتوں کی تشریح ضروری ہے جو اس نظم کو بہت معنی خیز بناتی ہیں۔ سب سے اہم علامت شجرِ حیات کی ہے۔

شجرِ حیات

شجرِ حیات کا تصور اس ابتدائی دور کی یادگار ہے جب انسان فقط پھل پھول اور جڑی بوٹیاں کھا کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اشجار ہی اس کے حیات کے ضامن تھے اور اسے طاقت و توانائی بخشتے تھے۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا اور اشجار کی اہمیت اور افادیت انسان کے تحت الشعور میں اس طرح رچ بس گئی کہ شجری دور کے گزر جانے کے بعد بھی وہ اشجار کے تاثر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کا خیال آفریں ذہن اشجار کی تاثیر میں اضافہ ہی کرتا گیا اور اس نے اشجار سے وہ خواص بھی منسوب کر دیے جو ان میں موجود نہ تھے۔ (چنانچہ آج بھی جڑی بوٹی اور سلاجیت بیچنے والے ان چیزوں سے ہر مرض کا علاج کرنے کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں)۔ درختوں کی پوجا ہونے لگی کیونکہ درخت دیوتاؤں کے مسکن قرار دیے گئے۔ رفتہ رفتہ درخت بجائے خود زندگی کی علامت بن گیا۔ چنانچہ رگ وید میں لکھا ہے کہ وشوا کرما نے جو خالقِ کائنات ہے دنیا کو درخت سے بنایا۔ ایران کا دیوتا مہر داد (سورج) درخت کی چوٹی سے پیدا ہوا تھا اور مصریوں کا اُزریس دیوتا درخت کے کھوکھلے تنے میں دفن ہوا تھا۔ تب اس کو دوبارہ زندگی ملی تھی اور حضرت موسیٰ کے والدین نے ان کو (روایت کے مطابق) لکڑی کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ اس طرح ان کی جان بچی تھی۔ حضرت مسیحؑ سے بہت پہلے قدیم مصریوں اور دروزیوں میں لکڑی کی صلیب اسی وجہ سے زندگی کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ وہ درخت سے مشابہ ہوتی تھی۔ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھنے کے بعد ہی حیاتِ جاوداں عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ سڑاس برگ (جرمنی) کے ایک کلیسا میں حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی جو تصویر نقش ہے اس کی صلیب بالکل درخت کی ہم شکل ہے۔ اسی طرح ایران کی پرانی تصویروں میں شجرِ حیات کثرت سے نظر آتا ہے۔ شجرِ حیات کا یہ موتیف ایرانی قالینوں میں تو اب تک رائج ہے۔

فلسطین کی پرانی قومیں بھی شجرِ حیات کے متھ سے بخوبی واقف تھیں۔ چنانچہ انجیل کی کتابِ پیدائش میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے آدم اور حوّا کو بہشتِ عدن میں رکھا اور "باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔" اور آدم اور حوّا کو تنبیہہ کر دی

کہ خبردار ان درختوں کو نہ چھونا اور نہ ان کا پھل کھانا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے مگر سانپ نے حوّا کو بہکا کر درخت کا پھل کھلا دیا اور حوّا نے یہ پھل آدم کو بھی کھلایا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں اپنی عریانی پر شرم آنے لگی۔ خدا کو جب یہ معلوم ہوا کہ ''انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا'' تو اسے اندیشہ ہوا کہ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ زندہ رہے اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا اور ''باغِ عدن کے مشرق کی طرف کرّوبیوں کو اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی حفاظت کریں۔'' باغِ عدن کا جو نقشہ کتابِ پیدائش میں کھینچا گیا ہے وہ عراق کے مشہور شہر بابل کا ہے۔

شجرِ حیات کا ذکر نئے عہد نامے میں بھی آیا ہے چنانچہ یوحنّا عارف کے مکاشفے میں خدا اپنے برگزیدہ بندوں سے وعدہ کرتا ہے کہ جو برائیوں پر غالب آئے میں اسے اس زندگی کے درخت میں سے جو خدا کے فردوس میں ہے پھل کھانے کو دوں گا۔ خدا نے یوحنّا کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ ''میں پیاسے کو آبِ حیات کے چشمے سے مفت پلاؤں گا۔'' یوحنّا عارفِ کامل تھے لہٰذا فرشتے نے انھیں آسمانی یروشلم کی سیر بھی کروائی اور ''بلور کی طرح چمکتا ہوا آبِ حیات کا دریا دکھایا جو خدا اور مسیح کے تخت سے نکل کر اس شہر کی سڑک کے بیچ میں بہتا تھا اور دریا کے آر پار زندگی کا درخت تھا۔''

شجرِ حیات کے قبیلے کی ایک چیز امرت پھل بھی تھی۔ چنانچہ یہی امرت پھل بیتال پچیسی کے برہمن کو تپسیا کے انعام میں دیوتاؤں سے ملا تھا اور برہمن نے یہ پھل براہمنی کو دیا تھا لیکن براہمنی نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ تب برہمن نے امرت پھل کو راجہ بھرتری کو نذر کیا تھا اور راجہ نے اسے اپنی چہیتی رانی کو کھانے کو دیا تھا اور رانی نے اپنے آشنا کوتوال کو دیا تھا اور کوتوال نے اپنی محبوبہ ایک بیسوا کو دیا تھا اور بیسوا نے اپنے من میں دچارا تھا کہ یہ پھل راجہ کو دینے یوگ ہے۔ یہ بات اپنے من میں ٹھہرا کر وہ پھل راجہ کو دے آئی تھی اور راجہ بھرتری نے اداس ہو کر سوچا تھا کہ اس سنسار کی مایا کسی کام کی نہیں اور راج پاٹ چھوڑ کر جوگی بن گیا تھا۔

اَمر بننے کی خواہش عراق اور فلسطین تک محدود نہیں ہے بلکہ بڑی عالم گیر خواہش ہے مثلاً

ہندو دیو مالا میں حیاتِ جاوداں اُمرت پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ جسے اُمرت مل جائے وہ امر ہو جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ دنیا کی سب چیزیں سمندر کو متھنے سے پیدا ہوئیں۔ سمندر کو متھنے کا کام پروش اور راکششوں کے سپرد تھا۔ جب سب چیزیں سمندر سے نکل چکیں تو دھنونتری مہاراج جو دیوتاؤں کے وید تھے اُمرت کو چاند کے پیالے میں لیے ہوئے سمندر سے نکلے۔ امرت کا پیالہ دیکھ کر بھی پردش اور راکشش ان کی طرف لپکے۔ راہو نامی راکشش سب سے آگے تھا۔ اس نے پیالے کو دھنونتری کے ہاتھ سے چھین کر منھ کو لگا لیا مگر ابھی اُمرت کا گھونٹ اس کے حلق سے نیچے نہ اترا تھا کہ دیوتاؤں نے اس کا سر قلم کر دیا۔ (اس کا دھڑ مٹی میں مل گیا لیکن اس کا سر امر ہو گیا۔ تب سے راہو کا سر چاند کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ وہ چاند کو منھ میں رکھ لیتا ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے مگر اس کی گردن کٹی ہوئی ہے اس لیے چاند دوسری طرف سے نکل جاتا ہے) امرت کا پیالہ راکششوں کے قبضے میں آ گیا تو وشنو مہاراج کو یہ فکر ہوئی کہ کہیں راکشش امرت پی کر امر نہ ہو جائیں۔ پس وہ ایک سندر ناری کے روپ میں ان کے بیچ میں آئے اور اپنے ناچ سے راکششوں کا من موہ لیا اور راکششوں کو امرت پینے کی سدھ نہ رہی تب موقع پا کر وشنو نے امرت کا پیالہ راکششوں کے ہاتھ سے چھین لیا اور دیوتاؤں کے حوالے کر دیا۔

یہی آبِ حیات فارسی اور اردو ادب میں بھی ابدیت کی علامت بن کر داخل ہوا ہے۔ چنانچہ فارسی اور اردو کے ان اشعار کا مجموعہ اگر مرتب کیا جائے جن میں آبِ حیات کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو سکتا ہے۔ آبِ حیات کے قصے کو غالباً سب سے پہلے فردوسی نے بڑی تفصیل سے نظم کیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ قصہ قرآن شریف کے ان مفسّروں کے ذریعے اسلامی دنیا میں رائج ہوا ہوگا جنھوں نے سورۂ الکہف کے ''مردِ بزرگ'' کو حضرتِ خضرؑ سے تعبیر کیا اور پھر آبِ حیواں کا قصہ سامی اور عراقی داستانوں سے لے کر خضر، سکندر اور آبِ حیواں کا فرضی قصہ بھی گھڑ لیا۔ فردوسی کا سکندر بھی تاریخی سکندر نہیں بلکہ افسانوی ہیرو ہے۔ وہ ہندوستان، مصر، حبشہ اور دوسرے مشرقی ملکوں کو فتح کرنے کے بعد شہر ہرُوم میں آتا ہے جہاں عورتیں حکومت کرتی ہیں۔ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ لشکر سمیت مغرب کا رخ کرتا ہے۔ راستے میں اس کا گزر ایک شہر میں ہوتا ہے اور وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اس علاقے

میں قابلِ دید چیز کیا ہے تو ایک پیرِ مرد اسے جواب دیتا ہے کہ:

یکے آب گیراست ازاں سوئے شہر — کز اں آب کس رانہ دیدیم بہر

(شہر کے اس طرف ایک جھیل ہے — کہ ہم نے اس میں سے کسی کو پانی لیتے نہیں دیکھا)

کہ خورشیدِ تاباں چو ں آں جارسید — برآں ژرف دریا شود ناپدید

(کیونکہ سورج جب وہاں پہنچتا ہے — تو پانی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے)

خردیافتہ مردِ یزداں پرست — بدودر یکے چشمہ گوید کہ ہست

(ایک دانش مند بندۂ خدا کہتا ہے — کہ اس تاریکی میں ایک چشمہ ہے)

کشادہ سخن مردیارائے وکام — ہمی آبِ حیوانش خواند بہ نام

(وہی عاقل اور سخن ور — اسے آبِ حیواں کہتا ہے)

چنیں گفت روشن دلِ پر خرد — کہ ہر کآبِ حیواں خورد کے مُرد

(اور وہ یہ بھی کہتا ہے — کہ جو آبِ حیواں پی لے وہ کب مرتا ہے)

سکندر نے وہاں جانے کا عزم کیا۔ فوج کو شہر میں چھوڑا اور ایک رہبر کو ساتھ لے کر آبِ حیواں کی تلاش میں چل نکلا۔ اس رہبر کا نام خضر تھا۔ راستے میں خضر نے سکندر کو سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ:

اگر آبِ حیواں بہ چنگ آوریم — بسی بر پرستش درنگ آوریم

(اگر ہمیں آبِ حیواں مل گیا — تو ہم عبادت میں کوتاہی کریں گے)

نمیرد کسے کوروان پرورد — بہ یزداں پناہد زراہِ خرد

(جو اپنی روح کی پرورش کرے — وہ از رُوئے عقل خدا کی پناہ میں چلا جاتا ہے)

مگر سکندر نہ مانا تب خضر نے کہا کہ میرے پاس دو مہرے ہیں کہ پانی دکھاؤ تو اندھیری رات میں آفتاب کی مانند چمکتے ہیں:۔

یکے راتو برگیر در پیش باش — نگہبانِ جان وتنِ خویش باش

(ان میں سے ایک تُو لے لے اور آگے چل — اور اپنی جان وتن کی نگہبانی خود کر)

دِگر مہرہ باشد مرا شمعِ راہ — بہ تاریکی اندر شوم پاسپاہ

(دوسرا مہرہ مجھے راستہ دکھائے گا	میں تاریکی میں معہ فوج کے چلوں گا)

یہ لوگ دو دن اور دو رات چلتے رہے۔ کسی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ راستہ بہت تاریک تھا:

سد یگر بہ تاریکی اندر دوراہ	پدید آمد و گم شد از خضر شاہ
(پھر اس تاریکی میں ایک دوراہہ ملا	اور بادشاہ کا ساتھ خضر سے چھوٹ گیا)
پیمبر سوئے آبِ حیواں کشید	سرِ زندگانی بہ کیواں کشید
(نتیجہ یہ ہوا کہ خضر تو آبِ حیواں کی راہ پر چل پڑے	اور ان کی زندگی جاوداں ہوگئی)
بر آں آبِ روشن سر و تن بہ شُست	نگہ دار جز پاک یزداں نہ جُست
(انھوں نے اس شفاف پانی سے اپنا سر اور جسم دھویا	اور خدا کے سوا کسی کو اپنا محافظ نہ بنایا)
بخورد و بیاسود و برگشت زود	ستائش ہمی با آفریں برفزود
(پانی پیا، آرام کیا اور بہت جلد واپس آ گئے	اور خدا کی تعریف میں اضافہ کرتے رہے)

اور سکندر راستہ بھول کر کہیں اور جا نکلا اور آبِ حیواں سے محروم ہوگیا۔

موت سے نجات پانے کی یہ آرزو مشرقِ بعید کے ملک میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً چین کے قدیم فلسفی کوہونگ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اپنی عمر کا آخری زمانہ اس نے امرت کی گولیاں تیار کرنے میں بسر کیا۔ اس کا نسخہ بہت آسان تھا۔

ڈیڑھ سو اصلی شنگرف لو اور اسے آدھا سیر سفید شہد میں خوب حل کرو، اس مرکب کو دھوپ میں سکھاؤ پھر آگ پر رکھ کر اسے اتنا نرم کرو کہ اس کی گولیاں آسانی سے بن سکیں۔ یہ گولیاں پٹو (سن) کے بیج کے برابر ہوں۔ ہر روز دس گولیاں صبح سویرے کھائی جائیں۔ ایک سال کے اندر سفید بال سیاہ ہو جائیں گے، نئے دانت نکل آئیں گے اور جسم میں توانائی آ جائے گی۔ اگر بوڑھا آدمی یہ دوا زیادہ عرصے تک استعمال کرے تو وہ جوان ہوجائے گا اور جو شخص یہ گولیاں تمام عمر باقاعدگی سے کھائے گا وہ کبھی نہیں مرے گا۔

سانڈ اور سانپ

دو علامتیں اور بھی تشریح طلب ہیں۔ ایک ثورِ فلک دوسرا سانپ۔ علمائے نفسیات ان

جانوروں کو بلکہ تمام اساطیری جانوروں کو لاشعور کی علامت قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کی رائے میں ان جانوروں کا تعلق اُموی نظام سے ہے۔ چنانچہ یہ علما جانوروں پر انسان کی فتح کو لاشعور پر شعور کی فتح سے تعبیر کرتے ہیں لیکن علم الانسان کے محققین اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

یوں تو گائے بیل کا شکار ابتدائی حَجری دور میں بھی کیا جاتا تھا اور لیسکا فرانس کے غاروں میں سحر زدہ اور زخمی گایوں بیلوں کی بہ کثرت رنگین تصویریں دیواروں پر بنی ہیں۔ یہ تصویریں پندرہ تا پچاس ہزار برس پرانی ہیں مگر اس زمانے میں ان جانوروں کی حیثیت شکار کے دوسرے جانوروں سے مختلف نہ تھی اور نہ انھیں کوئی دیومالائی اہمیت حاصل تھی۔ البتہ جب کھیتی باڑی کی ابتدا ہوئی تو گائے بیل کا افادی پہلو دوسرے جانوروں سے زیادہ نمایاں ہوگیا۔ بیل کا تصور، فصلوں کی فراوانی اور زمین کی زرخیزی سے وابستہ ہوگیا اور بیل کو ہلاک کرنا یا اس کی قربانی دینا زمین کے اُپجاؤ پن کو بڑھانے اور اناج کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ٹھہرا مثلاً جزیرہ کریٹ کے لوگ دو سال میں ایک بار ایک تہوار مناتے تھے اور اس موقع پر ایک زندہ بیل کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھا جاتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق سبزی اور انگوری شراب کے دیوتا ڈائیونی سس DIONYSUS کو دشمنوں نے اس وقت قتل کیا تھا جب وہ بیل کا روپ اختیار کیے ہوئے تھے۔ مشرقی پروشیا (جرمنی) میں جب فصلیں ہوا میں لہراتی تھیں تو کہتے تھے کہ بیل کھیت میں سے گزر رہا ہے۔ کھیت کے کسی ٹکڑے میں اگر فصل بہت اچھی ہوتی تھی تو کہتے تھے: ''یہاں بیل لیٹا ہوا ہے''۔ اگر فصل کاٹنے والے کو چوٹ لگ جاتی تو لورین کے لوگ کہتے تھے کہ ''اس کو بیل نے مارا ہے۔''

فصل کی کٹائی کے بعد بیل کی قربانی عام تھی۔ چنانچہ ایتھنز (یونان) میں جون کے آخر یا جولائی کے شروع میں جب اناج کھلیانوں سے گھروں پر پہنچ جاتا تھا تو بیل کی قربانی کرتے تھے۔ اس تیوہار کو یونانی زبان میں بوفونیا کہتے تھے۔ یعنی بیل کو قتل کرنے کا تیوہار۔ اس موقعے پر گندم، جو کا گندھا ہوا آٹا خداوند زیوس کے معبد کی قربان گاہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور بہت سے بیل قربان گاہ کے گرد ہنکائے جاتے تھے۔ جو بیل آٹا کھا لیتا تھا اس کو پکڑ کر قربان کر دیتے تھے۔ اسی طرح گنی کے جزیرے میں ہر سال دو بیلوں کو قربان کرتے تھے تاکہ فصل اچھی ہو۔ چین کے ہر صوبے

اور ضلعے میں موسمِ بہار کی آمد پر قربانی کا تیوہار منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر بیل کا مٹی یا کاغذ کا بہت بڑا پتلا بنایا جاتا تھا اور اس کے پیٹ میں پانچ قسم کا اناج بھر دیا جاتا تھا پھر اس پُتلے کو جلا دیتے تھے یا مار کر توڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد ایک زندہ بیل کی قربانی کی جاتی تھی۔

قدیم ایرانی مذہب میں (متھراس دیوتا) بیل کی قربانی فصلوں کی فراوانی کی علامت تھی۔ چنانچہ ایسے مجسمے بہ کثرت دستیاب ہوئے ہیں جن میں متھراس بیل کی پیٹھ پر جھکا ہوا اس کی پسلی میں چھرا گھونپ رہا ہے اور اس کے پیٹ سے خون کے بجائے اناج کی بالیں نکل رہی ہیں۔

جزیرہ کریٹ کے دیو مالا میں بھی بیل کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ وہاں ہر سال بیل کی قربانی کا تیوہار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ وہاں کے بادشاہ مینوس نے ایک بار لالچ میں آ کر سب سے عمدہ بیل کو قربان کرنے کے بجائے اپنے مویشی خانے میں بھیج دیا اور دیوتا کو ایک معمولی درجے کے بیل کی قربانی دے کر ٹال دینا چاہا مگر دیوتا بہر حال دیوتا تھا اس نے بادشاہ کو یہ سزا دی کہ اس کی بیوی خوبصورت بیل پر عاشق ہوگئی اور ملکہ کے پیٹ سے ایک ایسا جانور پیدا ہوا جس کا آدھا دھڑ انسان کا تھا اور آدھا بیل کا۔ یہ بیل آدم خور تھا اور ہر سال سات نوجوان مرد اور سات نوجوان عورتیں اس کی خوراک بنتے تھے۔ آخر کار ایک یونانی ہیرو تھی سیس THESEUS نے اسے ہلاک کیا۔

غرضیکہ گائے بیل کا زراعت اور افزائش سے تعلق ہر جگہ مسلّم ہے چنانچہ فرعون بھی اپنے مشہور خواب میں سات موٹی گائیں اور پھر سات دُبلی گائیں دیکھتا ہے اور حضرت یوسفؑ اس خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مصر میں سات سال تک فصلیں بہت اچھی ہوں گی اور اس کے بعد سات سال تک سخت قحط پڑے گا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ گل گامش کی داستان میں جب عشتار اپنے باپ انُو کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ثورِ فلک بنادے تو انُو ایک بڑی معنی خیز بات کہتا ہے۔

اگر میں نے تیری خواہش پوری کردی\
تو دنیا میں سات سال تک قحط رہے گا\
اور اناج کے دانے کھوکھلے ہو جائیں گے۔

کیا تو نے لوگوں کے لیے کافی اناج فراہم کر لیا ہے
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست ہو گیا ہے

اور عشتار دیوی جواب میں کہتی ہے کہ ہاں میں نے اناج اور چارے کا انتظام کر لیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیل کا رشتہ زراعت سے بہت گہرا اور بہت قدیم ہے اور بیل کی قربانی کرنا شروع ہی سے مذہبی فریضے میں داخل تھا چنانچہ گل گامش نے بیل کی غالباً کوئی بڑی قربانی کی ہوگی جس نے شاعر کے تخیل میں باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کر لی یا پھر سومیر میں تیوہار کے موقع پر بیل کو باقاعدہ لڑ کر ہلاک کرنے کی رسم تھی جیسے اسپین میں سانڈ اور انسان کی لڑائی ہوتی ہے۔

سانپ کے بارے میں قدیم انسان کے جذبات مِلے جُلے سے ہیں۔ وہ کبھی سانپ کو دیوتا مان کر اس کی پوجا کرتا ہے، کبھی اپنا دشمن سمجھ کر اس سے ڈرتا اور نفرت کرتا ہے اور کبھی وہ سانپ کو حیاتِ ابدی کی علامت سمجھنے لگتا ہے۔ ہمیں سانپ اور انسان کے رشتے کی عہد بہ عہد تاریخ نہیں لکھنی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سانپ زمانہ قبل از تاریخ کا بہت پرانا دیوتا ہے اور بعض محقق (ای جرٹن سائیکس) تو ''مشرق کی ناگی دیومالا'' کو ماتا دیوی سے بھی قدیم خیال کرتے تھے۔ مشرق میں سانپ کی پرستش آریاؤں کی یلغار سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ویدوں میں کئی ایسی ناگا قوموں کا ذکر آیا ہے جن سے آریا حملہ آوروں کی جنگیں ہوئی ہیں۔ مثلاً شیش ناگ ہے جو ایک ہزار سر کا دیوتا ہے۔ وہ مار پرستوں کا راجہ ہے اور پاتال پر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح مدائن (مغربی ایران) کے بادشاہ آریوں سے پیش تر مار پرست تھے۔ آریاؤں نے ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد یہاں کے جن مقامی دیوتاؤں کو اپنایا ان میں سانپ بھی تھا۔ مگر ان کی اس یگانگت میں بھی بے گانگی اور مخاصمت کا پہلو جھلکتا تھا۔ مثلاً زرتشتی عقیدے کے مطابق ایک سانپ آزی واہکا نے خداوند اہورمزدا کی پہلی فانی تخلیق مایا کو مار کر دو ٹکڑے کر دیے تھے۔ سانپ سے ایرانیوں کی دشمنی ضحاک کی داستان میں بہت واضح ہو جاتی ہے۔ بادشاہ ضحاک کے شانوں پر ظلم کے باعث دو آدم خور سانپ نکل آئے تھے۔ آخر ایک ایرانی ہیرو انھیں ہلاک کرتا ہے اور ملک کو بادشاہ کے مظالم سے نجات دلواتا ہے۔

آریائی قومیں سانپ کو شاید اس وجہ سے برے روپ میں پیش کرتی تھیں کہ وہ مفتوح

قوموں کا دیوتا تھا اور اس کے اثر کو کم کیے بغیر آرین دیوتاؤں کا تسلط مفتوح قوموں پر نہیں قائم ہوسکتا تھا مگر سانپ سے نفرت کا جذبہ سامی قوموں میں بھی پایا جاتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سانپ ان کے سابق مصری آقاؤں (فرعون) کا شاہی نشان تھا۔ انجیل کے مطابق شیطان حضرت حوّا کے پاس سانپ ہی کی شکل میں آیا تھا اور انھیں شجرِ ممنوعہ سے پھل توڑ کر کھانے کی ترغیب دی تھی اور پھر انسان حیاتِ ابدی سے محروم ہو گیا تھا۔

مصری دیومالا میں سانپ کا مقام بلند ہے۔ چنانچہ جنوبی مصر کی تاجدار دیوی سانپ ہی ہے۔ فراعنۂ مصر کے تاج پر بھی سانپ بنا رہتا تھا۔ فرعون سیتی اوّل (چودھویں صدی قبلِ مسیح) کے مندر میں بادشاہ اور دیوی ازیس (عشتار) کی جو تصویریں بنی ہیں ان میں فرعون کے تاج پر ایک سانپ ہے اور ازیس کے تاج پر دو سانپ ہیں۔ اریک کے بادشاہِ اِن میکر کا ایلچی ارا تا کے بادشاہ سے اپنے آقا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''میرا آقا سومیر کا مارِ عظیم ہے۔'' فرعونی جادوگر حضرت موسیٰؑ کو ڈرانے کے لیے سانپوں ہی کے کرشمے دکھاتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کا عصا بھی سانپ بن کر انھیں نگل جاتا ہے۔ الف لیلیٰ، حاتم طائی اور اردو کی دوسری داستانوں میں ناگ کے بہ کثرت قصے موجود ہیں۔

اب ہم سانپ کے علامتی پہلو کا جائزہ لیں گے کیونکہ گل گامش کی داستان میں شجرِ حیات چرانے والا سانپ یقیناً ایک علامت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے ایسی متعدد تصویریں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سانپ اپنی دم کو منھ میں دبائے ہوئے ہے اور ساری کائنات اس کے حلقے کے اندر بند ہے۔ مثلاً عراق میں ڈیڑھ ہزار برس پرانا ایک دھات کا پیالہ ملا ہے جس میں سانپ اپنی دم کو منھ میں لیے ہوئے ہے اور گھیرے کے اندر چند طلسماتی نقوش کندہ ہیں۔ بابل کی ایک پیکانی لوح پر بھی یہی ناگی حلقہ کندہ ہے۔ قبطیوں کی کھودی ہوئی ایک چوبی تختی ملی ہے جس کے ناگی حلقے کے اندر سورج، چاند، زمین اور دیوتا سبھی محصور ہیں۔ اسی قسم کا نقش نائیجیریا (مغربی افریقہ) کی ایک پیتل کی سینی پر بھی کندہ ملا ہے۔ اسی طرح میکسیکو کی ایک حجری جنتری کے گرد بھی سانپ حلقہ کیے ہوئے ہے۔ کیمیا کی ایک پرانی جرمن کتاب میں ایک پردار سانپ بنا ہے جو اپنی دُم کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے۔ مگر ناگی حلقے کا سب سے پرانا قصہ وہ ہے

جو وِشنو جی سے منسوب ہے۔ وِشنو جی اپنے دوسرے اوتار میں کچھوا بن کر سمندر کی تہہ میں جاتے ہیں تاکہ سمندر کو متھ کر کائنات کی تخلیق کریں۔ ان کی پیٹھ پر پہاڑ کا ستون رکھا ہوتا ہے اور اس ستون کے گرد سانپ لپٹا ہوتا ہے۔ کچھوے کی پیٹھ سمندر کو متھنے والی مدانی کی چکی ہے۔ پہاڑ مدانی کا ڈنڈا ہے اور سانپ اس کی رسّی ــــ رسّی کا ایک سرا پوروش کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا اراکشش کے ہاتھ میں ہے۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پرانی قومیں سانپ کو ہلاکت ہی کا موجب نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ان کی نظر میں سانپ حیاتِ ابدی کی علامت بھی تھا ــــ حلقہ جس کی نہ ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا ــــ جس کا نہ آگا ہوتا ہے نہ پیچھا ــــ جو نہ عمودی ہوتا نہ افقی ــــ بلکہ ایک خود کفیل حقیقت ہوتا ہے۔ زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ــــ یہی حلقہ فونیشیا والوں کا پُراسرار انڈہ ہے، کیمیا والوں کا گولہ ہے، وشنو کے گلے کا ہار ہے، اشوک کا چکر ہے ــــ وہ ابدیت ہے۔

سانپ کی یہی ابدیت تھی جس نے گِل گامش کو شجرِ شباب سے محروم کردیا کیونکہ ابدیت یا دوامی شباب تو اسی کا حق ہوتا ہے جو ابدی ہو۔ فانی انسان کیوں کر ابدی ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ نے آدم وحوا کو بہکایا اور ایسی چال چلی کہ وہ حیاتِ ابدی سے محروم ہوگئے۔

داستانِ گِل گامش کی لوحیں سب سے پہلے ایک انگریز ماہرِ آثار ــــ آسٹن لیَرڈ ــــ کو 1841ء میں نینوا کی کھدائی میں ملی تھیں۔ یہ لوحیں مدتوں لندن میوزیم کی الماریوں میں بند پڑی رہیں لیکن اس وقت تک کسی دانشور نے عکّادی زبان سے واقفیت حاصل نہیں کی تھی لہٰذا ان تختیوں کا علم بھی تختیوں کے اندر پوشیدہ رہا۔

بارے ان تختیوں کو پڑھنے کی نوبت بھی آگئی۔ یہ خدمت ایک دوسرے نوجوان انگریز جارج اسمتھ نے سرانجام دی۔ جارج اسمتھ کو اَشوری آثار اور علوم کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے شوق سے متاثر ہوکر برٹش میوزیم کے افسروں نے اسے اشوری شعبے میں ایک چھوٹی سی ملازمت دلوادی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسمتھ نے ان تختیوں کی مدد سے عکّادی زبان سیکھ لی اور تختیوں کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ ایک دن وہ ایک تختی کو پڑھ رہا تھا جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کا آدھا حصہ غائب تھا۔ اسمتھ اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے کہ:

''کسی زمانے میں اس تختی میں چھ کالم رہے ہوں گے۔ میں نے تیسرا کالم پڑھا تو میری آنکھیں اس مقام پر ٹھہر گئیں جہاں لکھا تھا کہ جہاز کوہِ نذیر پر رُک گیا۔ اس کے آگے فاختہ اڑانے کا قصہ درج تھا اور یہ کہ زمین پر اترنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی للہذا وہ جہاز میں واپس آ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے حضرت نوحؑ کے سیلاب کے کلدانی تذکرے کا کم از کم ایک ٹکڑا پا لیا ہے۔''

یہ واقعہ 1872ء کا ہے۔ 3 دسمبر 1872ء کو اسمتھ نے مجلسِ آثارِ انجیل کے جلسے میں اس دریافت پر ایک مقالہ پڑھا تو لندن کے پڑھے لکھے حلقوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اخبار ''ڈیلی ٹیلی گراف'' نے اسمتھ کو ایک ہزار پونڈ سفرِ خرچ دے کر نینوا بھیجا کہ وہ نینوا کے کھنڈروں میں شکستہ تختی کا گم شدہ ٹکڑا تلاش کرے۔ حسنِ اتفاق سے یہ ٹکڑا اسمتھ کو پرانی کھدائیوں کے ملبے ہی میں مل گیا۔

اسمتھ کو نینوا کے ملبوں میں سے کل بارہ لوحیں ملیں۔ ان لوحوں پر گل گامش کی داستان مرقوم تھی۔ اسمتھ نے اس نظم کے ہیرو کا نام ''ازدوبار'' پڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ انجیل کا نمرود یہی شخص ہے۔ گل گامش کے رفیق اِن کِدو کا نام اسمتھ نے ''اباتی'' پڑھا۔ اس کی رائے میں یہ شخص جوتشی یا رمال تھا۔ ان تختیوں میں ازدوبار کی فتوحات ''ابانی اور بھیلیے کا قصہ'' ابانی کی عورت (حریمو) سے حمبابا کی ملاقات، ازدوبار اور ابانی کی دوستی، حمبابا کی مہم، ازدوبار اور عشتار کا جھگڑا، ابانی کا خواب اور اس کی موت، نخصی ساورا (اتناپشتیم) سے ملاقات کے لیے ازدوبار کا سفر، دونوں کی گفتگو، حیات و ممات پر سیلابِ عظیم کا قصہ، ازدوبار کی واپسی اور پھر ابانی کے لیے ازدُوبار کا ماتم، تفصیل سے قلم بند تھے۔

اس کے بعد گل گامش کی داستان کے اور نسخے دوسرے مقامات سے بھی ملتے رہے۔

ابتدائیہ

ستائشِ بے حساب گل گامش آقائے کلاب (۱) کی جو جہاں بیں تھا۔
یہ وہ فرماں بردار تھا جو روئے زمین کے سبھی ملکوں کی خبر رکھتا تھا۔
وہ عاقل تھا، واقفِ اسرار اور دانائے راز تھا۔
وہ ہمارے لیے سیلاب سے پیش تر کی ایک داستان لایا۔
وہ ایک لمبے سفر پر گیا۔
اور جب خستہ و درماندہ واپس ہوا تو پورا قصہ پتھر پر کندہ کروا دیا۔
گل گامش کی تخلیق دیوتاؤں نے کی۔
انھوں نے اسے جسدِ کامل بخشا۔
شمس نے حسن سے نوازا
اور ایک طوفان کے دیوتا اداد نے جرأت عطا کی۔
عظیم دیوتاؤں نے اس کے جمال کی تکمیل کی
اور وہ سب پر سبقت لے گیا۔
انھوں نے گل گامش کو دو تہائی دیوتا بنایا اور ایک تہائی انسان۔
گل گامش نے اریک کی فصیلیں بنوائیں۔
شہر کو پشتوں سے محفوظ کیا۔
اور آکاش کے دیوتا اَنُو اور محبت کی دیوی عشتار کے لیے
ای انا کا مقدس معبد تعمیر کروایا۔

شہر پناہ کی دیوار پر نظر ڈالو!
اس کی کگر تانبے کی طرح جھلکتی ہے۔
اور اندرونی دیوار کو دیکھو جس کی نظیر نہیں۔
آستانے کو چھوؤ جو بہت قدیم ہے۔
اِی آنا کے قریب جاؤ جو عشتار کا مسکن ہے۔
گِل گامِش کی ہمسری نہ کبھی کوئی بادشاہ کر سکے گا نہ کوئی انسان۔
اریک کی دیوار پر چڑھو اور میں کہتا ہوں کہ اس پر چلو بھی۔
کرسی کے چبوترے کو غور سے دیکھو
اور چنائی کو جانچو
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی ہے؟
کیا سات عارفوں نے اس کی بنیاد نہیں رکھی۔

پہلا باب

اِن کدُو کی آمد

گِل گامِش ملک سے باہر دور دور تک گھوما۔
مگر اسے اپنے اسلحوں کا ایک حریف بھی نہ ملا۔
اور وہ اریک واپس آیا۔
لیکن عمائدینِ شہر اپنے دیوان خانوں میں پریشان وملول بیٹھے تھے۔
ان کو شکوہ تھا کہ گِل گامِش مقدس طبل کو اپنی تفریح کے لیے بجواتا ہے۔
اس کا گھمنڈ، دن ہو کہ رات، سدا بے لگام رہتا ہے۔

کیا یہی وہ گل گامش ہے، پشتوں سے محفوظ اریک کا پاسبان؟
کیا یہی وہ ہمارا رکھوالا ہے، دلیر، دبنگ اور دانا؟
گل گامش کسی بیٹے کو باپ کے پاس نہیں رہنے دیتا۔
گل گامش کی ہوس کسی کنواری لڑکی کو اپنے عاشق کے پہلو میں نہیں بیٹھنے دیتی۔
سُورما کی بیٹی ہو یا رئیس کی بیوی وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا۔
دیوتاؤں نے اہالیانِ اریک کا ماتم سنا تو
خداوند اَنُو سے فریاد کی:
کیا اَرُورو نے اس جنگلی سانڈ کو نہیں جنا تھا؟
اس کے اسلحوں کا کوئی حریف نہیں۔
گل گامش مقدس طبل کو اپنی تفریح کے لیے بجواتا ہے
گل گامش کسی بیٹے کو باپ کے پاس نہیں رہنے دیتا۔
اس کا گھمنڈ دن ہو یا رات، سدا بے لگام رہتا ہے۔
کیا یہی وہ گل گامش ہے، پشتوں سے محفوظ اریک کا پاسبان؟
کیا یہی ان کا رکھوالا ہے، دلیر، دبنگ اور دانا؟
گل گامش کی ہوس کسی کنواری لڑکی کو اپنے عاشق کے پہلو میں نہیں بیٹھنے دیتی
سورما کی بیٹی ہو یا رئیس کی بیوی، وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا۔
اَنُو نے ان کی فریاد سن لی:
اور دیوتاؤں نے تولید کی دیوی ارُورُو کو طلب کیا۔
''ارُورُو! تُو نے اس کو جنا تھا
اب تو ہی اس کا ہم سر بھی پیدا کر
وہ گل گامش سے مشابہ ہو۔ جیسے اس کی پرچھائیں، اس کا ہمزاد،

طوفانی قلب کا جواب طوفانی قلب
تب وہ دونوں باہم نبرد آزما ہوں تا کہ اُریک عافیت سے رہے"
پس اُرورُو نے اپنے ذہن میں ایک پُتلا بنا دیا۔
جس میں آکاش کے دیوتا اَنو کا جوہر تھا۔
اُرورُو نے اپنے ہاتھ پانی میں تر کیے
تھوڑی سی گیلی مٹی لی اور صحرا میں پھینک دی
اور تب بہادر اِن کدو پیدا ہوا۔
اس میں جنگ کے دیوتا نی نورتا کے سب اوصاف موجود تھے۔
اس کا جسم کھردرا تھا۔
اس کے سر کے بال عورتوں کی مانند لمبے تھے
اور ان میں اناج کی دیوی نسابا کی طرح لہریں اٹھتی تھیں۔
اس کا بدن مویشیوں کے دیوتا سموقان کی مانند چٹائی نما بالوں سے ڈھکا تھا۔
وہ نہ انسانوں سے واقف تھا نہ مزروعہ زمین سے۔
اِن کِدو غزالوں کے ہمراہ گھاس چرتا۔
اور جنگلی جانوروں کے ساتھ چشمے پر کودتا پھرتا۔
اور چوپایوں کے ساتھ پانی میں چہلیں کرتا رہتا۔
تب ایک دن بہلیے نے اسے چشمے پر دیکھا۔
اور دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی
بہلیے کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔
وہ اپنے ڈیرے کو لوٹ گیا۔
دہشت کے مارے اس کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔
اس کا حلیہ دور سے آنے والے مسافر کی مانند تھا۔
اس نے ہیبت بھرے دل سے اپنے باپ سے کہا:

''باپ! ایک ہے مگر دوسروں سے نرالا
وہ پہاڑ سے آتا ہے۔
وہ دنیا کا سب سے قوی انسان ہے
اس میں اَنُو کا جوہر گھس گیا ہے
کبھی وہ کہساروں پر جنگلی جانوروں کے ساتھ گھومتا اور گھاس
چرتا ہے اور کبھی وہ ہمارے علاقے میں چشمے کے پاس آتا ہے۔
میں اس سے ڈرتا ہوں اور اس کے قریب جانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔
میں نے جو گڑھے کھودے تھے اس نے انھیں پاٹ دیا ہے۔
اور میں نے جو جال بچھائے تھے انھیں توڑ ڈالا ہے
وہ جانوروں کو بھاگنے میں مدد دیتا ہے
اور شکار میرے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔''

اس کے باپ نے بولنے کے لیے منھ کھولا اور کہا:

''میرے بیٹے! اریک میں گل گامش رہتا ہے۔
آج تک کسی نے اسے زیر نہیں کیا ہے
اس میں اَنُو کے جوہر کی سی توانائی ہے
اٹھ اور اریک کی راہ لے
اور گل گامش سے اس جنگلی آدمی کی طاقت کا حال بیان کر
اور عشتار کے مندر کی دیوداسی مانگ، دوشیزۂ عیش۔
وہ اپنی نسوانی دلکشی سے اس آدمی پر غالب آئے گی۔
جب وہ چشمے پر پانی پینے آئے گا تو
دیوداسی اپنے کپڑے اتار دے گی اور اپنی بھرپور جوانی کو عریاں کردے گی
اور اِن کدو عورت کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکے گا۔
تب جنگلی جانور اس سے دور بھاگ جائیں گے۔''

بھلیے نے باپ کے مشورے پر عمل کیا
اور سفر پر روانہ ہو گیا۔
اور اریک پہنچ کر گل گامش سے ملا اور کہا:
''گل گامش ایک آدمی ہے دوسروں سے نرالا
وہ چراگاہوں میں گھومتا پھرتا ہے۔
وہ ستارۂ فلک کی مانند قوی ہے۔
اور میں اس کے قریب جانے سے ڈرتا ہوں۔
وہ میرے شکار کو بھاگنے میں مدد دیتا ہے۔
وہ میرے گڑھوں کو پاٹ دیتا ہے
اور جال کی رسیاں توڑ دیتا ہے۔''
گل گامش نے بھلیے سے کہا:
''دیوداسی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، دوشیزۂ عیش کو
چشمے پر ان کدو اس سے ہم آغوش ہوگا۔
اور تب جنگلی جانور ان کدو سے دور بھاگنے لگیں گے''
بھلیے نے دیوداسی کو ساتھ لیا اور روانہ ہو گیا۔
تین دن کی مسافت طے کر کے وہ چشمے پر پہنچے۔
بھلیا اور دیوداسی آمنے سامنے بیٹھ گئے اور شکار کا انتظار کرنے لگے۔
پہلے دن اور دوسرے دن وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔
تب تیسرے دن جنگلی جانور چشمے پر پانی پینے آئے۔
اور ان کدو ان کے ہمراہ تھا
اور دیوداسی نے جنگلی آدمی کو کوہسار سے میدان میں آتے دیکھا
اور بھلیے نے دیوداسی سے کہا:

''وہ رہا تیرا آدمی۔
عورت! اب تو اپنی چھاتیاں کھول دے۔
اور اپنے پیڑو کو ننگا کر دے تا کہ وہ تیری بھرپور جوانی پر قابض ہو جائے۔
شرم مت کر بلکہ اس کے شوق کا خیر مقدم کر۔
جب وہ تیرے نزدیک آئے تو اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف رکھ دینا۔
اور اس کے پہلو میں لیٹ جانا
اور اسے عورت سے لذت لینے کا ہنر سکھانا۔
کیونکہ جس وقت اس کی محبت تیری طرف آئے گی
تو جنگل کے جانور جن کی پرورش اس کے ساتھ پہاڑوں میں ہوئی ہے
اس سے دور بھاگ جائیں گے۔''

دیوداسی نے اپنی چھاتیاں کھول دیں۔
اور اپنا پیڑو ننگا کر دیا۔
جنگلی آدمی کے شوق کو تیز کرتے وقت دیوداسی نے شرم محسوس نہ کی۔
بلکہ اپنے کپڑے ایک طرف اٹھا کر رکھ دیے
اور جنگلی آدمی کو عورت سے لذت یاب ہونے کا ہنر سکھاتی رہی۔
اور اِن کدو دیوداسی کی بھرپور جوانی پر قابض ہو گیا۔
چھ دن اور سات راتیں ان کدو دیوداسی کی صحبت میں رہا
اور جب وہ عورت سے آسودہ ہو گیا
تو جنگلی جانوروں کے پاس واپس گیا
مگر اِن کدو کو دیکھ کر غزال چوکڑی بھرنے لگے
اور جنگلی جانور اس سے دور بھاگ گئے
اِن کدو کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی
اس نے جانوروں کا پیچھا کرنا چاہا مگر وہ دوڑ نہ سکا

کیونکہ اس کا جسم اکڑ گیا تھا
اس کے گھٹنوں میں سکت نہ رہی تھی
اور اس کی ساری پھرتی زائل ہو گئی تھی
اِن کدو کے قدم سست پڑنے لگے
کیونکہ اس میں اب پہلی سی چستی نہ تھی
مگر اب اس میں دانائی آ گئی تھی اور سوجھ بوجھ بھی
پس وہ لوٹ آیا اور دیوداسی کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔
اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا
اور اس نے دیوداسی کی باتیں بڑے دھیان سے سنیں
دیوداسی نے اس سے کہا:
ان کدو تو اب سیانا ہو گیا ہے
تو اب دیوتا کی مانند ہو گیا ہے
پھر تو جنگلی جانوروں کے ساتھ پہاڑوں میں کیوں رہنا چاہتا ہے؟
میرے ساتھ چل میں تجھے پشتوں سے محفوظ اریک کی راہ دکھاؤں گی۔
میں تجھے اَنُو اور عشتار کے مقدس معبد میں لے چلوں گی۔
وہاں رگل گامش رہتا ہے وہ بڑا طاقت والا ہے
وہ اپنی رعایا پر جنگلی سانڈ کی طرح حکومت کرتا ہے
اِن کدو کو دیوداسی کی باتیں پسند آئیں
وہ ایک دوست کا خواہش مند تھا
دوست جو اس کے دل کی بات کو سمجھ سکے
"عورت! اٹھ اور مجھے مقدس معبد میں لے چل جو اَنُو اور عشتار کا مسکن ہے
وہاں لے چل جہاں طاقت ور رگل گامش رہتا ہے
اور جو اپنی رعایا پر جنگلی سانڈ کی مانند حکومت کرتا ہے

میں اسے بے دھڑک للکاروں گا
اور میری آواز اریک میں گونجے گی
یہاں سب سے طاقت ور میں ہوں
میں وہ ہوں جو پرانے نظام کو بدلنے آیا ہوں
وہ جو پہاڑوں میں پلا بڑھا
اور جس میں بڑی قوت، بڑی توانائی ہے''

دیوواسی نے کہا:

''ان کدو، اب اٹھ تا کہ وہ تیری صورت دیکھ سکے
میں تجھے ہگل گامش سے ملاؤں گی
میں جانتی ہوں کہ عظیم الشان اریک میں وہ کس جگہ رہتا ہے
پس آؤ چلیں پشتوں سے محفوظ اریک کی سمت
جہاں کے باشندے جشن وطرب کے زرق برق لباس پہنے رہتے ہیں
جہاں ہر روز تیوہار منایا جاتا ہے
جہاں کے نواجون لڑکوں اور لڑکیوں کے جسم قابلِ دید ہیں
اِن کے بدن سے میٹھی میٹھی خوشبو نکلتی رہتی ہے
اور شوقِ نظارہ بڑے بڑوں کو اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے
اِن کدو! تو جو زندگی سے پیار کرتا ہے
میں تجھے ہگل گامش سے ملاؤں گی
وہ بڑا خوش خرم انسان ہے
تو اسے دیکھنا
جو ہرِ مردانگی سے اس کا چہرہ ہر وقت دمکتا رہتا ہے
اور اس کے جسم سے شباب کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں
وہ دن کو چین سے بیٹھتا ہے نہ رات کو

اور وہ تجھ سے زیادہ طاقت ور ہے
اس لیے اِن کدوڈینگ مارنا چھوڑ دے
گِل گامش شمس اور اَنو کا چہیتا ہے
اور اِن لیل اور اِیا نے اس کو دانائی عطا کی ہے
اور میں کہتی ہوں کہ
ابھی تو نے صحرا کا سفر بھی طے نہ کیا ہوگا
کہ گِل گامش کو تیرے آنے کی خبر ہو جائے گی۔''

دوسرا باب

گِل گامش کا خواب

گِل گامش سو کر اٹھا
تا کہ اپنا خواب اپنی ماں ننسون سے بیان کرے۔
جو عقل مند دیوی تھی۔
گِل گامش نے ماں سے کہا:
''ماں میں نے رات ایک خواب دیکھا کہ
میں بہت خوش ہوں اور
نوجوان سُورما میرے گرد جمع ہیں۔
اور میں آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ میں چل رہا ہوں۔
اچانک اَنوُ کے جوہر کا ایک شہابِ ثاقب آسمان سے گرا۔
اور میں نے اسے اٹھانا چاہا

مگر وہ اتنا بھاری تھا کہ میں اسے اٹھا نہ سکا۔
عمائدینِ اریک شوقِ دید میں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے تھے
اور عام شہری ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش
کر رہے تھے
اور امرا اس کے قدم چوم رہے تھے
میں نے اس میں وہی دلکشی دیکھی۔
جو کسی عورت میں ہوتی ہے۔
لوگوں نے مجھے سہارا دیا۔
اور میں نے اپنے سر کو نیچا کر کے
ایک تسمے کی مدد سے اسے اٹھایا
اور تیرے پاس لے آیا۔
اور تو نے مجھ سے کہا:
یہ تیرا بھائی ہے۔"
تب نن سون نے جو دانائے کل ہے، کہا کہ:
"تو نے آسمان کے جس ستارے کو دیکھا
اور فریفتہ ہوا گویا وہ عورت تھی"
وہی تو طاقت ور رفیق ہے۔
جو ضرورت کے وقت اپنے دوست کے کام آتا ہے
وہ جنگلی جانوروں میں سب سے مضبوط ہے
وہ گیاہستان میں پیدا ہوا ہے
اور پہاڑوں نے اس کی پرورش کی ہے
تو اسے دیکھے گا تو اس طرح خوش ہوگا
جس طرح اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے

اس میں آسمانی خداؤں کی سی قوت ہے
امرا اس کے قدم چومیں گے
تو اس سے بغل گیر ہوگا
اور اسے میرے پاس لائے گا۔"
گل گامش دوسرے دن سو کر اٹھا اور ماں سے بولا:
"ماں! میں نے ایک اور خواب دیکھا ہے —
اریک کی چوڑے بازار والی شاہراہ پر
ایک تیشہ پڑا ہے
لوگ اس کے گرد بھیڑ لگائے کھڑے ہیں
اس کی شکل انوکھی ہے
میں نے اس تیشے کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔
اور میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا
جیسے عورت کی طرف کھنچتے ہیں
میں نے اسے جھک کر اٹھا لیا اور اپنے پہلو سے لگا لیا۔"
ننسون نے کہا:
"وہ تیشہ جو تو نے دیکھا
اور جس نے تجھے عورت کی مانند اپنی طرف کھینچا
وہی وہ رفیق ہے جو میں تجھے بخشتی ہوں
وہ تیرا دلیر ساتھی ہے جو
وقت پڑنے پر اپنے دوست کے کام آئے گا۔"
گل گامش نے اپنی ماں سے کہا:
"وہ میری قسمت ہے لہٰذا وہ میرا رفیق ہوگا۔"

تیسرا باب

گل گامش اور اِن کدو کی لڑائی

اُدھر گل گامش ماں سے اپنا خواب بیان کر رہا تھا
اِدھر اِن کدو دیوداسی کے روبرو بیٹھا تھا
اور دیوداسی نے اِن کدو سے کہا:
''اِن کدو اب تو مجھے دیوتا نظر آنے لگا ہے
پھر جنگلی جانوروں کے ساتھ پہاڑوں میں
پھرنے کے لیے کیوں بے تاب ہے
زمین سے اٹھ کہ یہ چرواہے کا بستر ہے۔''
اِن کدو نے دیوداسی کی باتیں دھیان سے سنیں
اور عورت کا مشورہ اس کو پسند آیا
دیوداسی نے اپنا لباس اتارا اور اس کے دو حصے کیے
ایک کپڑا اس نے اِن کدو کو پہنایا
اور دوسرا خود پہنا
اور ماں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑے
گڈریوں کے ڈیرے پر آئی
جہاں بھیڑوں کا گلہ رہتا تھا
گڈریے اِن کدو کو دیکھنے کے لیے
اس کے گرد جمع ہو گئے
انھوں نے اِن کدو کے سامنے روٹی رکھی
لیکن اِن کدو جنگلی جانوروں کا دودھ تھن سے پیا کرتا تھا

وہ روٹی کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا تھا
اور ہانپ رہا تھا
اور اس کے منھ سے آواز نہ نکلتی تھی
وہ حیران تھا کہ روٹی کو کیسے کھائے
اور تیز شراب کیسے پیے
کیونکہ اِن کدو روٹی کھانا نہ جانتا تھا
اور کسی نے اسے تیز شراب پینا بھی نہ سکھایا تھا
تب دیوداسی نے اپنا منھ کھولا اور اِن کدو سے بولی:
"اِن کدو، یہ روٹی کھالے
کیونکہ زندگی کا توشہ یہی ہے
اور تیز شراب پی لے
کیونکہ اس دیس کی ریت یہی ہے۔"
پس اِن کدو نے روٹی کھائی
یہاں تک کہ وہ سیر ہوگیا
اور تیز شراب کے سات پیالے پیے
اور وہ چہکنے لگا اور اس کا دل باغ باغ ہوگیا
اور اس کا چہرہ دمک اٹھا
اس نے اپنے بدن کے بال ٹھیک کیے
اور جسم پر تیل ملا
اور تب اِن کدو انسان بن گیا
اور پوشاک پہن کر وہ دولھا معلوم ہونے لگا
اس نے ہتھیار اٹھایا اور
شیر کا شکار کرنے نکل گیا

تا کہ گڈریے رات آرام سے بسر کر سکیں
اس نے بھیڑیے اور شیر مارے
اور گلہ بان آرام سے سوتے رہے
کیونکہ اِن کدوان کا پاسبان تھا
وہ مردِ قوی جس کا کوئی ثانی نہ تھا
وہ گڈریوں کے ساتھ خوش خوش رہتا تھا
مگر ایک دن یوں ہوا کہ اس نے نگاہ اٹھائی
تو اس کو دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا
اس نے دیوداسی سے کہا:
''عورت اس آدمی کو میرے پاس لے آ
وہ اِدھر کیوں آیا ہے
میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔''
دیوداسی اٹھی اور اس نے راہ گیر کو آواز دی
وہ اس کے قریب گئی اور اس سے بولی:
''راہ گیر! تم کدھر بھاگے جا رہے ہو
اور تم نے یہ کٹھن سفر کیوں اختیار کیا ہے۔''
راہ گیر نے اپنا منہ کھولا
اور ان کدو سے مخاطب ہوا۔
گِل گامش ایوانِ شوریٰ میں زبردستی گھس آیا ہے۔
حالانکہ یہ عمارت شہر والوں کی ملکیت ہے
وہ ڈھول کی آواز پر وہاں جمع ہوئے تھے
تا کہ شبِ عروسی کی خاطر دلہن کا انتخاب کریں
مگر گِل گامش ان کی تحقیر کر رہا ہے

اس نے شہر کو ناپاک کر دیا ہے
وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے
وہ چاہتا ہے کہ دلہن شبِ عروسی اس کے ساتھ گزارے
پہلے بادشاہ بعد میں جائز شوہر
اور یہ سب دیوتاؤں کی مرضی سے ہو رہا ہے
گِل گامش کو یہ حق اس وقت مل گیا تھا
جس وقت اس کی نال کاٹی گئی تھی
لیکن اب دلہن کو چننے کے لیے ڈھول بجتا ہے
تو شہر کراہتا ہے۔"

راہ گیر کی باتیں سن کر اِن کدو کا چہرہ سفید ہو گیا
"میں وہاں جاؤں گا جہاں گِل گامش لوگوں پر جبر کرتا ہے
میں اسے للکاروں گا۔
اور میری آواز اریک میں گونجے گی
میں پرانے نظام کو بدلنے آیا ہوں
کیونکہ میں سب سے قوی ہوں۔"

پس اِن کدو آگے آگے
اور عورت اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی
جب اِن کدو مضبوط پشتوں والے اریک میں داخل ہوا
تو شہریوں کا ہجوم اس کے گرد جمع ہو گیا
وہ چوڑے بازار والے اریک کی شاہراہ پر رُکا
تو لوگوں نے اسے گھیر لیا اور آپس میں کہنے لگے:
"یہ تو ہو بہو گِل گامش ہے
یہ قد میں اس سے چھوٹا ہے

مگر اس کی ہڈیا کے ہاڑ زیادہ مضبوط ہیں
یہی ہے وہ جو جنگلی جانوروں کے دودھ پر پلا ہے،
بے شک یہ سب سے قوی ہے
اب اریک میں اسلحوں کی جھنکار برابر سنائی دے گی۔"
امرا خوش تھے کہ بگل گامش کا حریف آ گیا ہے
اب یہ سورما، جس کا حسن دیوتاؤں کی مانند ہے،
بگل گامش کی ہمسری کرے گا
تب اریک میں بسترِ عروسی
محبت کی دیوی کے شایانِ شان سجایا گیا
دلہن اپنے دولھا کی منتظر تھی
کہ بگل گامش اٹھا
اور ایوانِ عروسی کی جانب چلا۔
تب اِن کدو نمودار ہوا
اور اس نے شاہراہ پر کھڑے ہو کر
بگل گامش کا راستہ روک لیا
بگل گامش آگے بڑھا
مگر اِن کدو پھاٹک کے سامنے کھڑا ہو گیا
اور بگل گامش کو اندر نہ داخل ہونے دیا
تب وہ آپس میں گتھ گئے
اور سانڈوں کی مانند ٹکرانے لگے
انھوں نے دروازے اور چوکھٹ کو توڑ ڈالا
اور دیواریں ہل گئیں
بگل گامش نے اپنا گھٹنا جھکایا

اور پاؤں زمین پر جما کر جھٹکا دیا
تو اِن کدو نیچے زمین پر گر گیا
تب رگل گامش کا غصہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا
اور اِن کدو نے رگل گامش سے کہا:
"دنیا میں تیرا کوئی ثانی نہیں ہے
تو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے
بیلوں کے باڑے کی جنگلی گائے نن سون کی اولاد
تو سب انسانوں میں بالا و سر بلند ہے
اِن لیل نے تجھے بادشاہی عطا کی ہے
کیونکہ تیری طاقت سبھوں کی طاقت سے فزوں تر ہے۔"
تب اِن کدو اور رگل گامش باہم بغل گیر ہوئے
اور ان کی دوستی پر مہر لگ گئی۔

چوتھا باب

حمبابا کی ہلاکت

دیوتاؤں کے دیوتا اِن لیل نے رگل گامش کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا تھا۔
پس رگل گامش نے خواب دیکھا
اور اِن کدو نے کہا:
"اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ
دیوتاؤں کے دیوتا نے تجھے شاہی بخش دی ہے،

تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے
مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں ہے
لیکن اس سبب سے افسردہ دل نہ ہو،
نہ رنج کر نہ پریشان ہو۔
اس نے تجھے بست و کشاد کی قوت عطا کی ہے
تو انسان کا نور اور اس کی ظلمت ہے
اس نے تجھے لوگوں پر بے مثال اقتدار بخشا ہے
اس نے تجھے ایسی جنگوں میں سرخ رُو کیا ہے
جن سے کوئی گریز پا بھی فرار نہیں کر سکتا
اور ان یورشوں اور یلغاروں میں فتح یاب کیا ہے
جن سے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔
مگر اس وقت کو بے جا استعمال مت کر۔
اپنے محل کے ملازمین سے انصاف کر
اور شمس کے روبرو عدل سے پیش آ۔''

بادشاہ گل گامش کے ذہن میں ملکِ بقا کا خیال آیا۔
اس نے چندن کے ملک (لبنان) کے بارے میں سوچا۔
اور اپنے ملازم اِن کدو سے کہا:
''تقدیر میں تو لکھا تھا کہ میرے نام کی مہر لوحِ خام پر ثبت ہو۔
لیکن میں نے ابھی تک یہ کام سرانجام نہیں دیا ہے
پس میں اس ملک کا سفر کروں گا
جہاں چندن کے درخت کاٹے جاتے ہیں
میں اپنا نام اس مقام پر ثبت کروں گا
جہاں مشاہیر کے نام ثبت ہوتے ہیں

اور جس مقام پر ابھی تک کسی انسان کا گزر نہیں ہوا ہے
وہاں میں دیوتاؤں کے لیے ایک یادگار تعمیر کروں گا
اِن کدو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
اور اس کا دل ملول ہو گیا
اور اس نے ٹھنڈی سانس لی
تب گِل گامش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا
''میرے دوست! تم ٹھنڈی سانسیں کیوں بھرتے ہو؟''
اِن کدو نے اپنا منھ کھولا اور کہا:
''میں ضعف محسوس کر رہا ہوں
میرے بازوؤں کی قوت جواب دے رہی ہے
اور اندوہ کی آواز میرے حلق میں پھنس گئی ہے
تم نے اس مہم کی کیوں ٹھانی ہے؟''
گِل گامش نے اِن کدو کو جواب دیا:
''اس لیے کہ وہ سرزمینِ شر ہے۔
ہم بن میں گھس کر اس بلا کو ہلاک کریں گے۔
بن میں حمبابا رہتا ہے
جو بڑا ہیبت ناک دیو ہے۔''
لیکن اِن کدو نے پھر ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:
''جن دنوں میں جنگلی جانوروں کے ہمراہ صحراؤں میں پھرتا تھا
تو میں نے اس جنگل کا بھی سراغ لگایا تھا
اس کی لمبائی ہر سمت پندرہ ہزار کوس ہے
اور اِن لیل نے حمبابا کو اس جنگل کا پاسبان مقرر کیا ہے۔
اور اسے سات گُنا بھیانک اسلحوں سے لیس کیا ہے

حمباآبا ہر جان دار کے لیے عذاب ہے
اس کی گرج میں مہیب طوفان کا شور ہے
اس کے منہ سے شعلے نکلتے ہیں
اور اس کے جبڑے موت کا دہانہ ہیں
وہ دیواروں کی رکھوالی میں اتنا چوکنا ہے
کہ گلو را اگر نوّے کوس کی دوری پر بھی
جنبش کرے تو حمبابا کو خبر ہو جاتی ہے
بھلا اس سرزمین پر کون اپنی مرضی سے قدم رکھے گا
اور اس کی گہرائیوں کا کون سراغ لگائے گا
میں تجھے بتاؤں :
جو شخص اس کے قریب جاتا ہے
اس پر توانائی غلبہ کر لیتی ہے
حمبابا سے لڑنا اپنے برابر والوں سے لڑنا نہیں ہے۔
وہ مہا ساونت ہے
بِگل گامِش! جنگل کا یہ پاسبان کبھی نہیں سوتا۔''
بِگل گامِش نے جواب دیا:
''میرے دوست وہ کون انسان ہے، جس کی رسائی آسمان تک ہو سکے
نورانی شمس کی ابدی رفاقت تو محض دیوتاؤں کو نصیب ہے
رہے ہم انسان سو ہمارے دن تو گنتی کے ہوتے ہیں۔
اور ہمارا کاروبارِ زندگی ہوا کے جھونکے کی طرح رفتنی و گزشتنی ہے۔
پس موت سے ڈرنا فضول ہے
تجھے ابھی سے کیوں خوف دامن گیر ہے
میں آگے آگے چلوں گا حالانکہ میں تیرا آقا ہوں۔

اور تو پیچھے پیچھے چلنا اور بے خطر مجھے آواز دیتے رہنا کہ
آگے بڑھتے جاؤ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔
اگر میں مارا گیا تو دنیا میں میرا نام امر ہو جائے گا
اور لوگ میرے بارے میں کہیں گے کہ
گِل گامش مہیب حمبابا سے لڑتا ہوا مارا گیا۔
لوگ مجھے کئی پشتوں تک یاد کریں گے۔"
اِن کدو نے گِل گامش سے پھر کہا:
"میرے آقا! اگر تو نے اس دیس میں جانے کا تہیہ کر لیا ہے
تو پہلے شمس کے پاس جا کر اسے خبر کر دے
کہ وہ ملک اسی کا ہے
وہ ملک جہاں کے درخت کاٹے جاتے ہیں شمس کی ملکیت ہے۔"
گِل گامش نے ایک سفید حلوان لیا
جس پر کوئی داغ نہ تھا
اور ایک بادامی حلوان لیا جس پر داغ تھے
اس نے حلوانوں کو گود میں اٹھایا
اور شمس کے حضور میں پیش کیا
گِل گامش نے اپنا نقرئی عصا اونچا کیا
اور نورانی شمس سے عرض کی:
"شمس! میں عازم سفر ہوں
میرے ہاتھ تجھ سے التجا کرتے ہیں
پس میری روح کی خیر ہو
مجھے اریک کی گھاٹ پر سلامتی سے واپس لا۔
میری التجا قبول کر کہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اور میرا شگون نیک کر۔"

نورانی شمس نے جواب دیا:

"تو بے شک قوی ہے،

لیکن تجھے ملکِ بقا سے کیا سروکار۔"

"شمس میری سن میری سن!

میری آواز تجھ تک پہنچے۔

یہاں شہر میں تو انسان دل شکستہ ہو کر مر جاتا ہے۔

اس کی جان غم واندوہ میں نکلتی ہے

میں نے فصیل پر کھڑے ہو کر

لاشوں کو دریا میں بہتے دیکھا ہے

میری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے

اور میں جانتا ہوں کہ میرا انجام بھی یہی ہوگا۔

کیونکہ اونچے سے اونچے آدمی کی رسائی بھی آسمان تک نہیں ہو سکتی۔

اور بڑے سے بڑا انسان بھی روئے زمین کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اس لیے میں اس ملک میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔

میں نے ابھی تک اپنی تقدیر کے مطابق لوح پر اپنا نام ثبت نہیں کیا ہے۔

لہٰذا میں وہاں جاؤں گا جہاں چندن کے درخت کاٹے جاتے ہیں۔

میں اپنا نام وہاں ثبت کروں گا جہاں مشاہیر کے نام ثبت ہیں۔

اور جہاں کسی انسان کا نام کندہ نہیں ہے۔

وہاں میں دیوتاؤں کے لیے ایک یادگار تعمیر کروں گا۔"

آنسو گل گامش کے رخساروں سے بہنے لگے اور اس نے کہا:

"افسوس! سرزمینِ حمبابا کا سفر بہت طویل ہے۔

اور اگر یہ مہم سر ہونے والی نہ تھی تو

اے شمس!
تو نے اس کو سر کرنے کی بے چین خواہش میرے اندر کیوں پیدا کی؟
اگر تو نے حفاظت نہ کی تو میں کیوں کر کامیاب ہوں گا۔
اگر میں اس ملک میں مارا گیا
تو مجھے اپنے انجام پر بالکل غصہ نہ آئے گا۔
اور اگر میں کامیاب واپس ہوا تو
اے شمس میں تجھے شان دار تحفے نذر کروں گا۔
اور شمس کی ستائش کروں گا۔"
شمس نے ,گل گامش کے اشکوں کی قربانی قبول کر لی۔
رحم دل انسان کی مانند اس نے بھی رحم کھایا۔
اس نے ,گل گامش کے لیے قوی نگہبان مقرر کیے۔
ایک ماں کے کئی بیٹوں کو،
اور انھیں کوہسار کے غاروں میں بٹھا دیا۔
اس نے عظیم ہواؤں کو بھی رفاقت کا حکم دیا:
بادِشمال کو، بادِطوفان اور بادِزمہریر کو
بادِتند اور بادِسموم کو
یہ ہوائیں سانپوں اور اژدہوں کی مانند تھیں۔
جھلس دینے والی آگ کی مانند
اور اس مارِسیاہ کی مانند
جس کو دیکھتے ہی خوف سے دل منجمد ہو جاتے ہیں
اور یہ ہوائیں تباہ کرنے والے سیلاب اور
بجلی کی لپکتی ہوئی زبانوں کی مانند تھیں
اور ,گل گامش خوش تھا۔

وہ دھات گھر میں گیا اور بولا:
''میں اسلحہ سازوں کو حکم دوں گا کہ
ہمارے ہتھیار ہماری نگاہوں کے سامنے ڈھالیں۔''
پس اس نے اسلحہ سازوں کو حکم دیا
اور کاریگر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔
تب وہ بن میں گئے
انھوں نے بید کی شاخیں اور سبز جھاڑیاں کاٹیں
اور ان کے لیے دو دو من کے تیشے ڈھالے۔
اور تلواریں بھی جن کے پھل ڈیڑھ ڈیڑھ من کے تھے۔
اور ان کے قبضے اور دستے پندرہ پندرہ سیر کے تھے۔
انھوں نے گل گامش کے لیے جو تیشہ ڈھالا
اس کا نام ''سورماؤں کی طاقت'' تھا۔
اور اس کے لیے آنشان کی کمان بنائی
اور گل گامش ہتھیاروں سے لیس ہو گیا۔
اور اِن کدو بھی۔
اور ان کے اسلحوں کا وزن پندرہ من تھا۔
تب اریک کے شہری اور مشیر چوک میں جمع ہوئے
وہ سات قلابوں والے پھاٹک سے آئے۔
اور گل گامش نے بازار میں کھڑے ہو کر ان سے خطاب کیا:
''میں گل گامش، اس مخلوق کو دیکھنے جا رہا ہوں
جس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتی ہیں۔
اور یہ افواہیں چار سو پھیلی ہوئی ہیں
میں اسے چندن کے بن میں ہراؤں گا۔

اور فرزندانِ اریک کی طاقت کے جوہر دکھاؤں گا
اور ساری دنیا میں اس بات کا ڈنکا بجے گا
میں نے اس مہم کا تہیہ کرلیا ہے
پہاڑ پر چڑھنے اور چندن کو کاٹنے اور
اپنے پیچھے ابدی شہرت چھوڑ جانے کا۔"
اریک کے مشیروں نے کہا:
"گِل گامش! تو ابھی نوعمر ہے
تیری جرأت حد سے تجاوز کر رہی ہے۔
شاید تو اس مہم کے انجام سے واقف نہیں ہے
ہم نے سنا ہے کہ حمبابا انسانوں کی طرح فانی نہیں ہے۔
اور کوئی اس کے ہتھیاروں کی تاب نہیں لا سکتا۔
اور وہ بن ہر چہار سمت پندرہ ہزار کوس تک پھیلا ہوا ہے
اپنی مرضی سے کون اس کی گہرائیوں کا سراغ لگانا چاہے گا۔
حمبابا گرجتا ہے تو اس کی آواز میں طوفان کا شور ہوتا ہے
اور اس کے منھ سے شعلے نکلتے ہیں۔
اور اس کے جبڑے موت کا دہانہ ہیں۔
گِل گامش تو ایسی حرکت کیوں کرنا چاہتا ہے؟
حمبابا سے لڑنا اپنے ہم سر سے لڑنا نہیں ہے"
گِل گامش نے مشیروں کے یہ الفاظ سنے۔
تو اپنے رفیق کی جانب دیکھا اور ہنسا:
"میں ان باتوں کا کیا جواب دوں؟
کیا میں کہوں کہ ہاں، مجھے حمبابا سے ڈر لگتا ہے
اور میں زندگی کے باقی دن گھر کے اندر چھپ کر بسر کروں گا۔"

تب گل گامش نے دوبارہ اپنا منھ کھولا اور کہا:

''میرے دوست! آؤ ای گل ماہ کے کوشک (معبد) کی زیارت کو چلیں

اور ملکہ نن سؤن کے روبرو کھڑے ہوں

کہ وہ علیم و خبیر ہے

وہ ہمیں سفر کی بابت مفید مشورے دے گی۔''

اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

ای گل ماہ کی سمت روانہ ہوئے

عظیم ملکہ نن سؤن کے دربار کی سمت۔

گل گامش کوشک میں داخل ہوا۔

اور نن سؤن سے مخاطب ہو کر بولا:

''نن سؤن! کیا تو میری عرض سنے گی؟

مجھے ایک طویل سفر پر جانا ہے۔ حمبابا کے دیس میں۔

مجھے ایک نامعلوم راستے پر چلنا ہوگا

اور ایک انوکھی جنگ لڑنی ہوگی۔

پس میری روانگی کے دن سے میری واپسی کے دن تک

میرے چندن کے جنگل میں داخل ہونے سے

اور بھیانک بلا کو جس سے شمس نفرت کرتا ہے

ہلاک کرنے تک،

میرے حق میں شمس سے دعا کرتی رہنا''

نن سون اپنے کمرے میں گئی،

اس نے موزوں لباس زیب تن کیے۔

اور اپنی چھاتیوں کو حسین بنانے کی خاطر زیور سے آراستہ کیا

اور سر پر تاج رکھا۔

اور اس کا لہنگا زمین پر لوٹ رہا تھا
تب وہ شمس کی قربان گاہ پر گئی
جو محل کی چھت پر تھی
اس نے لوبان جلایا
اور جب دھواں بلند ہوا
تو اس نے اپنے ہاتھ شمس کی جانب اٹھائے:
"شمس! تو نے میرے بیٹے گل گامش کو بے چین دل کیوں دیا؟
ہاں کیوں دیا؟
اس خواہش کا پیدا کرنے والا تُو ہی ہے
اور اب وہ سرزمینِ حمبابا کے طویل سفر پر آمادہ ہے
وہ ایک نامعلوم راستے پر ایک انوکھی لڑائی لڑنے جارہا ہے
لہٰذا اس کے یومِ سفر سے یومِ مراجعت تک،
اس بلا کو ہلاک کرنے تک جس سے تُو نفرت کرتا ہے
گل گامش کو فراموش نہ کرنا
اپنی چہیتی دلہن آیا کو حکم دے
کہ وہ تجھے مسلسل یاد دلاتی رہے
اور جب دن تمام ہو جائے
تو گل گامش کو محافظِ شب کے سپرد کر
کہ وہ اسے ہر خطرے سے بچائے رکھے۔"
تب گل گامش کی ماں ننسون نے لوبان بجھا دیا۔
اور اِن کدو کو پکارا:
"قوی ہیکل اِن کدو۔ تو میری کوکھ سے نہیں پیدا ہوا ہے
مگر میں تجھے اپنا منہ بولا بیٹا بناتی ہوں

اُن بن ماں باپ کے بچوں کی مانند جن کو معبد میں لاتے ہیں
گل گامش کی خدمت کرنا جس طرح یتیم بچہ یا پجارن
معبد کی خدمت کرتے ہیں
میں یہ اعلان پجارنوں، پرستاروں اور پروہتوں کے روبرو کرتی ہوں۔"
تب اس نے اِن کدو کی گردن میں تعویذ حلف ڈالا۔
اور اس سے کہا:
"میں اپنے بیٹے کو تیری حفاظت میں دیتی ہوں،
اسے سلامتی سے میرے پاس لانا"
اور وہ ان کے اسلحے لے آئے۔
تلواریں طلائی غلافوں میں ان کے حوالے کیں
اور کمان اور ترکش بھی۔
گل گامش نے تیشے کو ہاتھ میں لیا
ترکش اور انشان کی کمان کو کاندھے پر لٹکایا
اور تلوار کو کمر بند سے باندھا
اور تب وہ مسلح ہو کر سفر کے لیے تیار ہو گیا۔
اور شہری جوق در جوق ان کے پاس آئے۔
اور پوچھنے لگے کہ "تم کب تک واپس آؤ گے"
مشیروں نے گل گامش کو برکت دی اور تنبیہ کی کہ
"اپنی قوت پر حد سے زیادہ اعتماد نہ کرنا،
ہوشیار رہنا اور ابتدا میں وار سنبھل کر کرنا،
آگے والے کا فرض اپنے ساتھی کی حفاظت کرنا ہے۔
اور واقف راہی ہی رفیق کا محافظ ہو سکتا ہے۔
لہٰذا اِن کدو آگے آگے چلے۔

وہ جنگل کی راہ سے آگاہ ہے۔
اس نے حمبابا کو دیکھا ہے اور
وہ جنگوں کا تجربہ رکھتا ہے
درّوں میں پہلے وہی داخل ہو۔
وہ چوکنا رہے۔
اِن کدو کو چاہیے کہ اپنے دوست کی نگہبانی کرے۔
اور اسے راستے کے پوشیدہ خطروں سے بچائے۔
اِن کدو! ہم مشیرانِ اریک
اپنے بادشاہ کو تیری حفاظت میں دیتے ہیں۔
اسے سلامتی سے واپس لانا۔"
پھر وہ گِل گامِش سے مخاطب ہوئے:
"شمس تیرے دل کی آرزو پوری کرے۔
اور تیری آنکھوں کو اس مقصد کی تکمیل سے روشن کرے۔
جس کا ذکر تیرے لبوں نے کیا ہے
وہ مسدود راستوں کو تجھ پر کشادہ کرے۔
اور تیرے قدموں کے لیے راہ ہموار کرے
پہاڑوں کو تیرے لیے کھول دے۔
رات تیرے لیے اپنی تمام نعمتیں لے کر آئے۔
اور لوگل باندا، تیرا محافظ دیوتا، فتح کی خاطر تیرے پہلو میں کھڑا رہے۔
جنگ میں تو یوں لڑے گویا کسی بچے سے لڑتا ہے۔
اپنے پاؤں دریائے حمبابا میں دھونا۔
شام کے وقت ایک کنواں کھود لینا۔
اور اپنی مشک کو ہمیشہ صاف پانی سے پُر رکھنا،

شمس کو آبِ سرد کی نذر دینا،
اور لوگل باندا کو نہ بھولنا۔"
تب اِن کدو نے اپنا منھ کھولا اور کہا:
"آگے بڑھو! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔
میرے پیچھے پیچھے آؤ کیونکہ میں حمبابا کے مسکن سے واقف ہوں۔
اور اس کی سیرگاہ کے راستوں کو جانتا ہوں۔
اب مشیر واپس جائیں۔
کیونکہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"
مشیروں نے یہ سنا تو انھوں نے گل گامش کو رخصت کیا۔
"جا گل گامش، تیرا محافظ دیوتا راہ میں ترا نگہبان ہو۔
اور تجھے اریک کے شہر پناہ تک بخیریت واپس لائے۔"
تیس کوس کا سفر طے کر کے انھوں نے اپنا فاقہ توڑا۔
اور مزید پینتالیس کوس کے بعد انھوں نے شب گزاری کے لیے منزل کی۔
ایک دن میں وہ پچھتر کوس چلے گئے
اس طرح انھوں نے تین دن میں ایک ماہ اور دو ہفتوں کا سفر طے کیا۔
وہ سات پہاڑوں کو عبور کر کے جنگل کے پھاٹک تک پہنچے۔
اور پھاٹک کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔
ابھی ان کو سر بفلک چندن نظر نہ آیا تھا۔
مگر پھاٹک کی لکڑی کو دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔
اس کی اونچائی چھتیس گز تھی۔
اور چوڑائی بارہ گز۔
اس کی چول، چھلے اور بازو سب درست تھے۔
ہنرمندوں نے اسے نیفر میں تیار کیا تھا۔

اِن لیل کے مقدس شہر میں۔
تب اِن کدو نے آواز دی:
''بِگل گامِش! تواریک میں جو ڈینگیں مارتا تھا، انھیں یاد کر،
آگے بڑھ اور حملہ کر،
اریک کے فرزند، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''
بِگل گامِش نے یہ الفاظ سنے تو اس کی جرأت عود کر آئی۔
اس نے جواب دیا:
''جلدی کر، گھیر لے،
اور اگر پہرے دار ہو تو اسے جنگل میں بھاگنے نہ دینا۔
ورنہ وہ غائب ہو جائے گا۔
اس نے اپنی پہلی بکتر پہن لی ہے۔
مگر ابھی چھ اور باقی ہیں۔
اسے مسلح ہونے سے پہلے پکڑ لینا چاہیے۔''
جنگل کا پاسبان بپھرے ہوئے سانڈ کی مانند پھنکارنے لگا۔
اور بڑے خوف ناک انداز میں مڑا۔
وہ ڈکارا
اور طاقت ور سانڈ کی مانند جنگل میں گھس گیا۔
وہ اپنے چندن کے گھر میں چلا گیا۔
تب اِن کدو پھاٹک کے نزدیک گیا
پھاٹک اتنا خوبصورت تھا کہ
اِن کدو کے دل نے اس پر تیشہ چلانا گوارا نہ کیا۔
اس نے پھاٹک کو دھکا مار کر کھول دیا۔
تب اِن کدو نے بِگل گامِش کو آواز دی:

''جنگل میں قدم نہ رکھنا۔
کیونکہ میں نے پھاٹک کھولا تو میرے ہاتھ طاقت کھو بیٹھے۔''
گل گامش نے جواب دیا:
''عزیز دوست! بزدلوں کی سی باتیں مت کر۔
کیا ہم نے یہ خطرے اسی لیے مول لیے تھے
اور اتنی مسافت اسی لیے طے کی تھی کہ
آخر میں پیٹھ دکھا کر لوٹ جائیں۔
تو، جو جنگ آزمودہ ہے، میرے ساتھ چل،
تو تجھے موت کا خوف نہ ستائے گا۔
میرے پاس رہ تو تجھے ضعف نہ محسوس ہوگا۔
اور رعشہ تیرے ہاتھوں کو چھوڑ دے گا۔
یا میرا دوست یہیں ٹھہر جانا پسند کرے گا؟
نہیں ہم دونوں جنگل کے دل میں اتریں گے۔
آنے والی جنگ تیری جرأت کو بیدار کرے۔
موت کو بھول جا اور میرے پیچھے پیچھے آ
میں دُھن کا پکا ضرور ہوں۔
مگر اُجڈ اور احمق نہیں ہوں۔
دو آدمی ساتھ چلیں تو ہر ایک اپنا بچاؤ بھی کرتا ہے۔
اور دوست کی سپر بھی بنتا ہے۔
اگر وہ جنگ میں کام آئیں
تو ان کا نام باقی رہ جاتا ہے۔''
دونوں پھاٹک میں داخل ہوئے۔
اور کوہِ سبز تک پہنچے۔

اس منظر نے انھیں حیرت میں ڈال دیا۔
ان کے منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔
وہ چپ چاپ کھڑے جنگل کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔
انھوں نے چندن کی بلندی دیکھی۔
انھوں نے جنگل کا راستہ دیکھا۔
اور وہ پگڈنڈی بھی جس پر حمبابا چلتا تھا۔
راستہ چوڑا اور ہموار تھا۔
انھوں نے چندن کے پہاڑ کو غور سے دیکھا۔
اور دیوتاؤں کی آرام گاہ اور عشتار کے تخت کو
دیوار کی بلندی نے پہاڑ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔
اس کا سایہ آرام دہ تھا۔
اور پہاڑ اور میدان جھاڑیوں سے ڈھکے تھے۔
گل گامش نے وہاں غروبِ آفتاب سے پیش تر ایک کنواں کھودا۔
وہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور زمین کو لذیذ غذا کی نذر پیش کی
اور کہا:
"پہاڑ اور دیوتاؤں کے مسکن!
مجھے کوئی خواب دکھا جس کا شگون نیک ہو۔"
تب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر لیٹے اور سو گئے۔
اور نیند نے جو رات کے منھ سے نکلتی ہے، ان پر سایہ کر لیا۔
گل گامش نے خواب میں دیکھا
اور نیند آدھی رات کے وقت اس کے پاس چلی گئی۔
اور اس نے اپنا خواب اپنے دوست سے بیان کیا:
"اِن کدو! وہ کیا چیز تھی جس نے مجھ کو جگا دیا۔

حالانکہ تجھے نہیں جگایا؟
میرے دوست! میں نے ایک خواب دیکھا ہے:
ہم پہاڑ کی ایک گہری گھاٹی میں کھڑے تھے۔
کہ اچانک پہاڑ گر پڑا
اور اس کے سامنے ہم دونوں دلدل کی ننھی مکھی کی مانند تھے۔
میرے دوسرے خواب میں بھی پہاڑ گرا
اور اس نے مجھے زخمی کیا اور میرے پاؤں نیچے سے پکڑ لیے۔
تب آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی ایک روشنی نمودار ہوئی۔
اور اس کی چمک دمک حسنِ عالم سے بھی بڑھ کر تھی۔
اس نے مجھے پہاڑ تلے سے نکالا۔
اور پینے کے لیے پانی دیا اور میری ڈھارس بندھائی۔
اور مجھے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔"
تب اِن کدو، ابنِ صحرا نے کہا:
"چلو، اس پہاڑ سے اتریں
اور خواب کی تعبیر پر غور کریں۔"
اس نے نوجوان دیوتا گل گامش سے کہا:
"تمہارا خواب نیک ہے۔ تمہارا خواب اچھا ہے۔
پہاڑ جو تم نے دیکھا جمبابا ہے۔
بے شک اب ہم اسے پکڑ کر ہلاک کریں گے۔
اور جس طرح پہاڑ زمین پر گرا،
ہم بھی اسے زمین پر گرائیں گے۔"
دوسرے روز انھوں نے تیس کوس کی مسافت طے کی
اور اپنا فاقہ توڑا

اور مزید پینتالیس کوس کے بعد منزل کی۔
انھوں نے غروبِ آفتاب سے پیش تر ایک کنواں کھودا۔
اور ،گل گامش پہاڑ پر چڑھا۔
اور اس نے لذیذ غذا زمین کو نذر پیش کی اور کہا:
''پہاڑ!
جس کا شگون نیک ہو۔''
پہاڑ نے اِن کدو کے لیے خواب بھیجا۔
مگر اس خواب کا شگون بُرا تھا۔
اِن کدو کو کپکپی لگ گئی۔
جیسے کسی نے اسے ٹھنڈے پانی میں غوطہ دیا ہو۔
جیسے پہاڑی جَو کے پودے بارش کے طوفان میں لرزتے ہوں۔
لیکن ،گل گامش اپنی ٹھڈی کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا رہا۔
یہاں تک کہ نیند نے جو سب پر غالب آتی ہے،
اس پر سایہ کر لیا۔
نصف شب گزری تھی کہ نیند ،گل گامش سے مفارقت کر گئی۔
وہ اٹھا اور اپنے دوست سے کہنے لگا:
''کیا تم نے مجھے پکارا تھا؟ ورنہ میں کیوں جاگ پڑا۔
کیا تم نے مجھے چُھوا تھا؟ ورنہ میں کیوں خوف زدہ ہوں۔''
کیا کوئی دیوتا اِدھر سے گزرا ہے۔
کیونکہ میرے اعضا دہشت سے مفلوج ہو گئے ہیں۔
میرے دوست میں نے تیسرا خواب دیکھا۔
مگر یہ خواب بڑا اڈراؤنا تھا:
آسمان گرج رہا تھا، زمین ہونک رہی تھی۔

سورج کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔
ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔
اور بجلی چمک رہی تھی۔
اور آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔
اور بادل نیچے آ گئے تھے۔
اور ان سے موت کی بارش ہو رہی تھی۔
تب روشنی رخصت ہو گئی
آگ بجھ گئی۔
اور ہمارے چاروں طرف راکھ کا ڈھیر لگ گیا۔
آؤ پہاڑ سے نیچے اتریں۔
اور اس خواب پر غور کریں۔
اور یہ بھی سوچیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"
جب وہ پہاڑ سے نیچے اترے
تو گل گامش نے اپنا تیشہ کھولا
اور چندن کو کاٹ گرایا
حمبابا نے چندن کے گرنے کی آواز سنی۔
تو وہ غضب ناک ہو کر چیخا:
"کون ہے جس نے میرا جنگل پامال کیا۔
اور میرے چندن کو کاٹا۔"
لیکن شمسِ تاباں نے انھیں آسمان سے آواز دی:
"آگے بڑھو! ڈرو مت۔"
مگر اب گل گامش پر ضعف طاری تھا۔
کیونکہ نیند نے اس پر غلبہ کر لیا تھا

اور یہ وہ بڑی گہری نیند تھی
وہ زمین پر بے سُدھ پڑا تھا گویا خواب دیکھ رہا ہو۔
اِن کدو نے اسے چھوا مگر وہ نہ جاگا۔
اِن کدو نے اسے پکارا مگر اس نے جواب نہ دیا:
''گِل گامش! ارضِ کلاب کے آقا!
دنیا اندھیری ہوتی جا رہی ہے۔
سایہ پھیلتا جا رہا ہے،
اور شام کا دھندلکا جھلملا رہا ہے۔
شمس رخصت ہو چکا ہے۔
اس کا روشن سر اس کی ماں ننگل کے پیٹ میں چھپ گیا ہے
گِل گامش تو کتنی دیر یوں ہی پڑا سوتا رہے گا۔
اس ماں کو جس نے تجھے جنا ہے،
شہر کے چوک میں بین کرنے پر مجبور نہ کر۔''
آخر کار گِل گامش نے اس کی آواز سنی
اس نے اپنا سینہ بند ''سورماؤں کی آواز'' پہنا
جس کا وزن تیس شیکل تھا۔
مگر اس نے اس وزنی سینے بند کو یوں اٹھا کر پہن لیا
گویا وہ بھی کوئی ہلکی پھلکی پوشاک تھی۔
اور سینہ بند نے اس کو بالکل ڈھانک لیا
وہ زمین پر ٹانگیں پھیلا کر اس طرح کھڑا ہو گیا۔
جیسے پھنکارنے والا سانڈ،
اور اس نے اپنے دانت بھینچ لیے:
''اپنی ماں ننسون کی جان کی قسم

اور اپنے باپ، مقدس لوگل باندہ کی جان کی قسم،
میں اپنی ماں کے لیے،
جو مجھے اپنی گود میں بٹھا کر دودھ پلاتی تھی،
باعثِ فخر بنوں گا۔"
"اپنی ماں نن سون کی جان کی قسم،
جس نے مجھے پیدا کیا۔
اور اپنے مقدس باپ لوگل باندا کی قسم،
جب تک ہم اس انسان سے، اگر وہ انسان ہے،
لڑ نہ لیں،
جب تک اس دیوتا سے، اگر وہ دیوتا ہے،
لڑ نہ لیں،
ملکِ بقا کے شہر سے اپنے ملک واپس نہ جائیں گے۔"
تب اِن کدو، رفیقِ باوفا ملتجی ہو کر بولا:
"اے میرے آقا! تو اس عفریت کو نہیں جانتا
جبھی تو اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔
میں جو اس سے واقف ہوں سخت دہشت زدہ ہوں۔
اُس کے دانت اژدہے کی کھیسیں ہیں،
اُس کا چہرہ شیر کا سا ہے۔
اُس کا دھاوا سیلاب کا بہاؤ ہے۔
اُس کی ایک نگاہ، جنگل کے درخت اور دلدل کے جھاؤ،
سبھی کو جھلس دیتی ہے۔
میرے آقا! تُو چاہے تو اس کے دیس کی طرف بڑھ سکتا ہے۔
لیکن میں شہر کو واپس جاؤں گا۔

میں تیری ماں سے تیرے شاندار کارنامے بیان کردوں گا۔
یہاں تک کہ وہ خوشی سے چیخنے لگے گی۔
اور تب میں تیری موت کا حال اسے سناؤں گا۔
یہاں تک کہ وہ درد سے رونے لگے گی۔''
لیکن گلگامش نے کہا:
''قربانی اور چڑھاوا ابھی میرا مقسوم نہیں ہے۔
مُردے کی کشتی ابھی ظلمات کا سفر نہیں کرے گی۔
اور نہ ابھی تین تہہ کا کپڑا میرے کفن کے لیے تراشا جائے گا۔
ابھی میری رعایا کے بے نوا ہونے کا وقت نہیں آیا۔
ابھی میرے گھر میں چتا کی آگ نہیں جلے گی۔
اور نہ میری لاش کو نذرِ آتش کیا جائے گا۔
آج اگر تو میری اعانت کرے۔
اور میں تیری اعانت کروں
تو پھر ہمیں کون ضرر پہنچا سکے گا؟
گوشت سے پیدا ہونے والی تمام زندہ مخلوق کو
ایک نہ ایک دن مغرب کی کشتی میں بیٹھنا ہی پڑتا ہے
اور جب یہ کشتی مگی کوم کی کشتی ڈوبتی ہے۔
تو انھیں سدھارنا ہی پڑتا ہے۔
لیکن ہم آگے بڑھیں گے۔
اور اس راکشش کو اپنا نشانہ بنائیں گے۔
اگر تیرے دل میں خوف ہے تو خوف کو نکال پھینک،
اگر دہشت ہے تو دہشت کو دور کردے۔
اپنا تیشہ سنبھال اور یورش کر،

وہ جو جنگ کو ناتمام چھوڑ دیتا ہے، کبھی سکون نہیں پاتا۔"
حمبابا چندن کے مضبوط مکان سے باہر نکلا۔
اس نے اپنے سر کو جنبش دی
اور، گل گامش کو ڈرانا چاہا۔
اور اس نے اپنی نگاہیں۔
موت کی نگاہیں۔
گل گامش پر جما دیں۔
تب گل گامش نے شمس کو پکارا۔
اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے:
"شمسِ تاباں! میں نے وہی راستہ اختیار کیا
جس کا تو نے حکم دیا تھا،
مگر تو نے آڑے وقت میں اگر میری مدد نہ کی
تو میں کیسے بچوں گا؟"
شمسِ تاباں نے اس کی التجا سن لی۔
اور اس نے بادِ عظیم کو طلب کیا۔
بادِ شمال کو، بادِ طوفان کو، بادِ زمہریر کو، بادِ تند کو، بادِ سموم کو۔
وہ اژدہوں کی مانند آئیں۔
جھلس دینے والی آگ کی مانند،
مارِ سیاہ کی مانند جو دلوں کو منجمد کر دیتا ہے۔
تباہ کن سیلاب اور زبانِ برق کی مانند۔
آٹھوں ہوائیں حمبابا کے خلاف اٹھیں۔
انھوں نے اس کی آنکھوں پر تھپیڑے مارے۔
اور وہ ان کی گرفت میں آ گیا۔

پس وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔
اور حمبابا نے مبارزت ترک کر دی۔
وہ چلایا
"یہ کون لوگ ہیں جو صورت سے انسان نظر آتے ہیں
مگر دیوتاؤں سے لڑتے ہیں۔"
گل گامش نے نعرہ لگایا:
"ماں نن سون اور مقدس باپ لوگل باندا کی جان کی قسم،
ملکِ بقا میں، اس سرزمین میں،
میں نے تیرے مسکن کا سراغ لگا لیا ہے،
میں اپنے کمزور بازو اور مختصر ہتھیار
اس ملک میں تیرے خلاف لایا ہوں۔
اور اب میں تیرے چندن کے مکان میں داخل ہوں گا۔"
پس اس نے چندن کے سات درخت کاٹے۔
اور پہاڑ کے قدموں میں ڈال دیے۔
اس کے رفیق نے اس کے سرے چھانٹے۔
اور شاخوں کی ڈھیریاں بنائیں۔
اور وہ حمبابا کے گھر پہنچ گیا۔
اس کے وارد ہوتے ہی ماءِ بیت اپنے سوراخ سے نکل بھاگا۔
حمبابا نے اپنا سانس کھینچا،
اور یوں آواز آئی جیسے لُو کا طمانچہ لگا ہے
اور اس کے دانت بج رہے تھے۔
وہ گل گامش کے روبرو جھک گیا اور چیخا:
"شمس! میری سن! میں نے نہ ماں کو جانا ہے

اور نہ باپ کو جس نے میری پرورش کی ہوتی،
تجھی نے مجھے اس دیس میں پیدا کیا۔
تجھی نے میری پرورش کی۔
اور اِن لیل نے مجھے اس جنگل کا پاسبان مقرر کیا۔"
حمبابا نے، گل گامش کو حیاتِ آسمانی کا واسطہ دیا،
حیاتِ ارضی کا واسطہ دیا،
حیاتِ سفلی کا واسطہ دیا:
"میں تیرا غلام ہوں گا اور تو میرا آقا اور
جنگل کے سب درخت،
جن کی پرورش میں نے پہاڑ پر کی ہے۔
تیری ملکیت ہوں گے۔
میں انھیں کاٹ کر تیرے لیے ایک محل تعمیر کروں گا۔"
اس نے، گل گامش کا ہاتھ پکڑا۔
اور اپنے گھر میں لے گیا۔
یہاں تک کہ، گل گامش کے دل میں رحم آ گیا۔
اور اس نے اپنے رفیق سے کہا:
"اِن کدو! کیا طائرِ دام کو اپنے آشیانے میں
اور مردِ اسیر کو اپنی ماں کی آغوش میں
نہیں جانا چاہیے۔"
اِن کدو نے جواب دیا:
"اگر قوتِ فیصلہ نہ ہو
تو قوی ترین انسان بھی قسمت سے مار کھا جاتا ہے اور
نمتر، جو انسانوں میں امتیاز نہیں کرتا۔

اسے نگل جاتا ہے۔
اگر طائرِ دام اپنے آشیانے میں
اور مردِ اسیر اپنی ماں کی آغوش میں واپس آ جائے
تو پھر میرے دوست! تُو اس شہر میں کبھی واپس نہ جا سکے گا۔
جہاں وہ ماں تیری منتظر ہے۔
جس نے تجھے جنا تھا۔"

حمبابا نے کہا:
"اِن کدو، تو شر انگیز باتیں کرتا ہے۔
بھاڑے کا ٹٹو! اپنی روٹی کے لیے دوسروں کا محتاج!
تو نے حریف کے خوف اور رشک سے
یہ کلماتِ بدزبان سے نکالے ہیں۔"

اِن کدو نے کہا:
"گِل گامش! اس کی نہ سن
حمبابا کو مرنا ہی ہوگا۔"

لیکن گِل گامش بولا:
"اگر ہم نے حمبابا کو ضرر پہنچایا۔
تو نور کی تجلّی اور تابانی ماند پڑ جائے گی۔
اور شعاعوں کی زبان بند ہو جائے گی۔
اور روشنی کا سارا حسن زائل ہو جائے گا۔"

ان کدو نے گِل گامش کو جواب دیا:
"میرے دوست، ایسا نہیں ہوگا۔
طائر کو اگر پہلے ہی اسیر کر لیا جائے گا۔
تو اس کے بچے بھاگ کر کہاں جائیں گے؟

جب یہ بچے گھبرا کر گھاس میں چھپنے لگیں گے
تو ہم حسن و تجلّی کو تلاش کر لیں گے۔"
بِگل گامِش نے اپنے ساتھی کا مشورہ قبول کر لیا۔
اس نے تیشہ سنبھالا اور تلوار کو بے نیام کیا۔
اور حمبابا کی گردن پر ضرب لگائی۔
اور اس کے رفیق اِن کدو نے دوسری ضرب لگائی۔
تیسری ضرب پر حمبابا گر پڑا۔
اور ہلاک ہو گیا۔
تب ہنگامہ برپا ہوا۔
کیونکہ انھوں نے جنگل کے پاسبان کو قتل کیا تھا۔
وہ جس کی آواز سے ہرمان اور لبنان لرزتے تھے۔
پہاڑیاں اپنی جگہ سے ہٹ گئیں۔
اور پہاڑ حرکت میں آ گئے۔
کیونکہ چندن کا پاسبان بے جان پڑا تھا۔
حمبابا کو اِن کدو نے ہلاک کیا تھا۔
اور چندن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔
یہ کام اِن کدو کا تھا۔
اس نے عظیم دیوتاؤں کے پوشیدہ مسکن کو عریاں کیا تھا۔
بِگل گامِش نے جنگل کے درخت کاٹے۔
اور اِن کدو نے دریائے فرات کے ساحل تک کے علاقے کو جڑوں سے صاف کیا۔
انھوں نے حمبابا کو دیوتاؤں کے روبرو پیش کیا۔
اِن لیل اور اِنّن لیل کے روبرو۔

اور اُنُو نا کی نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا:

پانچواں باب

عِشتار کا اظہارِ عشق

گِل گا مِش نے اپنے میلے بال دھوئے
اور ہتھیاروں کو صاف کیا۔
اپنی زلفیں شانوں پر بکھیریں۔
اپنے گندے کپڑوں کو پھینک دیا اور نئی پوشاک پہنی۔
پھر شاہی لبادہ اوڑھا اور پٹکا باندھا۔
اور جب گِل گا مِش نے اپنا تاج پہنا۔
تو حسین عِشتار نے بھی اس کے حسن کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا:
"گِل گا مِش آ اور میرا دولھا بن جا۔
اور اپنا تخم مجھے دے۔
مجھے اپنی دلہن بنا اور تو میرا شوہر ہو۔
میں تیرے لیے لاجورد اور سونے کا رتھ سجاؤں گی۔
جس کے پہیے طلائی ہوں گے اور سینگیں تانبے کی۔
تیرے رتھ میں مضبوط خچرّوں کی بجائے طوفانی عفریت جتے ہوں گے
جب تو دیودار کی خوشبو سے مہکتا ہوا میرے محل میں داخل ہوگا
تو میری چوکھٹ اور میرا تخت تیرے قدم چومیں گے۔

بادشاہ، شہزادے اور رؤسا تجھے تعظیم دیں گے۔
وہ کوہساروں اور میدانوں سے آ کر تجھے خراج پیش کریں گے
تیری بکریاں تین تین بچے جنیں گی اور تیری بھیڑیں جڑواں بچے۔
تیرے گدھے بار برداری میں خچروں پر سبقت لے جائیں گے۔
تیرے بیلوں کا کہیں جواب نہ ہوگا۔
اور تیرے رتھ کے گھوڑے تیز رفتاری کے لیے دور دور مشہور ہوں گے۔"
گِل گامش نے بولنے کے لیے منہ کھولا:
"اگر میں تجھ سے شادی کرلوں تو بدلے میں کیا تحفہ دوں؟
تیرے جسم کے لیے کون کون سے روغن، کون کون سی پوشاکیں؟
تیری غذا کے لیے کیسی روٹی؟
میں ایسی غذا کہاں سے لاؤں جو دیوتاؤں کے شایانِ شان ہو۔
اور ایسی شراب کہاں سے مہیا کروں جسے شہزادیِ فلک پی سکے؟
اس کے علاوہ اگر میں تجھے — شادی میں قبول کرلوں
تو میرا انجام کیا ہوگا؟
تُو وہ انگیٹھی ہے جو سردیوں میں ٹھنڈی رہتی ہے
وہ پائیں دروازہ ہے۔
جو ہوا کے جھونکوں اور گرد کے طوفانوں کو
اندر آنے سے نہیں روکتا۔
ایک محل جو اپنی پاسبان فوج پر آفت ڈھاتا ہے۔
رال سے بھرا ہوا مٹکا جسے اٹھاؤ
تو کپڑے اور جسم سب کالے ہو جاتے ہیں۔
ٹپکتی ہوئی ایک مشک جو مشک بردار کو بھگو دیتی ہے۔
پتھر جو دیوار پر سے لڑھک آتا ہے۔

جوتا جو پہننے والے کے پاؤں لہولہان کر دیتا ہے۔
تو نے اپنے کس عاشق سے وفا کی؟
تیرے کس گڈریے نے تجھ کو آسودہ کیا؟
سن! میں تجھے تیرے عاشقوں کا انجام سناتا ہوں!
تموز کا حال سن،
جو تیرے عہدِ جوانی میں تیرا عاشق تھا۔
تو اسے سالہا سال رُلاتی، تڑپاتی رہی،
تو نے طائرِ ہفت رنگ سے عشق کیا۔
اور پھر اس کے بازو توڑ دیے۔
اور اب وہ باغ میں بیٹھا، میرے بازو، میرے بازو، پکارتا ہے۔
تب تو نے ایک قوی ہیکل شیر سے عشق کیا۔
پھر اسی کے لیے سات اور سات گڑھے کھودے۔
تب تو نے ایک اسپ نر سے عشق کیا۔
جو جنگ میں شہرت پا چکا تھا۔
مگر انجامِ کار اس کی تقدیر میں مہمیز، چابک اور چمڑے کا کوڑا لکھا تھا۔
اور حکم ملا کہ وہ دس کوس تک سرپٹ دوڑتا رہے۔
اور گندا پانی پیے۔
اور اس کی ماں سی لی لی کی قسمت میں گریہ وزاری آئی۔
تب تو نے گلہ بان سے عشق کیا۔
جس نے تیرے لیے اُپلوں کے ڈھیر لگا دیے۔
اور اپنے نوخیز جانوروں کا گوشت تجھے پیش کرتا رہا۔
پھر بھی تو اسے دکھ دینے سے باز نہ آئی۔
تو نے اسے بھیڑیا بنا دیا۔

اور اب اسی کے گلّے کے لڑکے اس کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔
اور اس کے اپنے کتّے اس کی رانوں میں کاٹتے ہیں۔
اور کیا تو نے اِشولانُو سے عشق نہیں کیا۔
اپنے باپ کے باغبان سے؟
وہ تیرے لیے کھجوروں کی ان گنت ٹوکریاں لاتا
اور تیرے دسترخوان کو روز پھلوں سے سجاتا۔
تو نے اسے تاکا اور اس کے پاس گئی۔
'اے میرے پیارے اِشولانُو!
میں تیری قوتِ مردمی کا مزہ چکھنا چاہتی ہوں۔
اپنا ہاتھ بڑھا، میرے اندام کو چھو اور مجھے اپنا بنا،
میں تیری ہوں۔'

اِشولانُو نے جواب دیا:
'تو مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟
میری ماں روٹی پکاتی ہے اور میں کھاتا ہوں
پھر تجھ جیسی کے پاس گلی سڑی غذا کھانے کیوں آؤں؟
جھاؤ کی دیوار نے کب کسی کو پالے سے بچایا ہے'۔
تو نے یہ جواب سنا۔
تو اسے پیٹا اور چھچھوندر بنا دیا۔
اب وہ زمین میں پھنسا ہوا ہے۔
نہ اوپر آ سکتا ہے نہ نیچے جا سکتا ہے۔
اس بےچارے کی آرزو ہمیشہ اس کے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔
اب اگر میں تیرا عاشق بنوں،
تو کیا میرا انجام یہی نہ ہوگا۔''

عِشتار نے یہ سنا تو اسے بڑا طیش آیا۔
اور وہ آسمان پر گئی۔
اور اپنے باپ اَنُوؔ اور اپنی ماں ان توم سے کہنے لگی:
''میرے باپ! گِل گامِش نے میری بڑی توہین کی ہے۔
اس نے میری بدکاریوں کے قصے میرے منہ پر کہہ دیے۔
اور میرے اعمالِ سیاہ ایک ایک کر کے گنوائے۔''
اَنُوؔ نے بولنے کے لیے منہ کھولا
اور درخشاں عِشتار سے کہا:
''بلاشبہ، اس جھڑکی اور ذلّت کو خود تُو نے دعوت دی تھی۔
پس گِل گامِش نے تیری سیاہ کاریاں اور بداعمالیاں تجھے گنوادیں۔''
عِشتار نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا،
اور اپنے باپ اَنُوؔ سے کہا:
میرے باپ! مجھے ثورِ فلک بنادے۔
تا کہ میں گِل گامِش کو ہلاک کر سکوں
اور اس میں غرور بھر دے تا کہ وہ برباد ہو جائے۔
اگر تو نے مجھے ثورِ فلک نہ بنایا،
تو میں ظلمات کے دروازے توڑ ڈالوں گی۔
اور اس کے بیلنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔
میں پاتال کے پھاٹک کو چوپٹ کھول دوں گی۔
اور مُردوں کو اوپر لے آؤں گی تا کہ وہ زندوں کے ساتھ کھانا کھائیں۔
اور مُردوں کی تعداد زندوں سے بڑھ جائے گی۔''
اَنُوؔ نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا
اور درخشاں عِشتار سے کہا:

''اگر میں نے تیری خواہش پوری کر دی
تو سات سال تک دنیا میں قحط رہے گا
اور اناج کے دانے کھوکھلے ہو جائیں گے۔
کیا تو نے لوگوں کے لیے کافی اناج فراہم کر لیا ہے
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست ہو گیا ہے؟''

عِشتار نے بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا
اور اپنے باپ اَنُو سے کہا:
''میں نے لوگوں کے لیے اناج کوٹھیوں میں بھر دیا ہے۔
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔
اگر سات سال تک اناج کے دانوں میں چھلکے کے سوا کچھ نہ ہوا۔
تو بھی آبادی کے لیے اناج موجود ہے
اور گھاس بھی کافی ہے''

پس اَنُو نے بیٹی کے لیے ثورِ فلک پیدا کیا۔
ثورِ فلک زمین پر آیا
اس نے اپنے پہلے حملے میں ایک سو آدمی ہلاک کیے۔
پھر دو سو آدمی پھر تین سو آدمی
اور اس کے دوسرے حملے میں کئی سو آدمی مارے گئے۔
اور اپنے تیسرے حملے میں وہ اِن کِدُو پر جھپٹا۔
مگر اِن کدو نے اس کا وار خالی دیا۔
اور اُچھل کر سانڈ کی دونوں سینگیں پکڑ لیں۔
ثورِ فلک نے اپنا جھاگ اس کے منہ میں پھینکا۔
اور اپنی موٹی دُم سے اسے کوڑے مارے۔

اِن کدو نے گِل گامش کو آواز دی اور کہا:

''میرے دوست ہمیں گھمنڈ تھا کہ ہم اپنے پیچھے نام چھوڑ جائیں گے،
اب اپنی تلوار اس کی گردن اور سینگ کے درمیان پیوست کر دے۔''
گِل گامش نے سانڈ کا پیچھا کیا
اور اس کی دُم پکڑ لی
اور اپنی تلوار سانڈ کی گردن اور سینگوں کے درمیان پیوست کر دی۔
اور اسے ہلاک کر دیا۔
اور اس کا دل نکال کر شمس کو چڑھاوا پیش کیا۔
تب دونوں بھائیوں نے آرام کیا۔

تب عِشتار اریک کی بڑی دیوار پر چڑھ گئی
اور فصیل پر سے سراپ دینے لگی۔
''گِل گامش کا بُرا ہو۔
جس نے ثورِ فلک کو قتل کر کے میری توہین کی ہے۔''

اِن کدو نے عِشتار کے یہ الفاظ سنے۔
تو اس نے سانڈ کی دائیں ران چیر کر
عِشتار کے منھ پر پھینک ماری اور پکارا:
''اگر میں تجھے پکڑ پاؤں تو تیرا بھی یہی حال کروں
اور تیری انتڑیاں نکال کر تیرے پہلو میں رکھ دوں۔''

تب عِشتار نے اپنے موبدوں کو طلب کیا۔
اور ناچنے لگانے والی لڑکیوں کو
اور مندر کی داسیوں کو
اور درباریوں کو
اور سب لوگ سانڈ کی دائیں ران پر بین کرنے بیٹھ گئے۔

لیکن گِل گامش نے ہنرمندوں اور کاری گروں کو

ایک ساتھ طلب کیا۔

وہ سینگوں کی موٹائی دیکھ کر عش عش کر گئے
ان پر لاجورد کا دو دو انگل موٹا جڑاؤ کام بنا تھا۔
ان کا وزن پندرہ پندرہ سیر تھا۔
اور ان کے اندر تیل کے چھ پیمانوں کی گنجائش تھی۔
تیل اس نے اپنے محافظ دیوتا لوگل باندا کی خدمت میں پیش کیا۔
اور سینگوں کو محل میں لا کر شاہی خواب گاہ میں لٹکا دیا۔
تب انھوں نے اپنے ہاتھ دریائے فرات میں دھوئے
اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔

وہ اریک کے بازار سے سواری میں گزرے
اور شہریوں کا ہجوم انھیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔
اور بِگل گامِش نے گانے والی لڑکیوں سے پکار کر کہا:
''سورماؤں میں سب سے شان والا کون ہے؟
شہریوں میں سب سے عزت والا کون ہے؟''
بِگل گامِش سورماؤں میں سب سے عزت والا ہے!
بِگل گامِش شہریوں میں سب سے عزت والا ہے!
تب شاہی محل میں جشنِ فتح منایا گیا
اور خوشی کے شادیانے بجے،
یہاں تک کہ سورماؤں کے سونے کا وقت آ گیا۔

چھٹا باب

اِن کِدُو کی بیماری اور موت

ان کِدُو بھی سونے کے لیے بستر پر لیٹا
اور اس نے ایک خواب دیکھا۔
اور خواب کو اپنے بھائی سے بیان کرنے اٹھ بیٹھا:
''میرے دوست! عظیم دیوتا مجلسِ شوریٰ میں کیوں بیٹھے ہیں؟''
اور جب صبح ہوئی تو اِن کِدُو نے گِل گا مِش سے کہا:
''رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا:
اَنُو، ان لِیل، اِیا اور شمس مجلسِ شوریٰ میں بیٹھے تھے۔
اور اَنُو نے اِن لِیل سے کہا:
''انھوں نے ثورِ فلک اور حمبابا کو ہلاک کیا ہے۔
لہٰذا دونوں میں سے ایک کو مرنا ہوگا۔
پھر وہ کیوں نہ مرے جس نے چندن کے درخت کو کاٹ کر پہاڑ کو ننگا کیا تھا؟''
لیکن اِن لِیل نے کہا: اِن کِدُ کو مرنا ہوگا۔
گِل گا مِش نہیں مرے گا۔
''تب شمس تاباں نے بہادر اِن لِیل کو جواب دیا:
کیا انھوں نے ثورِ فلک اور حمبابا کو
میرے حکم سے نہیں ہلاک کیا تھا؟
پھر اِن کِدُو بے قصور کیوں مارا جائے؟
لیکن اِن لِیل شمس سے خفا ہو کر بولا:
تم روز ان کے پاس دوستی کرنے جاتے تھے۔

اسی لیے تم ان کی حمایت کر رہے ہو۔''

پس اِن کِدُ بیمار پڑا اور ہِگل گامش کے روبرو لیٹ گیا۔
ہِگل گامش کی آنکھوں سے آنسو کی ندی بہہ رہی تھی۔

اور اس نے کہا:

''اے میرے بھائی، میرے پیارے بھائی!

کاش وہ میرے بھائی کے بدلے مجھے لے جاتے۔

کیا مجھی کو مُردے کے پہلو میں،

روح کے دروازے پر بیٹھنا ہوگا؟

جہاں میں اپنے پیارے بھائی کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

بیماری میں اکیلے پڑے پڑے اِن کِدُ نے جنگل کے پھاٹک کو سراپ دیا۔
اور اس سے یوں مخاطب ہوا گویا وہ بھی کوئی جان دار شے تھی۔

''اے لکڑی کے دروازے! جسے فہم ہے نہ ادراک!

میں نے تجھے کسی معمولی لکڑی کا بنا ہوا سمجھا تھا۔

اس سے پیش تر کہ مجھے چندن کے اونچے اونچے درخت نظر آتے،

تیری لکڑی تیس کوس کے فاصلے سے مجھے بہت پسند آئی تھی۔

تیری اونچائی ۳۶ گز تھی اور تیری چوڑائی ۱۲ گز تھی۔

تیری چوُل چوُل میں جڑی ہوئی سام اور مٹھیا سب درست تھیں۔

بڑھیوں نے تجھے نِفر میں تیار کیا تھا۔

اِن لِیل کے مقدس شہر میں۔

اے دروازے! اگر میں جانتا کہ میرا یہ انجام ہوگا،

اگر میں جانتا کہ تیری شان وشوکت

میرے لیے جان لیوا ہوگی،

تو میں نے تیشہ لے کر تجھے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہوتا،

گویا تو جھاؤ کا چوکھٹا تھا۔
میں تجھے اپنے ہاتھ سے ہرگز نہ چھوتا۔"
تب اُس نے بہلیئے اور دیوداسی کو کوسا:
بہلیئے کا بُرا ہو جس نے مجھے دامِ فریب میں پھنسایا،
جنگلی جانور اُس کی آنکھوں کے سامنے جال میں سے بھاگ جائیں۔
اُس کی دلی آرزو کبھی پوری نہ ہو۔
تب اُس نے دیوداسی کو کوسنا شروع کیا:
سُن او لڑکی۔ اب میں تیری تقدیر کو بددُعا دوں گا۔
اور ابد تک تو اس تقدیر سے چُھٹکارا نہ پا سکے گی۔
میں تجھے سراپ دوں گا اور یہ سراپ بہت بُرا ہو گا،
وہ تجھے جلد ہی دبوچ لے گا:
دیوتا تیرے حُسن کی دلکشی سے بیزار ہو جائیں۔
راستے تیرا مسکن ہوں
اور تیرا بستر دیوار کے سائے میں بنے۔
بدمست اور ہشیار دونوں تیرے گال پر تھپڑ ماریں۔
شمس نے اِن کِدو کے مُنہ سے یہ الفاظ سُنے۔
تو اِن کِدُو کو آسمان سے آواز دی:
"اِن کدُو! تو اِس عورت کو کیوں سراپتا ہے۔
جس نے تجھے ایسی غذا کھانی سکھائی جو دیوتاؤں کے لئے موزوں تھی۔
اور تجھے ایسی شراب پینی سکھائی جو بادشاہوں کو مرغوب تھی۔
جس نے تجھے امیروں کا لباس پہنایا۔
کیا اس نے حسین گِل گامش کو تیرا رفیق نہیں بنایا،
اور کیا تیرے جگری دوست گِل گامش نے تجھے شاہی بستر پر نہیں سُلایا۔

اور اپنے تخت کے بائیں جانب آرام سے نہیں بٹھایا۔
اس نے رُوئے زمین کے شہزادوں کو تیرے قدم چومنے پر مجبور کیا۔
اور اِریک کے سب شہری تیرے غم میں مبتلا ہیں۔
اور جب تُو مر جائے گا۔
تو یہ لوگ تجھے رُوئیں گے۔
گِل گامش مسُرور انسانوں کو تیرے لئے مغموم بنائے گا۔
اور جب تُو چلا جائے گا۔
تو گِل گامش اپنے بال بڑھائے گا۔
اور شیر کی کھال اوڑھ کر صحرا میں مارا مارا پھریگا۔"
اِن کِدُو نے شمسِ تاباں کے یہ الفاظ سُنے
تو اُس کے برہم دل کو قرار آ گیا۔
اُس نے اپنی بددُعائیں واپس بلا لیں
اور دیوداسی کے حق میں دعا کی:
"کوئی تجھے حقیر نہ کرے
اور نہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر تیری ہنسی اُڑائے۔
بادشاہ، شہزادے اور رؤسا تجھ سے محبت کریں۔
بوڑھا آدمی اپنی داڑھی ہلا کر تجھے دعا دے۔
نوجوان تیرے جسم پر اپنا کمر بند کھولے
تیرا خزانہ عقیق، لاجورد سونے سے بھرا رہے۔
تیری آبروریزی کرنے والا کتے کی سزا پائے۔
اُس کا گھر ویران ہو۔
اور اس کے اناج کا ذخیرہ خالی ہو جائے۔
موبد تجھے دیوتاؤں کے رُوبرو آتے دیکھ کر

احتراماً ایک طرف ہٹ جائیں۔
لوگ تیری خاطر اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں
سات بچوں کی ماں کو

اِن کِدُ بستر پر بیمار پڑا تھا۔
اور جب رات ہوئی
تو اس نے اپنے دل کی بات، گل گامش سے کہی:
''میرے دوست! کل رات میں نے پھر ایک خواب دیکھا:
آسمان رو رہا تھا اور زمین اس کا ساتھ دے رہی تھی۔
میں ایک بھیانک ہستی کے روبرو اکیلا کھڑا تھا۔
اس کا چہرہ کالا تھا طوفان کے طائر سیاہ کی مانند
اور اس کے ناخن شاہین کے پنجوں کی طرح تھے
وہ جھپٹا اور مجھے اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔
یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔
اس نے میری شکل بدل دی۔
اور میرے بازو پرند کی مانند پروں سے ڈھک گئے۔
اس نے مجھے گھور کر دیکھا
اور ملکۂ ظلمات، ارکالا کے محل میں لے گیا۔
اس راستے پر، جس سے کوئی نہیں لوٹتا۔
اس مکان میں جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔

یہ وہ مکان ہے، جس کے مکین اندھیرے میں رہتے ہیں۔
دھول ان کا توشہ ہے اور چکنی مٹی ان کی خوراک۔
وہ پرندوں کا سا لباس پہنتے ہیں
اور ان کے پر لگے ہوتے ہیں۔

وہ روشنی نہیں دیکھتے بلکہ اندھیرے میں رہتے ہیں۔
میں اس خانہ غبار میں داخل ہوا۔
اور میں نے اس زمین کے تاجداروں کو دیکھا۔
کہ تاج سے ہمیشہ کے لیے محروم کردیے گئے تھے۔
شاہوں اور شاہزادوں کو دیکھا۔
غرض اُن سبھوں کو جو کسی زمانے میں زمین پر راج کرتے تھے۔
اور وہ جو کسی زمانے میں اَنُو اور اِن لیل کی مانند
خدائی کیا کرتے تھے۔
اس خانہ غبار میں خادموں کی طرح
تلا ہوا گوشت اٹھائے کھڑے تھے۔
وہ بریاں گوشت پیش کر رہے تھے۔
اور مشکوں سے ٹھنڈا پانی انڈیل رہے تھے۔
اسی خانہ غبار میں
موبدِ اعظم اور اس کے خُدام بھی موجود تھے۔
اور منتر پڑھنے والے اور ملنگ بھی
وہیں معبد کے ملازمین بھی تھے
اور دیوتاؤں کے برتن مانجھنے والے بھی۔
کیش کا فرماں روا اِتانا بھی تھا۔
جس کو عہد قدیم میں
شاہین اپنے پنجے میں اٹھا کر آسمان پر لے گیا تھا۔
میں نے مویشیوں کے دیوتا سموقان کو بھی دیکھا
اور ملکہ ظلمات اریش کی گل بھی وہیں تھی
اور ربیلت شری ملکہ ظلمات کے روبرو آلتی پالتی مارے

زمین پر بیٹھی تھی،
وہ جو دیرۂ خداوند اور لوحِ فنا کی محافظ ہے۔
اس کے ہاتھ میں ایک تختی تھی۔
اور وہ اس میں سے کچھ پڑھ رہی تھی۔
اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا:
اس کو یہاں کون لایا ہے۔

تب میری آنکھ کھل گئی
اور مجھے یوں محسوس ہوا
گویا کسی نے میرے بدن کا سارا خون چوس لیا ہے۔
جیسے کوئی جھاؤ کے بن میں اکیلا پھر رہا ہو۔
جیسے اہل کار ضبطی نے کسی کو پکڑ لیا ہو
اور دہشت سے اس کا دل بلیّوں اچھل رہا ہوں۔
میرے بھائی! کسی نامور شہزادے یا دیوتا کو
میری موت کے وقت اپنے پھاٹک پر کھڑا کر دینا۔
تا کہ وہ میرا نام مٹا کر اپنا نام لکھ دے۔"

اِن کِدُ نے اپنے کپڑے نوچ کر پھینک دیے
اور اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔
اور اس کی باتیں سن کر گل گامش کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
اس نے اپنا منہ کھولا اور اِن کِدُ و سے کہا:
"مضبوط پشتوں والے اریک میں
تجھ سے دانا کہاں ہے؟
تو نے عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں۔
مگر تیرا دل ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟

تیرا خواب حیرت انگیز تھا مگر اس سے زیادہ دہشت خیز۔
ہمیں اس خواب کا احترام کرنا ہوگا۔
خواہ وہ کتنا ہی دہشت خیز کیوں نہ ہو۔
کیونکہ اس خواب سے ظاہر ہو گیا ہے
کہ تندرست آدمی پر بھی برا وقت آ ہی جاتا ہے
زندگی کا انجام غم ہے۔"
اور گل گامش نے ماتم کیا۔
"اب میں عظیم دیوتاؤں سے التجا کروں گا۔
کیونکہ میرے دوست نے ایک برا خواب دیکھا ہے۔"

اِن کِدُ نے جس دن خواب دیکھا تھا
وہ دن تمام ہوا۔
اور وہ بیماری سے بدحال پڑا رہا۔
وہ پورا دن بستر میں لیٹا رہا اور اس کی تکلیف بڑھتی رہی۔
دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی
وہ دس دن تک یوں ہی بستر میں پڑا تڑپتا رہا۔
اور اس کی تکلیف برابر بڑھتی رہی۔
گیارھویں اور بارھویں دن درد اور شدید ہو گیا
آخر کار اس نے گل گامش کو بلوایا اور اس سے کہا:
"میرے دوست! عظیم دیوی نے مجھے سراپ دیا ہے۔
لہٰذا مجھے مرنا ہوگا۔
مگر میں اس طرح نہیں مروں گا جیسے سپاہی میدانِ جنگ میں مرتے ہیں
کیونکہ میں جنگ سے ڈر گیا تھا
مبارک ہے وہ جو جنگ میں لڑتا ہوا مارا جائے۔

لیکن میری موت تو شرم ناک ہوگی۔"

اور، گل گامش اِن کِدُ کے لیے روتا رہا۔

طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ، گل گامش کی آواز بلند ہوئی

اس نے مشیرانِ اریک کو مخاطب کر کے کہا:

"اریک کی معزز ہستیو! میری سنو!

میں اپنے دوست اِن کِدُ کے لیے روتا ہوں

میں عورتوں کی طرح نوحہ کناں ہوں۔

اے اِن کِدُ! غزال اور گورخر جو تیرے ماں باپ تھے

اور چوپائے جنہوں نے تجھے اپنے دودھ سے پالا تھا۔

تیرے لیے روتے ہیں۔

صحرا اور گیاہستان کے سب جنگلی جانور تیرے غم میں روتے ہیں۔

چندن کے بن میں تیرے محبوب راستے شب و روز شیون کرتے ہیں۔

پُشتوں سے محفوظ اریک کی بزرگ ہستیاں تجھے روئیں،

انگشتِ رحمت تیرے غم میں اونچی ہو،

اِن کِدُ! میرے بھائی، تو میرے پہلو میں تیشہ تھا۔

میرے بازو کی قوت، میری کمر کی تلوار، میرے سامنے کی سپر،

ایک زرق برق لباسِ جشن، میرے سب سے قیمتی اور سب سے حسین زیور

سنو! چہار جانب کہرام مچ رہا ہے۔

جیسے کوئی ماں بین کر رہی ہو۔

راستو! جن پر ہم ساتھ چلے ہیں آنسو بہاؤ،

اور وہ جگہیں

جہاں ہم نے تیندوے، چیتے، ہرن، بیل، ریچھ اور لکڑ بگھے کا شکار کیا تھا۔

اور وہ پہاڑ جسے عبور کر کے

ہم نے چندن کے پاسبان کو ہلاک کیا تھا۔
تجھے روتے ہیں۔
ایلم کی اُولا ندی اور پاک فرات
جس کے ساحل پر ہم چہل قدمی کرتے اور اپنی مشکیں بھرتے تھے،
تجھے روتی ہے
پشتوں سے محفوظ اریک، جہاں ہم نے ثورِ فلک کو مارا تھا،
اس کے سورما تجھے روتے ہیں۔
کاشت کار اور فصل بردار جو تیرے لیے اناج لاتے تھے۔
اب تجھے روتے ہیں۔
خدام جو تیرے بدن پر تیل کی مالش کرتے تھے
تجھے روتے ہیں
وہ دیوداسی جس نے تیرے منہ میں شراب چوائی تھی
اور تجھے خوشبودار تیل ملا تھا۔
اب تیرے لیے ماتم کرتی ہے۔
محل سرا کی خادمائیں
جو تیری پسند کی دلہن اور انگوٹھی لائی تھیں۔
اب پچھاڑیں کھاتی ہیں
تیرے نوجوان بھائی عورتوں کی مانند گریہ کناں ہیں۔
اور انھوں نے اپنے بال کھول دیے ہیں
بُری قسمت نے مجھے لوٹ لیا ہے۔
اے میرے نوجوان بھائی اِن کِدُ، اے میرے عزیز ترین دوست!
تجھ پر یہ کیسی نیند غالب آئی ہے۔
تو اندھیرے میں کھو گیا ہے اور میری آواز نہیں سن سکتا۔“

گل گامش نے اِن کِدُ کے سینے پر ہاتھ رکھا۔
مگر اِن کِدُ کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔
اور اس کی آنکھیں مند گئی تھیں۔
تب گل گامش نے اپنے دوست کا چہرہ ڈھانپ دیا۔
جیسے کسی دلہن کو نقاب اڑھائی جاتی ہے۔
اور وہ شیر کی مانند گرجا
اُس شیرنی کی مانند جس کے بچے چوری ہو گئے ہوں
وہ کبھی پلنگ کے سرہانے جاتا تھا کبھی پائنتی،
اس نے اپنے بال بکھیر دیے اور نوچ ڈالے۔
اور اپنی زرق برق پوشاک کو تار تار کر کے دور پھینک دیا۔
گویا وہ غلاظت سے آلودہ ہو گئی تھی۔

طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ گلِ گامش چیخا:
''میں نے تجھے سونے کے لیے شاہی بستر دیا
اور اپنی بائیں جانب کی نشست پر آرام سے بٹھایا۔
اور ملک ملک کے شہزادوں نے تیرے قدم چومے۔
اہالیانِ اریک تیری لاش پر ماتم کریں گے۔
اور تیرا مرثیہ پڑھیں گے
مسرور لوگوں کے سر فرطِ غم سے جُھک جائیں گے
اور جب تو زمین میں چلا جائے گا۔
تو میں تیری یاد میں اپنے بال بڑھاؤں گا
اور شیر کی کھال اوڑھ کر بیابان میں پھروں گا۔''

دوسرے دن اس نے صبح کی روشنی میں پھر اِن کِدُو کا ماتم کیا۔
سات دن اور سات راتیں وہ اِن کِدُو کے غم میں روتا رہا۔

یہاں تک کہ اِن کِدُ وکی لاش پر کیڑے رینگنے لگے،
تب اس نے اِن کِدُ وکو سپردِ خاک کیا۔
کیونکہ اَنُوْنا کی اس پر قابض ہوگیا تھا۔

تب، گل گامش نے ملک میں فرمان جاری کیا۔
اور سوناروں، نگینہ سازوں، سنگ تراشوں اور تانبے کا کام کرنے
والوں کو طلب کیا۔
اور انھیں حکم دیا کہ میرے دوست کا ایک بت بناؤ۔
اس بت کا سینہ لاجورد کا تھا اور جسم سونے کا۔
اور چوبِ ایلّما کی ایک بڑی سی میز سجائی گئی۔
اور اس پر شہد سے بھرا ہوا عقیق کا ایک پیالہ
اور مکھن سے بھرا ہوا لاجورد کا ایک پیالہ رکھ دیا گیا۔
اور، گل گامش نے شمس کو کھلے آسمان کے نیچے ان چیزوں کا چڑھاوا پیش کیا
اور روتا ہوا واپس چلا گیا۔

ساتواں باب

حیاتِ ابدی کی تلاش

گلِ گامش اپنے دوست اِن کِدُ و کے لیے زار و قطار روتا
اور بیابان میں گشت لگاتا رہا۔
تلخیٔ غم میں اس کے منھ سے یہ الفاظ نکلتے تھے:
''مجھے قرار کیسے آئے، مجھے سکون کیسے نصیب ہو؟
میرا سینہ رنج سے لبریز ہے۔

میں مروں گا تو میرا انجام بھی وہی ہوگا جوان کِدُ کا ہوا۔
موت کے خوف سے میں مارا مارا پھرتا ہوں۔
مگر موت سے بچنے کے لیے میں
یُوبارتوتو کے بیٹے اُتناپشتیم سے ملنے کی راہ
جس طرح بن پڑے، ضرور نکالوں گا۔
لوگ اسے ساکن ماورا کہتے ہیں۔
کیونکہ وہ دیوتاؤں کی مجلس میں شریک ہوگیا ہے۔"

پس گِل گامش ویرانوں میں پھرتا رہا۔
اور گیاہستانوں میں گھومتا رہا۔
اس نے اُتناپشتیم کی تلاش میں
جسے دیوتاؤں نے سیلاب کے بعد اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔
طویل سفر کیا۔
دیوتاؤں نے اُتناپشتیم کی اقامت دِلمون میں رکھی تھی،
گلشن شمس میں
اور انسانوں میں سے
بس اسی کو حیاتِ جاوداں بخشی تھی
اور جب گِلِ گامش رات کے وقت کوہستانی درّوں کے نزدیک پہنچا
تو اس نے دعا کی:
"مدت گزری میں نے انھیں درّوں میں شیر دیکھے تھے
اور میں ڈر گیا تھا۔
اور میں نے اپنا سر چاند کے دیوتا سین کی طرف بلند کیا تھا
اور دعا کی تھی،
اور میری دعائیں دیوتاؤں تک پہنچی تھیں۔

پس چاند کے دیوتا سین آج بھی میری حفاظت کر—"
دعا کرنے کے بعد جب وہ سونے کے لیے لیٹا۔
تو اس نے خواب دیکھا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔
اس نے دیکھا کہ شیر اس کے گرد خوشیاں منا رہے ہیں۔
پس اس نے اپنا تیشہ اٹھایا۔
اور تلوار نیام سے نکالی
اور تیر کی مانند ان پر جھپٹا
اور انھیں ہلاک کر کے ان کے ٹکڑے ہوا میں بکھیر دیے۔
آخر، گل گامش ایک کوہِ عظیم کے قریب پہنچا۔
جس کا نام مشو ہے
وہ پہاڑ جو آفتاب کے طلوع و غروب کا محافظ ہے۔
اس کی جڑواں چوٹیاں دیوارِ فلک کے برابر اونچی ہیں۔
اور اس کی جڑیں ظلمات تک جاتی ہیں۔
اس کے پھاٹک کا پہرہ عقرب دیتے ہیں۔
جو نصف انسان اور نصف اژدہے ہیں۔
ان کی چمک دمک دہشت طاری کر دیتی ہے۔
اور ان کی غضب آلود نگاہ انسانوں کے لیے پیغامِ موت لاتی ہے۔
اور ان کا ہالۂ نور پہاڑوں کو،
جو طلوعِ آفتاب کے پاسبان ہیں۔
اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔
گل گامش نے ان کو دیکھا
تو ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں
تب اس نے دل کو مضبوط کیا اور آگے بڑھا۔

بچھوؤں نے رگل گامش کو بے خطر بڑھتے دیکھا
نر نے مادہ کو آواز دی:
''یہ جو ہماری طرف آ رہا ہے دیوتاؤں کی اولاد ہے۔''
مادہ نے جواب دیا۔
''وہ دو تہائی دیوتا ہے اور ایک تہائی انسان۔''
تب نر نے رگل گامش کو پکارا:
''تم نے اتنا بڑا سفر کیوں کیا ہے؟
خطرناک سمندروں کو عبور کر کے اتنی دور کس غرض سے آئے ہو۔
مجھے اپنے آنے کا سبب بتاؤ۔''
رگل گامش نے جواب دیا:
''اِن کِدُ کے لیے،
میں اسے بہت چاہتا تھا۔
ہم نے ایک ساتھ طرح طرح کی سختیاں جھیلی تھیں۔
اسی کے باعث میں یہاں آیا ہوں
کیونکہ انسان کی مشترکہ تقدیر اسے بھی لے گئی ہے۔
میں اس کے لیے رات دن رویا ہوں۔
میں اس کی لاش کو دفن کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔
مجھے گمان تھا کہ
میرا دوست میری گریہ وزاری سے واپس آ جائے گا۔
جب سے وہ گیا ہے میری زندگی میں کچھ لطف باقی نہیں رہا۔
پس میں اپنے باپ اُتناپشتیم کی تلاش میں یہاں تک آیا ہوں۔
لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کے حلقے میں شامل ہو گیا ہے۔
اور اسے حیاتِ ابدی مل گئی ہے۔

میں اس سے حیات و ممات کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

نر نے اپنا منہ کھولا اور گل گامش سے کہا:

"عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کسی انسان نے
آج تک وہ نہیں کیا جو تو چاہتا ہے۔
فانی انسان اس پہاڑ کو عبور نہیں کر سکتا۔
اس کا اندھیارا اٹھارہ کوس لمبا ہے
اس تاریکی میں اجالے کا گزر نہیں۔
اس تاریکی سے دل بیٹھنے لگتا ہے۔
طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہاں کبھی روشنی نہیں ہوتی۔"

گل گامش نے کہا:

"مجھے خواہ رنج پہنچے یا تکلیف،
میں خواہ کراہتا ہوا جاؤں خواہ روتا ہوا،
پھر بھی مجھے وہاں پہنچنا ضرور ہے۔
لہٰذا پہاڑ کا پھاٹک کھول دے۔"

اور بچھو نے کہا:

"گل گامش، جا،
میں تجھے کوہِ مشو سے گزرنے کی اجازت دیتا ہوں۔
اور اس کی بلند چوٹیوں سے بھی،
تیرے پاؤں تجھے صحیح سلامت گھر واپس لے جائیں۔
پہاڑ کا پھاٹک کھلا ہوا ہے۔"

گل گامش نے یہ سنا
تو وہی کیا جو بچھو نے کہا تھا۔
وہ طلوع آفتاب کی راہ پر چل پڑا،

وہ ابھی ڈیڑھ کوس گیا تھا۔
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی تین کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔
اور نہ وہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی ساڑھے چار کوس گیا تھا۔
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی چھ کوس گیا تھا۔
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی ساڑھے سات کوس گیا تھا۔
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
وہ ابھی نو کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی

اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی
وہ ابھی ساڑھے بارہ کوس گیا تھا
کہ تاریکی کی دبیز چادر نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔
کیونکہ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
بارہ کوس چلنے کے بعد وہ بڑے زور سے چیخا۔
کیونکہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی۔
ساڑھے تیرہ کوس چلنے کے بعد اس نے اپنے چہرے پر شمالی ہوا محسوس کی۔
لیکن اندھیرا بہت گہرا تھا۔
اور کوئی روشنی نہ تھی۔
اور وہ نہ آگے کی چیز دیکھ سکتا تھا نہ پیچھے کی لیکن
پندرہ کوس کے بعد منزل قریب آ گئی
ساڑھے سولہ کوس کے بعد نورِ سحر نمودار ہوا۔
اور اٹھارہ کوس کے بعد سورج چمکنے لگا۔

وہاں دیوتاؤں کا باغ تھا۔
اور ہر چہار جانب جھاڑیوں میں جواہرات لگے تھے۔
اور درخت عقیق کے پھلوں سے لدے تھے۔
اور انگور کی بیلیں آنکھوں کو فرحت بخشتی تھیں۔
اور ان کے پتے لاجورد کے تھے۔
اور خوشے نہایت شیریں تھے۔
اور کانٹوں اور گوکھروؤں کی جگہ یاقوت، زمرد اور موتی اُگ رہے تھے۔
گل گامش سمندر کے کنارے باغ میں ٹہل رہا تھا

کہ شمس دیوتا کی نگاہ اس پر پڑی۔
اور اس نے دیکھا کہ گِل گامش جانوروں کی کھال اوڑھے ہوئے ہے
اور ان کا گوشت کھا رہا ہے۔

شمس آزردہ ہوا اور اس نے کہا:
''اس سے پیش تر کوئی فانی انسان اس راہ سے نہیں گزرا۔
اور نہ آئندہ جب تک ہوائیں سمندر میں چلتی رہیں گی۔
کوئی ادھر سے گزر سکے گا۔''
اور وہ گِل گامش سے مخاطب ہوا
''تجھے جس زندگی کی تلاش ہے وہ کبھی نصیب نہ ہوگی۔''

گِل گامش نے شمسِ تاباں سے کہا:
''بیابانوں میں دور دور تک بھٹکتے پھرنے
اور طرح طرح کی سختیاں جھیلنے کے بعد
کیا میں اپنا سر ہمیشہ کے لیے مٹی سے ڈھانپ لوں
اور سو جاؤں؟
میری آنکھوں کو سورج کا نظارہ کرنے دے
یہاں تک کہ وہ چندھیا جائیں۔
میری حالت مُردے سے بہتر نہیں ہے۔
پھر بھی مجھے سورج کی روشنی دیکھنے دے۔
جب روشنی کافی ہو تو اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔
وہ جو مر گیا ہے کاش سورج کی تابانی کو دیکھ سکتا۔''

وہ جو انگور کی زوجہ بنتِ عنب ہے اور
سمندر کے کنارے رہتی ہے۔
سدُوری ساحل پر باغ میں بیٹھی ہے۔

طلائی پیالہ اور شراب بنانے کی ناند
جو دیوتاؤں کا عطیہ ہیں۔
اس کے پاس دھرے ہیں۔
اس کے چہرے پر نقاب پڑی ہے۔
اس کو گِل گامش آتا دکھائی دے رہا ہے۔
گِل گامش کے جسم پر دیوتاؤں کا گوشت ہے۔
وہ کھال اوڑھے ہوئے ہے۔
اس کا دل افسردہ ہے
اور اس کا حلیہ کہتا ہے کہ اس نے بہت لمبا سفر کیا ہے

سِدُوری نے غور سے دیکھا اور فاصلے کا اندازہ کیا
اور اپنے دل میں کہا، بے شک یہ کوئی شہدا ہے
مگر یہ کہاں جا رہا ہے؟
اور سِدُوری نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔
اور آڑی سلاخیں اور بیلن لگا دیے۔
لیکن گِل گامش نے بیلن کی آواز سنتے ہی
اپنا سر اونچا کیا اور اپنے پاؤں پھاٹک میں پھنسا دیے۔

اس نے سِدُوری کو پکارا:
''شراب بنانے والی نوجوان عورت!
تُو نے اپنا دروازہ کیوں بند کر لیا،
تُو نے کیا دیکھا جو پھاٹک میں سلاخیں لگا دیں۔
میں تیرا دروازہ توڑ دوں گا اور تیرے پھاٹک میں گھس آؤں گا،
کیونکہ میں گِل گامش ہوں۔
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر مار ڈالا۔

میں نے چندن کے بن کے محافظ کو ہلاک کیا ہے،
میں نے حمبابا کو پچھاڑا ہے۔
جو جنگل میں رہتا تھا۔
اور میں نے کوہستانی درّوں میں شیر بھی مارے ہیں۔''

تب سِدُوری نے اس سے کہا:
''اگر تو وہ گِلگامش ہے
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر مار ڈالا
جس نے چندن کے محافظ کو ہلاک کیا۔
جس نے حمبابا کو پچھاڑ دیا جو جنگل میں رہتا تھا
اور کوہستانی درّوں میں شیر مارے۔
تو پھر تیرے گال پچکے ہوئے کیوں ہیں؟
اور تیرا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے؟ اور
تیرا دل اداس کیوں ہے
اور تیرا حلیہ دور سے آنے والے مسافر کا سا کیوں ہے؟
ہاں، تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے جھلسا ہوا کیوں ہے؟
اور تو ہوا کی تلاش میں چراگاہوں میں بھٹکتا ہوا
یہاں کیوں آیا ہے؟''
گِلگامش نے اُسے جواب دیا:
''میرے گال پچکے ہوئے کیوں نہ ہوں
اور میرا چہرہ کیوں نہ اُترے!
میرا دل اُداس کیوں نہ ہو
اور میرا حلیہ دُور سے آنے والے مسافر کی مانند کیوں نہ ہو؟
گرمی اور سردی سے جھلسا ہوا،

اور میں ہوا کی تلاش میں چراگاہوں میں کیوں نہ بھٹکتا پھروں؟
میرے دوست اور چھوٹے بھائی کو
وہ جو بیابان کے جنگلی گدھے اور میدان کے تیندوے کو
شکار کرتا تھا، میرا چھوٹا بھائی جس نے ثورِ فلک کو ہلاک کیا
اور دیوار کے بن میں حمبابا کو پچھاڑا
میرا دوست جو مجھے بہت عزیز تھا
اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا،
اِن کِدُو میرا بھائی جس کو میں بہت چاہتا تھا،
انجام کار موت اُس پر غالب آ گئی۔
میں اس کے لیے سات دن اور سات رات روتا رہا
یہاں تک کہ اُس کی لاش پر کیڑے رینگنے لگے
''اپنے بھائی کے انجام کے سبب مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔
اسی باعث میں ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں
اور مجھے کہیں سکون نہیں ملتا۔
لیکن شراب بنانے والی جوان عورت!
اب کہ میں نے تیرا چہرہ دیکھ لیا ہے
مجھے موت کا چہرہ نہ دیکھنے دے
کیونکہ میں اس سے خوف زدہ ہوں''

سِدُوری نے جواب دیا:
''تجھے جانے کی جلدی کیوں ہے؟
تو جس زندگی کی تلاش میں ہے وہ تجھے کبھی نہ ملے گی۔
دیوتاؤں نے انسان کو پیدا کیا
تو اس کی قسمت میں موت بھی لکھ دی۔

اور حیاتِ ابدی کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔
پس اے، گل گامش! اپنے شکم کو اچھی چیزوں سے بھر
دن اور رات، رات اور دن رقص کر اور خوشی منا،
دعوتیں کھا اور عیش کر،
نئے نئے اور زرق برق لباس پہن،
اپنے سر کے بال دھو اور پانی میں غسل کر،
تجھے کو جو تیری انگلی پکڑ کر چلتا ہے پیار کر،
اور اپنی بیوی کو ہم آغوشی سے لذت یاب کر۔
کیونکہ یہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے۔
لیکن، گل گامش نے نوجوان عورت سِدُوری کو جواب دیا:
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں۔
"میں آرام کیسے کر سکتا ہوں۔
جبکہ اِن کِدُو میرا پیارا خاک میں مل چکا ہے
اور مجھے بھی مرنا اور ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو جانا ہے۔"
اور تب اس نے کہا: "نوجوان عورت!
اب مجھے اُتناپشتیم تک پہنچنے کا راستہ بتا دے۔
اور راہ کے لیے ضروری ہدایتیں بھی دے۔
اگر ممکن ہوا تو میں بحرِ عظیم کو بھی عبور کروں گا۔
اور اگر نہ کر سکا تو پھر میں بیابان میں اور دور تک چلا جاؤں گا۔"
شراب بنانے والی نے اس سے کہا:
"بحرِ عظیم کو کوئی عبور نہیں کر سکتا۔
عہدِ قدیم سے آج تک کوئی شخص بھی سمندر کو پار نہیں کر سکا ہے۔
فقط شمسِ تاباں بحرِ عظیم کو عبور کرتا ہے۔

اس کے سوا اور کون یہ جرأت کرسکتا ہے؟
وہ مقام اور اس کی راہ دونوں بے حد دشوار ہیں۔
ان کے درمیان موت کا گہرا پانی بہتا ہے۔
گِل گامش! تو بحرِ عظیم کو کیسے پار کرے گا؟
آبِ فنا کے ساحل پر پہنچنے کے بعد تو کیا کرے گا؟
البتہ جنگل میں تجھے آتناپشتیم کا ملاح اُرشابنی ملے گا۔
اس کے پاس اشیائے مقدس ہیں۔ اشیائے سنگ۔
اس کی کشتی کا پیش مار نما ہے۔
اُرشابنی کو غور سے دیکھنا۔
شاید وہ تجھے سمندر پار کروادے۔
اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو تجھے لوٹ جانا چاہیے۔"
گِل گامش یہ سن کر بہت برہم ہوا۔
اس نے اپنا تیشہ اٹھایا اور تلوار کو بے نیام کیا۔
اور تیر کی مانند سمندر کے ساحل کی طرف لپکا۔
غصے میں اس نے پتھروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔
اور جنگل میں گھس کر ارشابنی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
اور ملاح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
اُرشابنی سے اس نے کہا:
"بتا تیرا نام کیا ہے؟"
"میرا نام اُرشابنی ہے اور میں آتناپشتیم کا ملاح ہوں۔"
گِل گامش نے جواب دیا:
"میرا نام گِل گامش ہے۔
اور میں اریک کا رہنے والا ہوں، بیتِ آنو کا۔"

تب ارشابنی نے اس سے کہا:

''تیرے گال بیٹھے ہوئے کیوں ہیں؟

اور تیرا منہ کیوں اُترا ہوا ہے؟

تیرا دل مایوس کیوں ہے؟

لمبے سفر سے آنے والے مسافر کی مانند کیوں ہے؟

ہاں، تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے جھلسا ہوا کیوں ہے؟

اور تو ہوا کی تلاش میں گیاہستانوں سے گزرتا ہوا

یہاں کیوں آیا ہے؟''

گِل گامش نے جواب دیا:

''میرے گال بیٹھے ہوئے کیوں نہ ہوں؟

اور میرا چہرہ اُترا ہوا کیوں نہ ہو؟

میرا دل مایوس کیوں نہ ہو؟

اور میرا حلیہ لمبے سفر سے آنے والے درماندہ مسافر کی مانند کیوں نہ ہو؟

سردی اور گرمی نے مجھے جھلس دیا ہے

میں گیاہستانوں میں مارا مارا کیوں نہ پھرتا

جب کہ میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی پر،

جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر ہلاک کیا

اور چندن کے بن میں حمبابا کو پچھاڑا،

میرے دوست پر جو مجھے بہت عزیز تھا،

اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا۔

میرے بھائی اِن کِدُ پر جسے میں بہت چاہتا تھا۔

موت نے قبضہ کر لیا ہے۔

میں اس کے لیے سات دن اور سات رات روتا رہا۔

یہاں تک کہ اس کے جسم پر کیڑے رینگنے لگے۔
اپنے بھائی کے باعث مجھے موت سے ڈر لگنے لگتا ہے۔
اپنے بھائی کے سبب سے میں بیابان میں مارا مارا پھرتا ہوں۔
اس کے انجام سے میرا دل بوجھل ہے۔
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں، میں آرام کیسے کر سکتا ہوں۔
وہ مٹی میں مل گیا ہے،
اور مجھے بھی موت آئے گی اور ہمیشہ کے لیے مٹی میں ملا دے گی۔
میں موت سے ڈرتا ہوں،
پس مجھے اُتناپشتیم تک پہنچنے کا راستہ بتا۔
اگر ممکن ہوا تو میں آبِ فنا عبور کروں گا
ورنہ بیابان میں اور دور تک چلا جاؤں گا۔''

اُرشابی نے کہا:
''گِل گامش! تیرے اپنے ہاتھوں نے تجھے سمندر عبور کرنے سے محروم کر دیا ہے۔ تو نے پتھر کی چیزوں کو توڑ ڈالا۔
تو کشتی کا بچاؤ بھی جاتا رہا۔''

گِل گامش نے کہا:
''اُرشابی! تو مجھ سے اتنا خفا کیوں ہے؟
حالانکہ تو سمندر کو دن رات اور ہر موسم میں عبور کرتا ہے۔''

اُرشابی نے کہا۔
''وہی پتھر تو تھے جن کی بدولت
میں سمندر کو سلامتی سے عبور کر لیا کرتا تھا۔
اچھا اب تو جنگل میں جا،
اور اپنے تیشے سے ایک سو بیس شہتیر کاٹ،

ہر شہتیر پینتالیس گز لمبا ہو۔
ان شہتیروں کو رال سے رنگ اور اُن پر سام چڑھا۔
اور میرے پاس لا۔"
گِل گامش نے یہ سنا تو جنگل میں گیا۔
اس نے ۱۲۰ شہتیر کاٹے، پینتالیس پینتالیس گز لمبے۔
انھیں رال سے رنگا اور ان پر سام چڑھائی۔
اور ارشابی کے پاس لایا۔
تب وہ کشتی میں سوار ہوئے۔
اور ناؤ سمندر کی لہروں پر تیرنے لگی۔
وہ تین روز تک یوں چلتے رہے۔
گویا وہ ایک ماہ پندرہ دن کا سفر تھا
آخر کار اُرشابی کشتی کو آبِ فنا تک لایا۔
تب اُرشابی نے گِل گامش سے کہا:
"کشتی چلائے جا، شہتیر پانی میں بھیگنے نہ پائیں۔
گِل گامش! دوسرا شہتیر لے، تیسرا شہتیر لے، چوتھا شہتیر لے
اب پانچواں، چھٹا، ساتواں شہتیر لے،
اب گیارھواں اور بارھواں شہتیر لے۔"
اس طرح گِل گامش نے ۱۲۰ شہتیر پانی میں ڈالے۔
تب گِل گامش نے کپڑے اتار ڈالے۔
اور اپنے بازوؤں کو مستول کی مانند اونچا کیا
اور اپنے کپڑوں سے بادبان بنایا۔
پس ملاح اُرشابی گِل گامش کو اُتناپشتیم کے پاس لایا۔
جسے سب ساکن ماورا کہتے ہیں۔

اور جو دِلموںؔ میں رہتا ہے
جو کوہِ مشرق میں آفتاب کی رہگزر ہے۔
دیوتاؤں نے انسانوں میں
بس اسی کو حیاتِ جاودانی عطا کی ہے۔
اُتناپشتیم آرام سے لیٹا تھا۔
ناگاہ اس نے نظر اٹھا کر دور تک دیکھا۔
اور اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگا:
''ناؤ بلا رسّے چرخی اور مستول کے کیوں آ رہی ہے؟
مقدس پتھر کیوں ٹوٹے ہوئے ہیں؟
اور کشتی کو ملاح کیوں نہیں چلا رہا ہے؟
وہ جو آ رہا ہے میرا آدمی نہیں ہے۔
مجھے تو ایک ایسا آدمی نظر آ رہا ہے
جس کا جسم جانوروں کی کھال سے ڈھکا ہوا ہے۔
یہ کون ہے جو اُرشا کے پیچھے پیچھے
ساحل پر آ رہا ہے؟
بلاشبہ وہ میرا آدمی نہیں ہے''
پس اُتناپشتیم نے اس کی طرف دیکھا اور کہا:
''تیرا نام کیا ہے؟
تو جو جانوروں کی کھال اوڑھے ہوئے ہے
جس کے گال بیٹھے ہوئے ہیں۔
اور منھ لٹکا ہوا ہے
تو نے سمندر کی دشوار گزار راہ کو عبور کر کے
یہ عظیم سفر کیوں اختیار کیا ہے۔

مجھے اپنے آنے کا باعث بتا۔"

اس نے جواب دیا:
"گِل گامش میرا نام ہے۔
میں ار یک بیتِ اُنُو، کا رہنے والا ہوں۔"

تب اُتناپشتیم نے اس سے سوال کیا:
"اگر تو گِل گامش ہے
تو تیرے گال بیٹھے ہوئے کیوں ہیں؟
اور تیرا منھ کیوں لٹکا ہے؟
تیرا دل افسردہ کیوں ہے؟
اور تیرا چہرہ طویل سفر سے آنے والے کی مانند کیوں ہے؟
ہاں تیرا چہرہ گرمی اور سردی سے کیوں جھلس گیا ہے؟
اور تو ہوا کی تلاش میں بیابانوں کی خاک چھانتا یہاں کیوں آیا ہے؟"

گِل گامش نے جواب دیا:
"میرے گال پچکے ہوئے کیوں نہ ہوں؟
اور میرا منھ کیوں نہ اترا ہو؟
میرا دل افسردہ ہے
اور میرا چہرہ طویل سفر سے آنے والے کی مانند ہے۔
وہ گرمی اور سردی سے جھلس گیا ہے
میں گیاہستانوں کی خاک کیوں نہ چھانوں؟
جبکہ میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی پر
جس نے ثورِ فلک کو پکڑ کر ہلاک کر دیا۔
اور چندن کے بن میں حمبابا کو پچھاڑا۔
میرے دوست پر جو مجھے بہت عزیز تھا۔

اور جس نے میرے ہمراہ کتنے ہی خطروں کا مقابلہ کیا،
اِن کِدُ، میرے بھائی پر جس کو میں چاہتا تھا
موت قابض ہوگئی ہے
میں اس کے لیے سات دن سات رات رویا کیا۔
یہاں تک کہ اس کے جسم پر کیڑے رینگنے لگے۔
اپنے بھائی کے سبب مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔
اپنے بھائی کے سبب میں بیابان کی خاک چھانتا ہوں
اس کے انجام سے میرا دل بوجھل ہے۔
میں خاموش کیسے رہ سکتا ہوں، میں آرام کیسے کر سکتا ہوں۔
وہ مٹی میں مل چکا ہے۔
اور مجھے بھی موت آئے گی اور ہمیشہ کے لیے مٹی میں ملا دے گی۔''

بِگل گامش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:
''میں نے یہ سفر اُتنا پشتیم سے ملنے کی خاطر اختیار کیا ہے،
اسی مقصد سے میں نے روئے زمین کی خاک چھانی ہے۔
اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھا ہوں،
سمندروں کو عبور کیا ہے
اور چل چل کر اپنے آپ کو تھکا مارا ہے۔
میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے
اور نیند جو بہت میٹھی ہوتی ہے۔
اس سے میری شناسائی ختم ہو چکی ہے۔
ابھی میں سِدُوری کے گھر بھی نہ پہنچا تھا
کہ میرے کپڑے تار تار ہو گئے۔
میں نے ریچھ، لکڑ بگھے، شیر، تیندوے، ہرن، چیتے، بارہ سنگھے،

غرض ہر قسم کے جنگلی جانوروں کا شکار کیا۔
اور گیاہستان کی رینگتی چیزوں کو مار کر کھایا۔
اور ان کی کھال اوڑھ لی۔
میں اسی حلیے میں شراب بنانے والی نوجوان عورت کے پھاٹک تک پہنچا
مگر اس نے اپنا رال کا یہ پھاٹک مجھ پر بند کر دیا۔
لیکن راستے کی تفصیلات مجھے اسی سے ملیں۔
پس میں ملاح اُرشابنی کے پاس گیا۔
اور اس کے ہمراہ آبِ فنا کو عبور کیا۔
بزرگ اُتناپشتیم! تو جو دیوتاؤں کے حلقے میں شامل ہو گیا ہے
میں تجھ سے حیات و موت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔
بتا میں وہ زندگی کیسے پاؤں
جس کی مجھے تلاش ہے۔"

پشتیم نے کہا:
"دنیا میں کسی کو ثبات نہیں ہے
کیا ہم گھر اس لیے بناتے ہیں کہ وہ ابد تک قائم رہے؟
کیا ہم معاہدے پر مہر اس لیے لگاتے ہیں
کہ وہ دوامی ہو جائے۔
کیا بھائی اپنی موروثی جائیداد کو آپس میں اس لیے بانٹتے ہیں
کہ وہ سدا محفوظ رہے۔
کیا دریا میں سیلاب کا موسم ہمیشہ رہتا ہے؟
تتلی اپنے خول سے نکلتی ہے
تاکہ سورج کے چہرے کو بس ایک نظر دیکھ لے۔
ازل سے آج تک کسی چیز کو ثبات نصیب نہیں ہوا ہے

سوئے اور موئے آدمی میں کتنی مشابہت ہے!
درباری ہوں یا بازاری، دونوں کی تقدیر میں فنا ہے
مرتے وقت دونوں کی کیفیت یکساں ہوتی ہے۔
جب حاکمِ قضا، انوناکی اور مالکِ قدر، مامےتون ملتے ہیں۔
تو وہ آپس میں مشورہ کر کے انسان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔
وہ حیات و موت کا دن مقرر کرتے ہیں۔
لیکن موت کا دن کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔"

تب، گل گامش نے اُتناپشتیم، ساکنِ ماوراسے کہا:
"اُتناپشتیم! میں تجھے دیکھتا ہوں
تو مجھے تیری ظاہرا شکل وصورت اپنے سے مختلف نظر نہیں آتی۔
تیرے جسم میں کوئی عجیب یا انوکھی بات نہیں ہے۔
میں نے سوچا تھا کہ تو بھی کوئی سورما ہوگا، درپے جنگ
مگر تُو تو اپنے پیٹ کے بل زمین پر آرام سے لیٹا ہے۔
سچ بتا تو دیوتاؤں کے حلقے میں کیسے پہنچا؟
اور تجھے حیاتِ ابدی کیسے ملی؟"

اُتناپشتیم نے، گل گامش سے کہا:
"میں سِرِ نہاں کو تجھ پر عیاں کروں گا،
اور دیوتاؤں کا ایک راز تجھے بتادوں گا۔"

آٹھواں باب

سیلابِ عظیم

اُتناپشیتم نے کہا ''تم شرُوپاک سے تو واقف ہوگے۔
یہ شہر دریائے فرات کے کنارے واقع ہے
پھر یوں ہوا کہ وہ شہر پرانا ہوگیا اور اس کے دیوتا بھی بوڑھے ہوگئے۔
وہاں اَنوتھا' مالکِ کائنات اور اس شہر کا آقا۔
اور جنگ کا دیوتا اِن لیل شہر والوں کا مشیر تھا۔
ننورتا اُن کا معاون تھا
اور اِن نو کی ان کی نہروں کا نگہبان،
اور ان کے ہمراہ اِیا بھی تھا۔
پرانے زمانے میں روئے زمین پر ہر چیز کی بہتات تھی۔
آبادی بڑھتی جاتی تھی۔
اور زمین جنگلی سانڈ کی مانند ڈکارتی تھی۔
عظیم دیوتا اس شور وغل سے چونک پڑا۔
اِن لیل نے یہ ہنگامہ سنا
تو دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ سے کہا:
'بنی نوعِ انسان کا شور وغل برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔
اور ان کی بکواس کے باعث اب سونا محال ہے۔'
پس دیوتاؤں کے دل میں سیلاب کا خیال آیا۔
لیکن میرے آقا اِیا نے مجھے خواب میں خبردار کردیا۔
اس نے دیوتاؤں کی باتیں چپکے سے میرے جھاؤ کے گھر کو بتادیں۔''

'جھاؤ کے گھر، جھاؤ کے گھر!
دیوار، او دیوار!
جھاؤ کے گھر! میری سن،
دیوار غور سے سن۔
اور شرّوپاک کے انسان، یوُر بار توتو کی اولاد!
اس گھر کو ڈھا دے اور ایک کشتی بنا،
اپنے اثاثے اور املاک سے کنارہ کش ہو جا،
اور اپنی جان کی فکر کر،
دنیاوی چیزوں کو حقیر سمجھ
اور اپنی روح کو موت سے بچا۔
اپنا مکان مسمار کر دے
اور میں کہتا ہوں کہ ایک کشتی بنا
تیرے جہاز کا ناپ یہ ہو:
اس کی شہتیر اس کے طول کے برابر ہو۔
اس کے عرشے کی چھت محرابی ہو
اُس قوس کی مانند جو عالمِ سفلی کو ڈھانپے ہوئے ہے
تب تمام جان دار مخلوق کے تخم کشتی میں رکھ لے۔'

میں اس کی بات سمجھ گیا اور میں نے اپنے آقا سے کہا:
'دیکھ میرے خداوند! میں تیرا حکم بجا لاؤں گا۔
لیکن میں لوگوں کو، شہر کو، بڑوں کو کیا جواب دوں گا؟'
تب اِیاؔ نے اپنا منھ کھولا اور مجھ غلام سے مخاطب ہوا:
ان سے کہہ دے کہ مجھے معلوم ہے
کہ اِنؔ لیل مجھ سے بہت خفا ہے

پس میری مجال نہیں کہ اس کے ملک میں چلوں پھروں۔
یا اس کے شہر میں رہوں
میں اپنے آقا اِیا کے پاس رہنے کی خاطر
خلیج کے خطے کی راہ لوں گا۔
البتہ وہ تم پر فراوانی کی بارش کرے گا۔
اور نایاب مچھلیاں اور منتخب پرندے بھیجے گا۔
اور لہریں اٹھیں گی، جو فصلوں کے لیے مفید ہوں گی۔
اور شام کے وقت طوفان کا راکب تم پر گندم برسائے گا۔'
طلوع سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ میرے گھر کے لوگ میرے گرد جمع ہوئے۔
بچے رال لے آئے اور مرد ضرورت کی دوسری چیزیں
پانچویں دن میں نے جہاز کا پیندا بنایا اور خم دار لکڑیاں جوڑیں۔
اور تب میں نے تختہ بچھایا۔
جہاز کی نچلی منزل کا رقبہ ایک ایکڑ تھا۔
اور بالائی عرشہ ہر چہار جانب 60 گز تھا۔
اس کے نیچے میں نے 6 طبقے بنائے، کُل سات۔
اور ان کو میں نے 9 طبقوں میں تقسیم کر دیا۔
اور حسبِ ضرورت پچڑ بھی ڈالے۔
میں نے چپوؤں اور لمبے شہتیروں کا بندوبست بھی کر لیا۔
اور ضرورت کی سب چیزیں فراہم کر لیں۔
بار بردار پیپوں میں تیل لے آئے۔
میں نے تارکول، ڈامر اور تیل کو بھٹی میں ڈالا
جہاز کی درزیں بند کرنے میں بہت سا تیل خرچ ہوا۔
اور تیل کی کافی مقدار جہاز کے داروغہ نے گودام میں رکھ لی۔

میں لوگوں کے لیے ہر روز بیل اور بھیڑیں ذبح کرتا۔
میں جہاز کے کاری گروں کو شراب اس فراخ دلی سے پلاتا
گویا وہ دریا کا پانی تھا اور تازہ شراب، سرخ انگوری شراب
اور سفید انگوری شراب نہ تھی۔
ناؤنوش کا جشن ہوتا۔
جیسے نئے سال کے تیوہار پر منایا جاتا ہے
خود میں نے اپنے سر میں تیل گرایا۔
ساتویں دن کشتی تیار ہو گئی
مگر اتنے بڑے جہاز کو دریا میں لانا آسان کام نہ تھا
توازن کو قائم رکھنے کے لیے بھرت کو اوپر نیچے منتقل کیا گیا۔
یہاں تک کہ جہاز کا دو تہائی حصہ سطح آب سے نیچے آ گیا
میں نے سونا چاندی، زندہ مخلوق، گھر کے لوگ، عزیز رشتے دار
مویشی، جنگلی اور پالتو جانور اور سب کاری گروں کو
جہاز میں بھر لیا۔
کیوں کہ شمس نے جو وقت مقرر کیا تھا۔
وہ گزر چکا تھا
شمس نے کہا تھا:
'شام کے وقت جب طوفان کا راکب زمین پر
تباہ کرنے والی بارش بھیجنے لگے
تو جہاز میں بیٹھ جانا اور جہاز کے دروازے، کھڑکیاں بند کر دینا'
وقت ہو چکا تھا۔
تب شام ہوئی اور طوفان کے راکب نے بارش شروع کی۔
میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو موسم نہایت خطرناک تھا۔

پس میں بھی جہاز میں سوار ہو گیا اور دروازے کو بند کر دیا۔
اب سارا انتظام مکمل تھا۔ دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔
اور درزیں بھری جا چکی تھیں۔
پس میں نے چپوار اور دیگر آلات جہاز راں پوزور اموری کے حوالے کیے۔
اور جہاز کی تقدیر بھی اس کے سپرد کر دی۔
طلوع سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ افق پر پارۂ ابر نمودار ہوا۔
طوفان کا آقا اداد اس کے اندر گرجنے لگا۔
شلاّت اور جیش طوفان کے نقیب آگے آگے کوہ و بیابان میں
منادی کرتے جاتے تھے۔
پاتال کے دیوتا بھی جاگ اٹھے تھے
نرگل نے سفلی دریاؤں کے بند کھول دیے تھے
جنگ کے دیوتا ننورتا نے پشتوں کو توڑ دیا تھا
اور ساتوں قاضیوں — انوناکی — نے اپنی مشعلیں اونچی کر دی تھیں۔
جن کے شعلوں کی روشنی سے ساری دنیا میں اجالا ہو گیا تھا۔
اور جب اداد نے روشنی کو تاریکی میں بدل دیا
اور زمین کو پیالے کی مانند پاش پاش کر دیا
تو زمین سے آسمان تک مایوسی اور گھبراہٹ پھیل گئی
طوفان سارا دن شور مچاتا رہا
اور اس کی برہمی ہر لمحے بڑھتی رہی۔
طوفان کے تھپیڑے فوجی حملوں کی مانند لگتے رہے
بھائی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکتا تھا۔
اور زمین کے رہنے والے آسمان سے بھی نہ نظر آتے تھے
یہاں تک کہ سیلاب نے دیوتاؤں کو بھی دہشت زدہ کر دیا۔

اور انھوں نے فلک الافلاک پر اَنُو کے پاس پناہ لی۔
اور دیواروں کی آڑ میں ڈرپوک کتے کی مانند دبک کر کھڑے ہو گئے
تب شیریں آواز ملکۂ فلک، عِشتار چیخنے لگی۔
جیسے حاملہ عورت دردِ زہ میں چیختی ہے۔
حیف ہے کہ پرانے دن خاک میں مل گئے۔
کیونکہ میرا مطالبہ شرانگیز تھا۔
میں نے تباہی کے لیے جنگ کا مطالبہ کیا تھا
مگر کیا یہ میری اولاد نہیں ہیں؟
کیا میں نے ان کو پیدا نہیں کیا؟
اور اب وہ مچھلی کے انڈوں کی مانند سمندر میں تیر رہے ہیں۔
جنت اور جہنم کے عظیم دیوتا بھی اپنے منہ پر ہاتھ رکھے رو رہے ہیں۔
چھ دن اور چھ رات آندھی چلتی رہی۔
بارش، طوفان اور سیلاب نے دنیا پر غلبہ پالیا تھا۔
اور طوفان اور سیلاب کا خروش متصادم فوجوں کی مانند تھا۔
مگر ساتواں دن طلوع ہوا تو جنوبی طوفان تھم گیا۔
سمندر پرسکون ہو گیا۔
اور سیلاب رُک گیا۔
میں نے رُوئے زمین پر نگاہ دوڑائی۔
تو وہاں کامل سکوت تھا اور انسان مٹی کا ڈھیر بن گئے تھے۔
سمندر کی سطح مکان کی چھت کی طرح ہموار تھی،
میں نے کھڑکی کا پٹ کھولا تو روشنی میرے منہ پر پڑی
تب میں جھک گیا، پھر بیٹھ کر رونے لگا۔
آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

کیونکہ ہر چہار سمت پانی ہی پانی تھا۔
میں عبث خشکی کو ڈھونڈ رہا تھا۔
لیکن اکیس کوس کے فاصلے پر مجھے ایک پہاڑ نظر آیا۔
اور میری کشتی وہاں جا لگی۔
میری کشتی کوہِ نصیر پر رک گئی۔
اور پھر ہلائے نہ ہلی۔
کشتی ایک دن کوہِ نصیر پر جمی رہی۔
کشتی دوسرے دن بھی کوہِ نصیر پر جمی رہی۔
پانچویں اور چھٹے دن بھی وہیں جمی رہی۔
ساتواں دن طلوع ہوا تو میں نے ایک فاختہ کو آزاد کیا۔
وہ اُڑ گئی مگر اسے بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی۔
اور وہ واپس آ گئی۔
تب میں نے ایک ابابیل کو آزاد کیا۔
وہ اڑی مگر بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ پا کر واپس آ گئی۔
تب میں نے ایک کوّے کو آزاد کیا
اس نے دیکھا کہ پانی پیچھے ہٹ گیا ہے
پس اس نے اپنا پیٹ بھرا، اِدھر اُدھر تاڑا
اور کائیں کائیں کرتا رہا۔
مگر واپس نہ آیا—
تب میں نے جہاز کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔
میں نے قربانی کی اور پہاڑ کی چوٹی پر شراب لنڈھائی۔
میں نے سات اور سات دیگچے چولھے پر رکھے۔
اور لکڑی، بید، دیوار اور حنا کا انبار لگایا۔

ان کی خوشبو دیوتاؤں تک پہنچی۔
تو وہ مکھیوں کی طرح چڑھاوے کے گرد جمع ہو گئے۔

آخر عِشتار بھی وہاں آئی۔
اور اس نے اپنے گلے کے ہار کو اونچا کیا،
آسمانی نگینوں کا یہ وہی ہار تھا۔
جس کو کسی زمانے میں اُنُو نے عِشتار کو خوش کرنے کی خاطر تیار کیا تھا۔
'دیوتاؤ، جو یہاں موجود ہو!
اس لاجورد کی قسم جو میرے گلے میں پڑا ہے،
میں ان ایام کو اسی طرح یاد رکھوں گی
جس طرح میں ان جواہرات کو یاد رکھتی ہوں
جو میرے گلے میں پڑے ہیں
گزشتہ دنوں کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گی
اِن لِیل کے سوا سب دیوتا قربانی کے گرد جمع ہوں
اسے چڑھاوے کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے
کیونکہ وہ بلا سوچے سمجھے یہ سیلاب لایا
اس نے میرے آدمیوں کو مفت میں بھینٹ چڑھا دیا۔'

جب اِن لِیل آیا
تو جہاز کو دیکھ کر وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔
اور آسمانی دیوتاؤں پر بہت خفا ہوا:
'کیا ان فانیوں میں سے کوئی زندہ بھی بچ رہا ہے؟
اس بربادی سے تو کسی ایک فرد کو بھی زندہ نہیں بچنا تھا۔'
تب کنوؤں اور نہروں کے دیوتا نورتا نے اپنا منھ کھولا
اور اِن لِیل سے کہا:

'دیوتاؤں میں کون ہے
فقط ایا دانائے کُل ہے۔

تب ایا نے اپنا منہ کھولا اور سورما اِن لیل سے کہا:
'عاقل ترین دیوتا! سورما اِن لیل!
تو نے بے خیالی میں سیلاب لا کر غضب کیا۔
گنہگار کا گناہ اس کے منہ پر مار
جرم کرنے والوں کو جرم سے آگاہ کر
اور جب وہ حد سے تجاوز کرنے لگے تو اسے تھوڑی سزا بھی دے۔
مگر اسے اتنا نہ ستا کہ وہ ہلاک ہو جائے۔
کاش سیلاب کے بجائے شیر نے انسانوں پر حملہ کیا ہوتا
کاش سیلاب کے بجائے کسی بھیڑیے نے انسان پر حملہ کیا ہوتا۔
کاش سیلاب کے بجائے قحط نے دنیا کو ویران کیا ہوتا
کاش سیلاب کے بجائے کسی وبا نے انسانوں کو ہلاک کیا ہوتا۔

وہ میں نہیں تھا۔
جس نے دیوتاؤں کا راز فاش کیا۔
عاقل انسان تو اس راز سے خواب میں آگاہ ہوا تھا۔
اب آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرو
کہ اس انسان کا کیا کیا جائے۔'

تب اِن لیل جہاز پر آیا
اس نے مجھے اور میری بیوی کو ہاتھ سے پکڑا
اور جہاز کے اندر لے گیا۔
خود درمیان میں کھڑا ہوا اور ہمیں اپنے دائیں بائیں
رکوع میں جانے کا حکم دیا۔

اس نے ہماری پیشانی چھوئی
اور ہمیں برکت دی:
'ماضی میں اُتنا پشتیم ایک فانی انسان تھا۔
آئندہ وہ اور اس کی بیوی یہاں سے دو دریاؤں کے دہانے پر
رہیں گے۔'
پس دیوتاؤں نے مجھے اپنی پناہ میں لیا۔
اور دور دراز مقام پر، دریاؤں کے دہانے پر رہنے کا حکم دیا۔"

نواں باب

مراجعت

اُتنا پشتیم نے کہا:
"مگر گل گامش! تیری خاطر کون دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ بلائے گا۔
تاکہ تجھے وہ زندگی نصیب ہو جس کی تجھے تلاش ہے۔
تو چاہے تو آزما دیکھ
بس تجھے چھ دن اور سات راتیں نیند پر قابو پانا ہوگا۔"
گل گامش کولھے کے بل آرام کر رہا تھا
کہ نیند کی دُھند
دُھنکے ہوئے نرم اُون کی مانند اس کے اوپر لہرانے لگی۔
اور اُتنا پشتیم نے اپنی بیوی سے کہا:

"ذرا اس کو دیکھ!
یہ مردِ قوی حیاتِ ابدی کا طلب گار تھا۔
لیکن نیند کی دھند اس پر ابھی سے لہرا رہی ہے۔"

اس کی بیوی نے جواب دیا:
"اس آدمی کو چھو کر جگا دو
تا کہ وہ اپنے ملک کو سلامتی سے واپس چلا جائے۔
اسی پھاٹک کی راہ جس سے وہ آیا تھا۔"

اُتناپشتیم نے اپنی بیوی سے کہا:
"سب انسان دھوکے باز ہوتے ہیں۔
یہاں تک کہ تو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرے گی۔
پس ہر روز ایک روٹی پکا کر اس کے سرہانے رکھتی جا
اور اس کے ایامِ خواب کا شمار کرنے کی خاطر
ہر روز دیوار پر ایک نشان بھی بناتی جا—"

پس اس نے روٹیاں پکائیں
اور ہر روز ایک روٹی گل گامش کے سرہانے رکھتی گئی
اور ایامِ خواب کی گنتی کے لیے ہر روز دیوار پر ایک نشان لگاتی گئی
اور اتنے دن گزر گئے کہ پہلی روٹی پتھر کی طرح سخت ہو گئی
اور دوسری روٹی چمڑے کی مانند
تیسری روٹی سیل گئی۔
چوتھی کے پرت پر پھپھوندی لگ گئی
پانچویں پر سبزی جھلکنے لگی۔
مگر چھٹی روٹی تازی تھی۔
اور ساتویں چولھے پر تھی۔

تب اُتناپشیتم نے اسے چھو کر جگایا اور وہ جاگ اٹھا

گِل گامش نے اُتناپشیتم ساکنِ ماورئی سے کہا:
''ابھی میری آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ
تو نے مجھے چھو کر جگا دیا۔''

لیکن اُتناپشیتم نے جواب دیا:
''ان روٹیوں کو شمار کر

تب تو جان جائے گا کہ تو کے دن تک سوتا رہا۔
کیونکہ پہلی روٹی پتھر کی مانند سخت ہے۔
دوسری روٹی چمڑا ہو گئی ہے۔
تیسری روٹی سیلی ہے
چوتھی کے پرت پر پھپھوندی لگ چکی ہے۔
پانچویں کا رنگ سبز ہو رہا ہے۔
چھٹی روٹی تازی ہے
اور ساتویں روٹی ابھی چولھے پر ہے
کہ میں نے تمہیں چھو کر جگایا۔''

گِل گامش نے کہا:
''اُتناپشیتم! میں کیا کھاؤں کدھر جاؤں؟
رات کا چور ابھی سے میرے اعضا پر مسلّط ہے۔
موت میرے گھر میں بیٹھ گئی ہے
اور میرا پاؤں جہاں رُکتا ہے
مجھے موت ہی دکھائی دیتی ہے۔''

تب اُتناپشیتم اُرشابی ملاح سے مخاطب ہوا:
''اُرشابی! تیرا بُرا ہو!

یہ بندرگاہ، اب اور — سدا تجھ سے نفرت کرے گی۔
تجھ کو اس بندرگاہ پر سمندر کو پار کرنا منع ہے۔
اس ساحل سے دُھتکارے ہوئے ملاح یہاں سے چلا جا،
لیکن اس آدمی کو جو تیرے پیچھے پیچھے چلا تھا
جس کو تو یہاں لایا تھا
جس کا بدن گندگی سے ڈھپا ہے۔
اور جس کے اعضا کا حسن جنگلی کھالوں نے چُھپا رکھا ہے۔
اس کو گھاٹ پر لے جا،
وہاں وہ اپنے لمبے بالوں کو دھو کر برف کی طرح صاف کرے گا۔
اپنی کھال کی پوشاک کو پھینک دے گا۔
جسے سمندر بہا لے جائے گا۔
اور اس کے بدن کا حسن نکھر آئے گا۔
اس کی پیشانی پر نیا فیتہ لگے گا
اور اس کی عریانی کو ڈھانکنے کے لیے نئے کپڑے ملیں گے۔
جب تک وہ اپنے شہر نہ پہنچ جائے گا
اور اس کا سفر تمام نہ ہو گا
یہ کپڑے جوں کے توں نئے رہیں گے۔"

پس اُرشابی، گل گامش کو گھاٹ پر لے گیا۔
اور، گل گامش نے اپنے لمبے بالوں کو دھو کر برف کی طرح صاف کیا۔
اس نے اپنی چرمی پوشاک پھینک دی۔
جسے سمندر بہا لے گیا۔
اور اس کے بدن کا حسن نکھر آیا۔
اس نے اپنی پیشانی کا فیتہ بدل ڈالا۔

اور عریانی کو ڈھانکنے کے لیے نئی پوشاک پہن لی۔
جو اس وقت تک جوں کی توں نئی رہے گی۔
جب تک وہ اپنے شہر میں نہ پہنچے گا
اور اس کا سفر تمام نہ ہوگا۔

جب گل گامش اور اُرشابی نے ناؤ کو پانی میں ڈالا۔
اور اس میں بیٹھ گئے اور روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔
لیکن اُتناپشیتم ساکنِ مادری کی زوجہ نے اس سے کہا:
''گل گامش...... کتنی مصیبتیں اٹھا کر تھکا ماندہ یہاں آیا تھا۔
تو اسے اپنے دیس لے جانے کے لیے کیا چیز دے گا؟''

پس اُتناپشیتم نے گل گامش کو آواز دی
اور گل گامش نے ایک شہیتر اٹھالیا
اور کشتی کو ساحل پر لایا۔
''گل گامش! تو یہاں تھکا ماندہ آیا تھا،
اب میں تجھے کیا چیز دوں
جسے لے کر تو اپنے دیس کو جائے۔
گل گامش! میں ایک خفیہ بات تجھ پر ظاہر کرتا ہوں۔
اور یہ اَسرارِ خداوندی ہے جو میں تجھے بتاؤں گا:
ایک بوٹا ہے جو پانی کے اندر اُگتا ہے
وہ گلاب کی مانند خاردار ہے۔
وہ تیری انگلیوں کو لہولہان کردے گا۔
لیکن تو اس بوٹے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے
تو تیرے ہاتھوں میں وہ شے ہوگی
جس سے انسان کا شبابِ رفتہ لوٹ آتا ہے''

گل گامش نے جوں ہی سنا
بند کھول دیا تا کہ میٹھے پانی کا دھارا اسے گہرائی میں لے جائے۔
اس نے اپنے پاؤں میں بھاری بھاری پتھر باندھے
اور یہ پتھر اسے پانی کی تہہ تک لے گئے
وہاں اس نے یہ پودا دیکھا
پودے نے اسے لہولہان کر دیا۔
لیکن اس نے پودے کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔
اور پتھروں کو پاؤں سے الگ کر دیا۔
اور سمندر اسے بہا کر ساحل پر لے گیا
گل گامش نے اُرشانبی ملاح سے کہا:
''ادھر آ اور اس عجیب وغریب پودے کو دیکھ!
اس کی تاثیر سے انسان اپنی زائل شدہ طاقت واپس لا سکتا ہے۔
میں اسے مضبوط دیواروں والے اِریک میں لے جاؤں گا
اور یہ پودا بوڑھوں کو کھانے کے لیے دوں گا۔
اس کا نام 'بوڑھے دوبارہ جوان ہو جاتے ہیں' ہوگا
اور تب میں بھی اسے کھاؤں گا۔
اور میری گزری ہوئی جوانی واپس آ جائے گی۔''
پس گل گامش اسی پھاٹک سے واپس ہوا۔
جس سے وہ آیا تھا
اور اُرشانبی اس کے ہمراہ تھا۔
وہ تیس کوس تک چلتے رہے۔
اور تب انھوں نے اپنا فاقہ توڑا۔
اور پینتالیس کوس کے بعد وہ رات گزارنے کے لیے ٹھہر گئے۔

گل گامش نے ٹھنڈے پانی کی ایک باؤلی دیکھی
تو اس میں اترا اور نہانے لگا۔ مگر
باؤلی میں ایک سانپ رہتا تھا۔
اس نے پھول کی میٹھی خوشبو سونگھ لی
وہ پانی سے نکلا اور پودے کو ہڑپ کر گیا۔
فوراً ہی اس نے اپنی کیچلی اتار دی۔
اور باؤلی میں واپس چلا گیا—
تب گل گامش بیٹھ کر رونے لگا
آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے
اور اس نے اُرشابنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''اُرشابنی! کیا اسی دن کے لیے میرے ہاتھوں نے اتنی محنت کی تھی؟
کیا اسی دن کے لیے میں نے اپنا دل خون کیا تھا؟
مجھے تو کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔
مجھے نہیں البتہ زمین کے ایک کیڑے کو میری محنت کا پھل ملا ہے۔
پانی کی لہر پودے کو تیس کوس دور
اسی جگہ واپس لے جائے گی جہاں میں نے اسے پایا تھا
مجھے ایک نشانی ملی تھی مگر میں نے اسے بھی کھو دیا
آ، کشتی کو ساحل پر چھوڑ دیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''
تیس کوس کے بعد انھوں نے فاقہ توڑا
اور پینتالیس کوس کے بعد وہ رات گزارنے کے لیے ٹھہر گئے
تین دن میں انھوں نے ایک مہینہ پندرہ دن کا سفر طے کیا۔
سفر تمام ہوا تو وہ اریک میں داخل ہوئے۔ مضبوط دیواروں والے شہر میں۔
گل گامش نے اُرشابنی ملاح سے کہا:

"اُرشانبی ارِیک کی دیوار پر چڑھ۔
اس کے بنیادی چبوترے کو غور سے دیکھ۔
اور چنائی کو جانچ
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی ہے؟
اور کیا سات عاقلوں نے اس کی نیو نہیں رکھی تھی۔
شہر کا ایک تہائی حصہ آبادی ہے
ایک تہائی باغ ہے
اور ایک تہائی کھیت۔
پھر عشتار دیوی کے حدود ہیں۔
یہ سب حصے اور حدود ارِیک ہیں۔"
شہر کی تعمیر بھی بادشاہ گِل گامش ہی کا کارنامہ تھا۔
وہ جس کو روئے زمین کے سب ملکوں کی خبر تھی
وہ عاقل تھا۔ واقفِ اَسرار اور دانائے راز
وہ ہمارے لیے سیلاب سے پیش تر کی ایک داستان لایا۔
وہ ایک طویل سفر پر گیا۔
اور جب خستہ و درماندہ واپس ہوا
تو اس نے پوری داستان ایک پتھر پر کندہ کروادی۔

دسواں باب

گِل گامش کا انجام

دیوتاؤں کے دیوتا، اِن لیل کوہستانی نے
گِل گامش کی جو تقدیر لکھی تھی
وہ پوری ہوئی۔
"پاتال کا اندھیرا اسے روشنی دکھائے گا۔
پُشتہا پُشت تک نسل انسانی اس کی یادگار کا جواب نہ پیش کر سکے گی۔
نئے چاند کی مانند سورماؤں اور دانش مندوں کی تقدیر میں بھی
عروج اور زوال لکھا ہوتا ہے ــــ
مگر دنیا والے کہیں گے:
کون ہے جس نے گِل گامش کی مانند
طاقت اور جبروت سے حکومت کی۔
اس کے بغیر روشنی گم ہے۔
جیسے اندھیری راتوں میں
پرچھائیوں کے مہینے میں ــــ
گِل گامش! تیرے خواب کی تعبیر یہی تھی۔
تیری تقدیر میں بادشاہی لکھی تھی۔
مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں تھی۔
لیکن اس کے باعث دل گرفتہ مت ہو۔
غم نہ کر اور نہ پریشان ہو۔
اس نے تجھے بست و کشاد کی طاقت بخشی ہے

تو انسان کا نور اور اس کی ظلمت ہے۔
"اس نے تجھے انسانوں پر بے مثال اقتدار عطا کیا ہے۔
اور ان لڑائیوں میں فتح یاب بنایا ہے۔
جن سے گریز پا بھی بھاگ نہیں سکتا تھا
اور ان یورشوں اور یلغاروں میں سرخ رُو کیا ہے۔
جن سے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں ہے۔
لیکن اس قوت کو بے جا استعمال نہ کر۔
اپنے محل کے ملازمین سے انصاف کر۔
اور شمس کے روبرو عدل سے پیش آ۔"

بادشاہ نے اپنے آپ کو گرا دیا ہے۔
اور اب وہ کبھی نہ اٹھے گا
آقائے کلاب اب کبھی نہ اٹھے گا

اس نے شر پر قابو پایا
مگر اب وہ کبھی نہ اٹھے گا
اس کے بازو قوی تھے مگر وہ اب کبھی نہ اٹھے گا۔
اس میں دانائی اور دلکشی تھی۔
مگر اب وہ کبھی نہ اٹھے گا۔
وہ پہاڑوں میں چلا گیا
اور اب کبھی نہ اٹھے گا۔
وہ تقدیر کے بستر پر لیٹا ہے۔
اور اب کبھی نہ اٹھے گا۔
بوقلمونی بستر سے اب وہ کبھی نہ اٹھے گا۔
شہر کے چھوٹے بڑے سبھی لوگ نوحہ کناں ہیں۔

وہ بین کر رہے ہیں۔
گوشت اور خون کے سبھی انسان بین کر رہے ہیں۔
تقدیر آواز دے چکی ہے۔
اور رگل گامش کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی مانند
بستر پر پڑا ہے۔
پھندے میں گرفتار غزال کی مانند
بے درد نمتار اس پر چڑھا بیٹھا ہے
نمتار، جس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پاؤں
جو نہ پیتا ہے نہ گوشت کھاتا ہے
نن سون کے بیٹے، رگل گامش کے لیے
— اس کی چہیتی بیوی نے اس کے بیٹے، اس کی داشتہ نے،
اس کے موسیقاروں نے، اس کے درباری مسخرے۔ غرض گھر بھر نے
اپنے اپنے چڑھاوے وزن کیے۔
اس کے ملازموں، داروغوں اس کے محل کے سب لوگوں نے
نن سون کے بیٹے، رگل گامش کے لیے اپنے اپنے چڑھاوے وزن کیے۔
انھوں نے یہ چڑھاوے ملکہ قضا، ارِش کیگل کو پیش کیے
اور مُردوں کے سبھی دیوتاؤں کو —
پھاٹک کے پاسبان نمتی کے لیے روٹی،
سانپ کے پاسبان نن گزی دا[2] کے لیے روٹی
اور نوجوان گڈریے تموز کے لیے بھی
اِن کی[3] اور نن کی[4] کے لیے، اِن دُوکوگا[5] اور نن دُوکوگا[6] کے لیے
اِن مول اور نن مول کے لیے
تمام آبائی دیوتاؤں کے لیے

اِن لیل کے آباؤ اجداد کے لیے
ضیافت کے دیوتا شُل پائی کے لیے
مویشیوں کے دیوتا سموقان کے لیے
ماں نن ہور سگ ۓ اور تخلیق کے دیوتاؤں کے لیے درجہ بدرجہ،
میزبانِ فلک، پروہت اور پروہتن کے لیے
مُردے کا چڑھاوا وزن کیا گیا۔
گِل گامِش، ننؔ سون کا بیٹا، قبر میں لیٹا ہے۔
اُس نے قربان گاہ پر روٹی کی نذر چڑھائی۔
شراب ٹپکانے کی جگہ اس نے شراب ٹپکائی
اور یوں ہوا کہ انھیں دنوں آقا گل گامش ننؔ سونؔ کا بیٹا کوچ کر گیا۔
بے نظیر بادشاہ جس کا انسانوں میں جواب نہ تھا۔
جس نے اپنے آقا اِن لیل کو فراموش نہ کیا
ستائشِ بے حساب گِل گامِش آقائے کلاب کی—

حواشی

ا۔ یہ غالباً وہی پہاڑ ہے جس کا سلسلہ جنوبی زاب تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ انجیل کا کوہ ارارت بھی ہو سکتا ہے جو جھیل وان کے شمال میں واقع ہے۔

۲۔ نن گزی داز رخیزی کے دیوتاؤں میں سے ہے۔ اسے ''شجر حیات کا آقا'' بھی کہتے ہیں۔ اس کا سر انسانوں جیسا اور بقیہ جسم سانپ جیسا ہے۔ وہ سحر اور شفا کا دیوتا بھی ہے۔ وہ تموز کا رفیق بھی ہے جو جنت کے پھاٹک پر تموز کے ہمراہ کھڑا رہتا ہے۔

۳۔ انکی زمین اور زرخیزی کا دیوتا ہے۔

۴۔ نن کی اِن لیل دیوتا کی ماں ہے۔

۵۔ سومیریوں کا آبائی دیوتا جو پاتال میں رہتا ہے۔

۶۔سومیریوں کی ماتا دیوی۔سومیریوں کے چار بڑے خداؤں (انو،اِن لیل،اِنکی) میں سے ایک۔ وہ بعض اوقات اِنکی کی زوجہ کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔زمین پر ہریالی اسی نے پیدا کی۔اسے ''نین تو'' ولادت کی دیوی اور ''ورکی'' یعنی زمین بھی کہتے ہیں۔نن ہورسگ کے لفظی معنی ''ماں'' ہیں۔

سترہواں باب

طوفانِ نوحؑ کی اصل حقیقت

اُتنا پشیتم کی داستانِ سیلاب اور طوفانِ نوحؑ کے قصّے میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ اُتنا پشیتم کی داستان میں دیوتا انسان کے شور وغل سے تنگ آ کر انھیں غرقاب کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ انجیل اور قرآن شریف کی روایت کے مطابق خدا حضرت نوحؑ کی نافرمان قوم کو غرقاب کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اُتنا پشیتم کی داستان میں آیا اپنے محبوب بندے کو آنے والی تباہی سے آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو ایک کشتی بنا اور اس میں تمام جان دار چیزوں کے تخم رکھ دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ حضرت نوحؑ کو سیلاب سے خبردار کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ

والضع الفلك باعيننا ووحينا وله تخاطبنى فى الذين ظلمو انهم معرقون

(بنا کشتی روبرو ہمارے حکم سے اور نہ بول مجھ سے ظالموں کے واسطے۔ البتہ وہ غرق ہوں گے۔ سورۂ ہود) اور جب کشتی بن کر تیار ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نوحؑ سے کہتا ہے کہ اس میں سب چیزوں کے جوڑے رکھ لو۔ اُتنا پشیتم کی داستان میں طوفان تھمتا ہے تو کشتی کوہِ نصیر پر رُک جاتی ہے جو عراق کی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ حضرتِ نوحؑ کی داستان میں طوفان تھمتا ہے تو کشتی کوہِ جودی پر رُک جاتی ہے جو عراق کی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ اُتنا پشیتم کی داستان میں ہیرو خشکی کا سراغ لگانے کے لیے کوّے کو بھیجتا ہے۔ مفسّرینِ قرآن کے بیان کے مطابق حضرتِ نوحؑ خشکی کا سراغ لگانے کے لیے کبوتر یا فاختہ کو بھیجتے ہیں۔

اسلامی روایات میں اُتنا پشیتم کی داستان دراصل کئی شخصیتوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ پہلی شخصیت حضرتِ نوحؑ کی ہے جو سیلاب کا مرکزی کردار ہیں۔ دوسری شخصیت حضرتِ موسیٰؑ کی ہے جو حصولِ علم کی خاطر مجمع البحرین کا سفر کرتے ہیں۔ تیسری شخصیت حضرتِ خضرؑ کی ہے

جو حضرتِ موسیٰ ؑ کے قصے اور سکندر ذوالقرنین کے قصے کا مرکزی کردار ہیں۔ چوتھی شخصیت ذوالقرنین کی ہے جو چشمہ حیواں سے محروم رہتا ہے۔ سکندر ذوالقرنین کا قصہ ہم اس داستان کی تمہید میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ تاریخی سکندر نہیں بلکہ افسانوی سکندر ہے۔ وہ گِل گامش کی مانند متعدد مہمیں سر کرتا ہے اور طویل سفر اختیار کرتا ہے مگر گِل گامش کی طرح حیاتِ ابدی اس کی قسمت میں بھی نہیں ہے۔

حضرتِ موسیٰ ؑ اور حضرتِ خضر ؑ کا قصہ سورۂ کہف میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ گو اس قصے میں خضر ؑ کا نام نہیں آتا لیکن بخاری ؒ اور دوسرے مفسّرین کا خیال ہے کہ قرآن کا اشارہ خضر ؑ ہی کی طرف ہے۔ اس قصے میں حضرتِ موسیٰ ؑ کا کردار گِل گامش سے ملتا جلتا ہے۔ گِل گامش کی داستان میں عمائدینِ شہر شمس دیوتا اور صدوری سب گِل گامش کو سمجھاتے ہیں کہ اُتناپشیتم سے ملنے کا ارادہ ترک کردے مگر وہ کسی کی بات نہیں مانتا اور سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے آخر اُتناپشیتم کے پاس پہنچ جاتا ہے جو دو دریاؤں کے دہانے پر دِلمون میں رہتا ہے۔ دورانِ ملاقات میں وہ اُتناپشیتم سے حیاتِ ابدی کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن نیند کی وجہ سے وہ اُتناپشیتم کی معمولی سی شرط پوری نہیں کرسکتا اور ناکام و نامراد لوٹ آتا ہے اور راہ میں سانپ اسے دغا دیتا ہے۔

اسی طرح حضرتِ موسیٰ ؑ اپنے ملازم سے کہتے ہیں کہ میں مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگم) تک پہنچے بغیر چین نہ لوں گا خواہ میری ساری عمر سفر میں کیوں نہ گزر جائے۔ ان کے سفر کا مقصد اُس برگزیدہ بندے سے ملاقات کرنا ہے جس پر خدا کی رحمت ہے اور جو علمِ لدُنّی سے واقف ہے۔ مجمع البحرین میں حضرتِ موسیٰ ؑ کی ملاقات حضرتِ خضر ؑ سے ہوتی ہے اور وہ حضرتِ خضر ؑ سے درخواست کرتے ہیں کہ مجھے اپنی صحبت سے فیض یاب ہونے کی اجازت دیجیے مگر حضرتِ موسیٰ ؑ خضر ؑ کی شرطیں پوری نہیں کر پاتے اور گِل گامش کی طرح ناکام و نامراد واپس ہوتے ہیں۔ گِل گامش کو سانپ دغا دیتا ہے حضرتِ موسیٰ ؑ کو مچھلی دغا دیتی ہے۔

اُتناپشیتم اور حضرتِ خضر ؑ کی شخصیتوں میں بڑی مشابہت ہے۔ اُتناپشیتم اور خضر ؑ دونوں انسان ہیں لیکن دونوں کو حیاتِ ابدی نصیب ہے۔ اُتناپشیتم اور خضر ؑ دونوں دانائے رازِ

بزرگ ہیں اور دونوں دریاؤں کے سنگم پر رہتے ہیں۔ اُتنا پشیتم گل گامش کو ناکام و نامراد لوٹا دیتا ہے۔ حضرتِ خضرؑ حضرتِ موسیٰؑ اور سکندر دونوں کو ناکام و نامراد لوٹا دیتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُتنا پشیتم کا دوسرا نام ضیسا ترا ہے تو ہمارا قیاس اور قوی ہو جاتا ہے کہ دراصل اُتنا پشیتم اور خضرؑ دونوں ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ گل گامش کی داستان میں جس سیلاب کا ذکر کیا گیا ہے اس کی کوئی تاریخی حیثیت بھی ہے یا وہ فقط ایک فرضی قصہ تھا جو ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتا رہا۔ کیا عراق میں واقعی اتنا بڑا سیلاب کبھی آیا تھا جس کی وجہ سے دجلہ وفرات کی پوری وادی یا وادی کا بڑا حصہ غرقاب ہو گیا ہو یا یہ فقط من گھڑت باتیں ہیں۔

ان سوالوں کا جواب آسان نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ عراق کی کھدائیوں میں اب تک کسی سیلابِ عظیم کے آثار نہیں ملے ہیں جن کی بنا پر یقین سے کچھ کہا جا سکے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سیلابِ عظیم کی روایت نے مشرقِ قریب کے لوگوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ فہرستِ شاہاں میں تو سیلاب کو قدیم اور جدید تاریخ کے درمیان حدِّ فاصل کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ فہرستِ شاہاں کا مصنف تمہید کے طور پر پہلے ان پانچ بادشاہتوں کا حال بیان کرتا ہے جو سیلاب سے پہلے آسمان سے نازل ہوئیں پھر کہتا ہے کہ:

> "یہ پانچ شہر ہیں جن میں آٹھ بادشاہوں نے دو لاکھ اکتالیس ہزار سال حکومت کی تب زمین پر سیلاب چھا گیا اور سیلاب کے بعد جب بادشاہت دوبارہ آسمان سے اُتاری گئی تو سب سے پہلے کیش میں۔"

اس کے بعد عراق میں بادشاہتیں بنتی بگڑتی رہیں یہاں تک کہ فہرستِ شاہاں کا نام ونشان تک باقی نہ رہا لیکن سیلاب کی روایت بدستور زندہ رہی اور ہزار سال بعد جب توریت مرتب ہوئی تو سیلاب کی داستان نے اس میں بھی اپنے لیے مقام پیدا کر لیا اور ڈیڑھ ہزار برس تک یہودی اور عیسائی صحیفے اس روایت کو نقل کرتے رہے۔ اسی سیلاب کا قصہ قرآن میں بھی بار بار دہرایا گیا ہے۔

محققین اور مقلدین دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سیلاب اگر کسی دریا میں آ سکتا تھا تو

وہ دریائے فرات تھا جس کی طغیانیِ مزاج سے ہر شخص واقف ہے چنانچہ گل گامش کی داستان دریافت ہوئی تو محققین کو یقین ہو گیا کہ آخر کار ہم نے سیلابِ نوح ؑ کا سراغ پالیا۔ بعض خوش اعتقادوں نے تو کوہِ ارارات پر کشتیِ نوح ؑ کے شکستہ تختے بھی تلاش کر لیے لیکن عقل کی عدالت نے ان شہادتوں کو ناکافی قرار دے دیا۔

مگر علمائے آثاراتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔ چنانچہ سر لیونارڈ وولی نے اُر کے شاہی مقبروں کی کھدائی سے فارغ ہو کر 1929ء میں سیلابِ نوح ؑ کی تہہ تک پہنچنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے قبرستان کے متصل پچھتر (۷۵) فیٹ لمبا بیس (۲۰) فیٹ چوڑا اور پینسٹھ (۶۵) فیٹ گہرا ایک گڑھا کھدوایا۔ اس میں بیس (۲۰) فیٹ کی گہرائی تک پرانے گھروں کی ایک کے اوپر ایک آٹھ تہیں نکلیں۔ اس کے بعد اٹھارہ (۱۸) فیٹ تک مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کا ڈھیر ہی ڈھیر ملتا گیا۔ وہاں کسی زمانے میں کمہاروں کی بھٹی رہی ہوگی۔ اس انبار کی بالکل نچلی تہوں میں

> ''ہمیں پکی مٹی کا ایک وزنی چاک بھی ملا۔ اس چاک کا قطر تین فیٹ تھا۔
> ایک سوراخ چاک کے وسط میں بنا تھا اور دوسرا اگر کے پاس۔ یہ سوراخ
> چھوٹا سا تھا اور موٹھ لگانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ انسان کی سب سے
> قدیم ایجاد کا نمونہ تھا جس کی بدولت وہ خالص دست کاری کے دور سے
> نکل کر مشین کے دور میں داخل ہوا۔''

برتنوں کے ٹکڑے چاک کے تھوڑی دور نیچے تک بھی ملتے گئے۔ '' پھر یہ برتن بالکل غائب ہو گئے اور ہماری توقع کے مطابق سیلاب کی لائی ہوئی گاد کی دبیز تہہ صاف نظر آنے لگی۔ گاد کی یہ تہہ گیارہ فیٹ موٹی تھی۔ خوردبین سے دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ یہ گاد پانی کی تلچھٹ سے بنی تھی اور اس میں دریائے فرات کے وسطی علاقے کی چیزوں کے اجزا شامل تھے۔ گاد کے نیچے پھر انسانی آبادی کے آثار ملے، مثلاً کچی مٹی کی شکستہ اینٹیں، راکھ، برتنوں کے ٹکڑے اور مٹی کی مورتیاں، ان کی تین تہیں نکلیں۔ گاد کی بالکل نیچے کی تہہ میں پتھر کی دو مالائیں بھی ملیں۔ اس قسم کے پتھر کا قریب ترین ذخیرہ کوہِ نیل گری (جنوبی ہندوستان) میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیلاب کی ہم عصر سومیری قوم بڑی شوقین مزاج تھی جو پتھر کی مالائیں دور دراز مقامات

سے منگواتی تھی۔'' یا شاید جنوبی ہند کا کوئی سوداگر یہ مالائیں وہاں لے گیا ہو۔ ان کی مٹی کی مورتیاں بھی بڑی نازک تھیں اوران مورتیوں میں حسّی کیفیت بھرپور پائی جاتی تھی۔

'' گیارہ فیٹ موٹی گاد کا مطلب یہ ہوا کہ دریائے فرات کا سیلاب کم ازکم پچیس فیٹ اونچا ضرور تھا اور اس سیلاب کی وجہ سے عراق کے نشیبی علاقوں میں تین سو میل لمبا اور ایک سو میل چوڑا خطہ ضرور غرقاب ہو گیا ہوگا۔ یعنی ایران کی سرحد سے ملکِ شام کی سرحد کے درمیان کا سارا علاقہ۔ گاؤں سب کے سب بہہ گئے ہوں گے اور فقط چند شہر بچے ہوں گے جو ٹیلوں پر آباد تھے۔

لہٰذا کتابِ پیدائش کا یہ دعویٰ کہ سیلاب کا پانی چھبیس فیٹ بلند تھا غالبًا درست ہے مگر یہ کوئی عالمگیر سیلاب نہ تھا۔ البتہ اتنا بڑا سیلاب ضرور تھا جس نے وادیِ دجلہ وفرات کو غرقاب کردیا۔ جو لوگ اس وادی میں بستے تھے ان کی ساری دنیا تو یہی تھی۔''[۱]

لیکن علمائے آثار نے سر لیونارڈ وولی کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جنوبی عراق کے نشیبی علاقے میں فقط ایک گڑھا کھودنا اور اس کے آثار کی بنا پر پورے ملک کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنا سائنسی طریقۂ کار کے منافی ہے۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر وادی میں ۲۵ فیٹ اونچا سیلاب آتا تو اُر کے گردونواح کے علاقے بھی ضرور غرقاب ہو جاتے۔ مگر اریدو، اریک، لگاش اور لارسا کی کی کھدائی میں زمین کی کسی تہہ سے بھی سیلاب کی گاد برآمد نہیں ہوئی حالانکہ یہ پرانے شہر اُر سے فقط چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ معترضین کہتے ہیں کہ سیلاب نوارے کا پانی لونہ تھا جس نے گردوپیش کی چند گز زمین نم کردی ہو۔

یہ اعتراض بڑا وزنی تھا اور غالبًا سر لیونارڈ وولی کو پہلے سے اس کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے سیلابِ عظیم کا نظریہ پیش کرتے وقت اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عراق کے مختلف حصوں میں چھوٹے چھوٹے مقامی سیلابوں کے آثار تو ملے ہیں لیکن سیلابی گاد کی اتنی دبیز تہہ کہیں نہیں

ملی جیسی اُر میں برآمد ہوئی ہے البتہ معترضین کے جواب میں انھوں نے یہ دلیل دی کہ سیلاب کی گاد ہر جگہ نہیں بنتی بلکہ کسی جگہ اگر پانی کا دھارا بہت تیز ہو تو وہ زمین کو اور گہرا کر دیتا ہے۔ ان کے خیال میں گاد وہیں جمتی ہے جہاں دھاری کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ اپنی اس دلیل کی تائید میں سر لیونارڈ وولی نے اُر کے مختلف حصوں میں گڑھے کھودے لیکن ہر جگہ گاد کی دبازت مختلف نکلی۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ گاد شہری ٹیلے کے فقط شمالی ڈھلوان کے پاس جمع تھی کیونکہ دھارے کا پانی اسی جگہ ڈھلوان سے ٹکراتا تھا لیکن یہ تاویل بھی تشفی بخش نہیں ثابت ہوئی کیونکہ جنوبی عراق میں اُر کے ہم عصر اور ٹیلے بھی تھے۔ پھر کیا سبب ہے کہ دھارے کا پانی ان ٹیلوں سے نہیں ٹکرایا اور نہ کسی ٹیلے کے پاس گاد کی تہیں جمیں۔

بہت ممکن ہے کہ اُر میں ۲۵ فیٹ اونچے سیلاب کی آفت دریائے فرات کے مقامی بند ٹوٹ جانے سے آئی ہو (اُر آج بھی دریائے فرات کی سطح سے بہت نیچے آباد ہے) اور روایت نے رفتہ رفتہ اس مقامی سیلاب کو سیلابِ عظیم کی شکل دے دی ہو۔

عجیب بات ہے کہ ہندوستان، میکسیکو اور دوسری پرانی تہذیبوں کی اساطیری داستانوں میں بھی سیلابِ عظیم کی روایت ملتی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ ہو نہ ہو سیلاب کا یہ تصور قدیم انسان کے تحت الشعور کی کرشمہ سازی ہے۔ شاید انسان کے ذہن میں یہ تصور برفانی دور میں پیدا ہوا جب منطقہء حارّہ میں برفانی چشمے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور دریا ابل کر سمندر بن جاتے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ سر لیونارڈ وولی، ار کی کھدائی، ص ۳۶

اٹھارواں باب

دنیا کا پہلا ضابطہ قانون

پیرس کے شہرۂ آفاق عجائب گھر (لوُور) میں پتھر کی ایک لاٹ شیشے کے بکس میں بڑی حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ عجائب گھر کا شاید یہ سب سے نادر اور بیش قیمت اثاثہ ہے۔ مخروطی شکل کی یہ لاٹ آٹھ فیٹ لمبی اور تین فیٹ موٹی ہے۔ اس کے بالائی حصے پر ایک نہایت بامعنی منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس منظر میں بابل کا سب سے بڑا دیوتا مرڈک بڑے جاہ وجلال سے تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے روبرو بابل کا فرماں روا حمورابی نہایت ادب سے کھڑا ہے۔ وہ دائیں ہاتھ سے دیوتا کو سلام کر رہا ہے اور بائیں ہاتھ کو پیٹ پر رکھے ہوئے ہے۔ مرڈک اسے ضابطۂ قانون کا تحفہ عطا کر رہا ہے جو لاٹ کے بقیہ حصے پر عکادی زبان میں کندہ ہے۔ مدّعا یہ تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ یہ ضابطہ کسی انسان نے نہیں بنایا ہے بلکہ عطیۂ خداوندی ہے لہٰذا بہت مقدس ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا بادشاہ کی نہیں بلکہ خداوند مرڈک کے احکام کی خلاف ورزی کرے گا۔ پرانے زمانے میں خدا اور انسان کے درمیان پیام وکلام کا سلسلہ قائم تھا۔ خدا اپنے بندوں کے افعال وکردار پر بڑی کڑی نظر رکھتا تھا اور وقتاً فوقتاً انھیں اپنے احکام سے نوازتا رہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سارے احکام شاہی محل یا معابد کی راہوں ہی لوگوں تک پہنچتے تھے۔

اس زمانے میں چھاپے خانے اور اخبار نہیں تھے لہٰذا سلطنت کے اہم قوانین اور احکام کو پتھر کی لاٹوں پر کندہ کر کے مندروں میں یا شاہراہوں پر نصب کر دیا جاتا تھا تاکہ لوگ اپنے حقوق وفرائض سے آگاہ رہیں۔ حمورابی کی لاٹ تاریخ کی سب سے پرانی لاٹ ہے۔ یہ لاٹ حمورابی کے حکم سے سپر کے مقام پر شمس دیوتا کے مندر میں نصب کی گئی تھی۔ بارھویں صدی

قبلِ مسیح میں ایلم کا بادشاہ اس لاٹ کو سُو سا اٹھالے گیا اور فتح کا نشان بنا کر وہاں نصب کر دیا۔ سُو سا کی بربادی کے بعد یہ لاٹ ملبوں میں دب گئی اور تین ہزار برس کے بعد ۱۹۰۱ء میں فرانسیسی ماہرینِ آثار کو سُو سا کی کھدائی میں ہاتھ آئی۔ یہ لاٹ ابھی تک بڑی اچھی حالت میں ہے فقط پانچ چھ جگہوں پر عبارت مٹ گئی ہے جس کی وجہ سے حمورابی کے تقریباً ۳۵ قوانین ضائع ہو گئے ہیں لیکن ان قوانین کی نقلیں اتفاق سے دوسرے مقامات سے برآمد ہو چکی ہیں اور ان کی مدد سے حمورابی کا پورا ضابطہ مرتب کر لیا گیا ہے۔ اس ضابطے میں کل دفعات ۲۸۶ ہیں۔

ہر قانون اپنے عہد کے سماجی حالات اور ریاستی تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔ قانون کی مدد سے دراصل ان رشتوں کے اصول مرتب کیے جاتے ہیں جو انسان اور املاک کے درمیان معاشرے میں رائج ہوتے ہیں۔ ہر قانون میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں بدلتے ہوئے حالات کا واضح ثبوت ہوتی ہیں۔ جس قانون کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اس کو منسوخ کر دیا جاتا ہے اور نئے حالات کے مطابق نیا قانون وضع ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے قانون بنتا ہے تب لوگ اس پر عمل کرتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پہلے انسان کے سماجی عمل اور رشتے قبولِ عام کی سند حاصل کرتے ہیں تب ان کو قانونی شکل دی جاتی ہے۔ غرضیکہ قانون کی بنیاد سماجی رواج اور تجربے پر ہے۔ دراصل انھیں رواجوں اور تجربوں کو ترتیب دینے کا نام قانون ہے۔ مثلاً موسوی قانون یا شہنشاہ جسٹینین اور نپولین کے ضابطے چند افراد کے دماغ کی اپج نہ تھے بلکہ ان سماجی حالات اور طبقاتی رشتوں کا پرتو تھے جو حضرتِ موسیٰ یا جسٹینین یا نپولین کے عہد میں پیدا ہو گئے تھے۔ ان شخصیتوں نے اپنے عہد کے حالات اور تقاضوں کو سمجھا اور انھیں مرتب کر کے قانونی شکل دی۔ یہی ان کی عظمت ہے۔

حمورابی کا ضابطہ قانون بھی اس کے ذہن کی تخلیق نہ تھا اور نہ اس ضابطے کو مرڈک دیوتا نے آسمان سے نازل کیا تھا بلکہ اس ضابطے کے مندرجات رسم و رواج کے طور پر دجلہ و فرات کی وادی میں صدیوں پیشتر سے رائج تھے۔ بالخصوص عکادی علاقوں میں حمورابی کے قانون دانوں نے ان چیزوں کو ایک مرکزی ضابطے کی شکل دے دی۔ یہ ضابطہ پوری سلطنت کے لیے مرتب کیا گیا تھا کیونکہ ریاست کی مرکزیت کو مستحکم کرنے اور بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو منوانے

کے لیے ضروری تھا کہ پوری قلمرو میں ایک ہی ضابطہ رائج ہو۔

حمورابی کا ضابطۂ قانون تاریخ کا پہلا ضابطہ نہیں ہے بلکہ عراقی آثار کی کھدائی میں اب تک تین ایسے قانونوں کا سراغ ملا ہے جو حمورابی سے پیشتر نافذ کیے گئے تھے۔ پہلا اور سب سے پرانا ضابطۂ قانون سلطنتِ اُر (جنوبی عراق) کے بادشاہ اُرنمو (تمو دیوی کا غلام یا کتا) کا ہے۔ یہ ضابطہ حمورابی سے چار سو برس پیشتر (۲۱۱۳۔۲۰۹۶ ق م) وضع ہوا تھا۔ اس ضابطۂ قانون کی ایک نقل پچاس برس گزرے نیفر کے مقام سے برآمد ہوئی تھی مگر کچی مٹی کی لوحیں نہایت بوسیدہ اور شکستہ ہیں۔ اُرنمو کے قانون کی خصوصیت یہ ہے کہ عکادی اصولِ قانون کے برعکس (جس میں جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ کی نہایت سخت سزائیں موجود ہیں) جسمانی سزا دینے کے بجائے مجرم سے تاوان وصول کیا جاتا تھا۔

دوسرا ضابطہ اَشنونا کی بادشاہت میں رائج تھا۔ یہ بغداد کے مشرق میں اُموریوں (عکادی کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی) اس کا زمانہ اُر کے زوال اور بابل کے قیام کے درمیان کا زمانہ تھا۔ اِشنونا کے ضابطے میں کل ۶۱ دفعات ہیں۔ ابتدائی دفعات میں چاندی کے ایک خاص وزن (شیکل) کی قدرِ مبادلہ جو تیل، چربی، اون، نمک، تانبے کے ایک خاص وزن کے مساوی قرار دی گئی ہے اور بیل گاڑی کا یومیہ کرایہ جنس اور نقدی کی شکل میں مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کشتی کا کرایہ، فصل کاٹنے والے کی مزدوری، خچر کا ماہانہ بھاڑا اور مزدوروں کی یومیہ اجرت تفصیل سے درج ہے۔

اس ضابطے کے تحت شاہی محل یا معبد میں یا سرکاری کھیت یا معبد کے کھیت میں رات کے وقت چوری کرنے کی سزا موت تھی۔ کوئی سرکاری ملازم یا معبد کا پروہت حبسِ بے جا میں مر جاتا تو مجرم کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ کسی شخص کی منگیتر کے ساتھ زنا کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ اسی طرح شادی شدہ عورت کی سزا جس نے غیر مرد کے ساتھ مباشرت کی ہو موت تھی۔

اِشنونا کے ضابطے میں شادی ایک معاہدہ تھی۔ شادی سے پہلے مرد لڑکی کے والدین کو کچھ رقم ادا کرتا تھا اور قانون میں اس کے چند قاعدے درج ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی شخص سے شادی کی رقم وصول کر لیتا اور وعدہ کرتا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کر دوں گا لیکن بعد میں وعدے سے پھر جاتا اور بیٹی کی شادی کسی اور سے کر دیتا تو اس کو پہلے شخص کو رقوم کی دُگنی رقم دینی پڑتی تھی۔

شادی کا معاہدہ لڑکی کے والدین کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ اس معاہدے کے بغیر جس پر گواہوں کی مہر لگتی تھی شادی قانونی طور پر تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔

اسیرِ جنگ کی بیوی کو دوسری شادی کا اختیار تھا لیکن رہا ہونے پر اسیرِ جنگ اپنی بیوی کو واپس طلب کرنے کا مجاز تھا البتہ دوسرے شوہر کی اولاد پر اس کا کوئی حق نہ تھا لیکن اپنی مرضی سے ترکِ وطن کرنے والا واپس آ کر اپنی بیوی کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔

طلاق کی اجازت تھی بشرطیکہ عورت بانجھ ہو۔ اولاد والی بیوی کو طلاق دینے والے کی املاک اور ساری جائداد ضبط کر لی جاتی تھی۔

کسی شخص کی باکرہ کنیز سے زنا کرنے کی سزا ۳۱/۱ مینا چاندی تھی۔

غلام یا کنیز کی چوری کرنے والے کو ایک غلام یا ایک کنیز بطور جرمانہ دینی پڑتی تھی۔

موت کے مقدموں کی سماعت فقط بادشاہ کے روبرو ہو سکتی تھی۔

ناک کاٹنے یا ایک آنکھ پھوڑنے کی سزا ایک مینا چاندی تھی۔ ایک دانت توڑنے یا ایک کان کاٹنے کی سزا ۲۱/۱ مینا اور منہ پر تھپڑ مارنے کی سزا ۱۰ اشیکل تھی۔

۳/۴، انگلی قلم کرنے کی سزا ۲/۳۱ مینا چاندی تھی۔

مالکِ مکان کی غفلت سے (سرکاری ملازمین کے متنبہ کرنے کے باوجود) اگر کوئی دیوار گر جاتی اور جان تلف ہو جاتی تو اس کی سزا موت تھی۔

حمورابی کا تیسرا پیش رَو ریاستِ اسین کا بادشاہ لپت اشتر (۱۹۳۴ ق م - ۱۲۹۴ ق م) تھا۔ اس کے ضابطۂ قانون کی فقط ۳۸ دفعات پڑھی جا سکتی ہیں کیونکہ مٹی کی لوحیں بالکل ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ان دفعات میں وراثت، جائیدادِ غیر منقولہ، غلاموں کی ملکیت اور معاہدوں کی شرطیں درج ہیں۔

حمورابی کا ضابطہ اپنے پیش رووں کے ضابطوں سے کہیں زیادہ جامع اور مبسوط تھا۔ اس

کا آغاز ایک طویل تمہید سے ہوتا ہے جس میں شہنشاہ نے قانون کی غرض و غایت تفصیل سے بیان کی ہیں:

جس وقت خدائے عظیم اَنُوم
اور زمین و آسمان کے آقا اِن لیل نے
جو سب کی تقدیروں کا متعین کرنے والا ہے
مرڈک کو تمام بنی نوع انسان کا حاکم مقرر کیا۔
اور بابل کو اس کے عظیم نام سے پکارا۔
اور اسے دنیا میں سب پر فضیلت بخشی۔
اور اس کے وسط میں ایک مضبوط بادشاہت قائم کی۔
جس کی بنیادیں اتنی ہی پائدار ہیں جتنی آسمان و زمین
اسی وقت اِنُوم اور اِن لیل نے مجھے نامزد کیا
تا کہ لوگوں کے گوشت کو بہتر بناؤں
اور شریروں اور بد معاشوں کا قلع قمع کروں۔
تا کہ قوی ضعیف کو ستانہ سکیں۔
اور میں کالے دبالوں والی رعایا پر سورج بن کر چمکوں
اور زمین کو روشن کروں۔
میں حمورابی ہوں
جو دنیا کے چاروں گوشوں پر حاوی ہے۔
جس نے بابل کو عالی شان بنایا
اور آقا مرڈک جس سے خوش ہے۔
وہ جو تمام عمر الیساغ اللہ کی ذمے داری قبول کرتا رہے گا۔
وہ جس نے اپنی رعایا کو تکلیفوں سے نجات دلوائی۔
اپنی رعایا کا گڈریا

جس کے کارنامے عِشتار کو پسند ہیں۔
جو قانون کا حکم منواتا ہے۔
جو لوگوں کو صحیح راہ پر چلاتا ہے
جو بڑبڑانے والوں کو چپ کر دیتا ہے
جو بابل کا سورج ہے
اور عکّاد اور سومیر کو روشنی بخشتا ہے۔
جب مرڈک نے مجھے ہدایت کی کہ اپنی رعایا کو راہِ راست پر لے چلوں
اور ملک کی نگرانی کروں
تو میں نے ملک کی زبان میں
قانون اور انصاف قائم کیا۔
لوگوں کی بہبودی کی خاطر
اور اس وقت میں نے یہ اعلان نافذ کیا۔

حمورابی کے ضابطے کے مطالعے سے اس دور کی معاشرتی زندگی کے بہت سے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ پتہ چلتا ہے کہ محل اور معبد سے وابستہ طبقوں کے علاوہ کہ معاشرے کے خالص غیر پیدا آور گروہ تھے۔ عکّادو سومیر کے باشندے چار طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اشرافیہ (اَویلو) مساکین (مشکنو) غلام (وردو) اور عام شہری مثلاً تاجر، کاری گر، زمیندار، کاشت کار، باغبان، مزدور، گڈریے اور ملاح وغیرہ۔ اشرافیہ سے عبارت شاہی خاندان کے افراد اور امرائے دربار تھے۔

مساکین وہ طبقہ تھا جس کو فوجی یا انتظامی خدمات کے عوض جاگیریں، وظیفے اور دوسری رعایتیں حاصل تھیں۔ غلام عام طور پر جنگی قیدیوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے یا ان کی اولاد کو خرید لیا جاتا تھا یا وہ مقروض لوگ ہوتے تھے جو قرض ادا نہ کر سکنے کی صورت میں خود فروخت کیے جاتے تھے۔ وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتے تھے اور داغے جاتے تھے۔ ان کو ہر جرم کی سزا دوسرے طبقوں کے مقابلے میں زیادہ ملتی تھی اور آقا کو کنیز کے ساتھ شادی کیے بغیر مباشرت

کرنے کا پورا حق تھا۔ غلام آزاد ہو سکتے تھے۔ ان کا آقا ان کو اپنا متبنٰی بنا سکتا تھا اور وہ آزاد طبقے کی عورت سے شادی بھی کر سکتے تھے۔

اس عہد میں سزا اور جزا کا تعین سماجی رتبے کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک ہی جرم کی سزا غلام کے لیے آزاد شہری سے کہیں زیادہ سخت تھی۔

مثلاً اشرافیہ کے کسی فرد کی آنکھ ضائع ہو جاتی تو مجرم کی آنکھ پھوڑ دی جاتی تھی (دفعہ ۱۹۶)۔ اگر اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی تو مجرم کو ایک مینا (وزن) چاندی بطور جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا (۱۹۸)۔ اور اگر یہی جسمانی نقصان کسی غلام کو پہنچتا تو جرمانہ نصف ہو جاتا تھا (۱۹۹)۔ اگر ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کا دانت توڑ دیتا تو عدالت اس کا دانت بھی توڑ دیتی تھی لیکن شریف آدمی کسی عام آدمی کا دانت توڑ دیتا تو اس کو فقط ۳/۱ مینا چاندی بطور جرمانہ ادا کرنی پڑتی تھی۔

حمورابی کے عہد میں قانون کی نظر میں سب برابر نہیں تھے اور نہ طبقات زدہ سماج میں آج بھی سب لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں حالانکہ یکساں نظری کے دعوے بہت کیے جاتے ہیں۔

اُس وقت تک سِکوں کا رواج نہیں ہوا تھا (سِکہ ساتویں صدی قبلِ مسیح میں ایجاد ہوا) لیکن چاندی کے تین اوزان سِکّے کی حیثیت سے رائج تھے۔ مینا کا وزن ۸۰۰ گرام ہوتا تھا۔ شیکل کا ۸ گرام اور سع SE کا ۲۲/۱ گرام۔ وزن تولنے کے لیے گر اور گو دو باٹ تھے۔ ایک گر کا وزن ۷ بُشل (بُشل ۲۹۰ سیر) کے برابر ہوتا تھا اور ایک گر میں ۳۰۰ گو ہوتے تھے (۴/۳ کوارٹ)۔ پیمائش کے لیے جریب استعمال کی جاتی تھی۔ ایک سار کا رقبہ ۴۲۱٫۵ مربع گز کے برابر ہوتا تھا۔

پیشہ وروں کے کام کا معاوضہ ریاست کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔ چنانچہ حمورابی کے ضابطے میں محنت کشوں کی اُجرتیں بڑی تفصیل سے درج ہیں مثلاً کھیت مزدور اور گڈریے کی سالانہ اجرت ۸ گر ہوتی تھی۔ چرواہے کی ۶ گر۔ کھلیان میں کام کرنے والے بیل کی یومیہ اجرت ۲۰ گو تھی اور فقط گاڑی کی ۴۰ گو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہات میں تو اُجرت کی ادائیگی جنس کی شکل میں ہوتی تھی لیکن

شہروں میں چاندی کی شکل میں ہوتی تھی۔ چنانچہ اینٹ بنانے والے مزدور اور بڑھئی اور کشتی بان اور معمار وغیرہ کی اجرتیں شیکل اور سع میں لکھی ہیں۔ مثلاً ابتدائی پانچ مہینوں میں مزدور کی یومیہ اجرت چھ سع چاندی مقرر تھی اور سال کے باقی ماندہ مہینوں میں پانچ سع چاندی لیکن دیہات میں اجرتیں جنس کی شکل میں ادا کی جاتی تھیں۔ مثلاً کھیت مزدور کی سالانہ مزدوری آٹھ گُر اناج، چرواہے کی چھ گُر اناج، گڈریے کی ۸ کر علیٰ ہذا۔

حمورابی کی لاٹ پر جرّاح، بلاہے، مہر ساز، سونار، موچی، ٹوکری ساز، کانسیہ (اس وقت لوہا دریافت نہیں ہوا تھا بلکہ آلات و اوزار، تانبے، پیتل اور کانسے سے بنتے تھے) سب کی اجرتیں کندہ تھیں لیکن لاٹ کے حروف مٹ گئے ہیں۔ بقیہ قوانین کو چار پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے مثلاً املاک، لین دین، ضابطۂ فوجداری، ازدواجی تعلقات اور غلام اور آقا کے تعلقات۔

سزا کی دو قسمیں تھیں جسمانی سزا اور مالی سزا۔ ہاتھ، کان، ناک، چھاتی اور زبان کاٹ دینا، آگ میں جلا دینا، ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دینا اور قتل کر دینا جسمانی سزائیں تھیں۔ مالی سزا میں جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا لیکن بید لگانے یا قید کرنے کی سزائیں نہیں ہوتی تھیں۔

موسوی شریعت کے مانند (جو تقریباً آٹھ سو سال بعد نافذ ہوئی) حمورابی کے عہد میں بھی جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ کی سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً متبنّی بیٹا اگر باپ سے کہہ دیتا کہ تم میرے باپ نہیں ہو تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ بعض دوسرے جرائم کی پاداش میں بھی جسمانی سزاؤں کا رواج تھا۔ مثلاً :

(دفعہ ۱۹۵) بیٹا اگر اپنے باپ پر ہاتھ اٹھاتا تو اس کا ہاتھ کاٹا جاسکتا تھا اور (۱۵۲) چوری کی سزا بھی قطعِ ید تھی۔

حمورابی کے ضابطے میں ۳۴ جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ابھی سو سال پیشتر تک برطانیہ میں تین سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی (چوری اور جعل سازی ان میں شامل تھے)۔ قتل اور جادوگری کا الزام اگر جھوٹا ثابت ہوتا تو مدعی کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ چوری کی سزا بھی موت تھی اور چوری کا جھوٹا الزام لگانے

والے کی سزا بھی موت تھی۔ غلام یا کنیز کے فرار میں مدد دینے یا ان کو اپنے گھر میں چھپانے کی سزا بھی موت تھی۔ نقب زنی کرنے والے کو موقعِ واردات پر دیوار میں زندہ چن دیتے تھے۔ ڈاکہ زنی کی سزا بھی موت تھی اور اگر ڈاکے کی تصدیق ہو جاتی تو صاحبِ املاک کو ریاست سے پورا معاوضہ ملتا تھا۔ آتش زدگی کے موقع پر اگر کوئی شخص متاثرہ مکان سے مال اسباب چراتا تو اسے آگ میں جلا دیتے تھے۔ جنگی مہم میں اپنی جگہ پر کسی بھاڑے کے آدمی کو بھیجنے کی سزا بھی موت تھی۔ اگر کوئی مکان تعمیری نقص کی وجہ سے گر جاتا اور مالکِ مکان اس میں دب کر مر جاتا تو معمار کو قتل کر دیا جاتا تھا اور اگر مالکِ مکان کا بیٹا ہلاک ہو جاتا تو معمار کے بیٹے کو جان سے مار دیا جاتا تھا۔

زانی عورت کو ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دیتے تھے لیکن اس کا انحصار شوہر کی مرضی پر تھا اگر وہ بیوی کو معاف کر دیتا تو ضابطے کی رُو سے عدالت کا بھی فرض تھا کہ وہ مجرم کو معاف کر دے۔ اگر کوئی آزاد شخص کسی دوسرے ملک میں پکڑ لیا جاتا اور اس کے گھر میں کھانے کو ہوتا تو عورت کا فرض تھا کہ وہ گھر کی حفاظت کرے اور اگر وہ دوسرے مرد کے ساتھ سوتی تو اس جرم کی سزا بھی موت تھی۔ اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ عورت سے جو ہنوز کنواری ہوتی زنا کرتا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ بیٹے کی بیوی سے زنا کرنے کی سزا بھی موت تھی۔

فوجی ملازم یا سرکاری افسر کی جاگیر کی خواہ وہ مکان ہو یا باغ کھیت، خرید و فروخت بالکل ممنوع اور ناجائز تھی۔ یہ جائیداد بیٹے یا بیوی کے نام بھی منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ اگر جاگیردار لڑائی میں گرفتار ہو جاتا اور اس کے بیٹے نابالغ ہوتے تو ان کی ماں کو ایک تہائی جائداد گزارے کے لیے مل جاتی تھی تاکہ وہ اولاد کی پرورش کر سکے لیکن اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی جائیداد کو بیوی یا بیٹے کے نام منتقل کیا جا سکتا تھا۔

جاگیردار اگر پروہت یا تاجر ہوتا تو اس پر یہ پابندیاں عائد نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ اس جاگیر کے خریدنے والے کو وہ تمام فرائض ادا کرنے پڑتے تھے جو اس جاگیر سے وابستہ تھے۔

زرعی زمین کو آدھی یا ایک تہائی بٹائی پر دینے کا رواج تھا مگر زراعت کے سیلاب زدہ ہو جانے کی صورت میں زمیندار اور مضارع دونوں کو اسی تناسب سے نقصان برداشت کرنا پڑتا

تھا۔ البتہ پیشگی لگان ادا کرنے کے بعد اگر کھیتی برباد ہو جاتی تو مزارع زمیندار سے رقم واپس لینے کا مجاز نہ تھا۔

اگر کسی کاشت کار کی زمین میں سیلاب یا خشک سالی کی وجہ سے فصل نہ پیدا ہوتی تو کاشت کار سال بھر کے لیے اپنے قرض خواہ کو قرض ادا کرنے سے بھی بری ہو جاتا تھا اور اس سال کا سود بھی واجب الادا نہ ہوتا تھا۔

مزروعہ زمین رہن رکھی جا سکتی تھی اور اس کی فصل مُرتہن کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ ضابطہ قانون کے مطابق زمیندار کا فرض تھا کہ اپنے حصے کی فصل میں مُرتہن کے قرضے کی رقم معہ سود اور زراعت کے مصارف بھی ادا کرے۔

اگر کسی زمیندار کی نہر کا پانی کسی دوسرے آدمی کے کھیت میں بہہ کر چلا جاتا اور اس کی فصل کو خراب کر دیتا تو زمیندار کو اس کا خسارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ حمورابی کے عہد میں مکان کرائے پر اٹھانے کا رواج تھا حالانکہ دنیا کے کسی حصے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مزید براں کرایہ پیشگی بھی وصول کیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکانوں کا باقاعدہ کاروبار ہوتا تھا۔ آبادی شاید بڑھتی جاتی تھی لیکن مکانوں کی تعمیر اس نسبت سے نہیں ہوتی تھی۔ یعنی طلب رسد سے زیادہ تھی اور لوگوں نے کم از کم ایک سال کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا ہو تو مالکِ مکان میعاد ختم ہونے سے پہلے اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس نہیں دے سکتا تھا اور اگر نکالتا تو کرائے دار کو پورے سال کا کرایہ واپس کرنا پڑتا تھا (دفعہ ۷۸)۔

مکان کرایے پر لینے سے پہلے کرایہ نامہ لکھا جاتا تھا۔ اس کرائے نامے پر مالکِ مکان اور کرایہ دار کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی ہوتے تھے چنانچہ اس زمانے کی ایک لوح ملی ہے جس پر کرایہ نامہ کندہ ہے۔ غالباً یہ دنیا کا سب سے قدیم کرایہ نامہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

> ''مشقوم ولد رِم اداد نے رِماتم سے جو شمس کا پروہت ہے ایک مکان ایک سال کے لیے کرایے پر لیا ہے۔ سال بھر کا کرایہ ڈیڑھ شیکل چاندی ہے۔ اس میں ۲/۳ شیکل پیشگی ادا کیا گیا۔

دو گواہوں کے نام۔ ایار کی دسویں تاریخ۔ نشان اسلحہ کا سال"

قرض اور سُود کا رواج بھی تھا۔ مقروض اگر چاندی کے بدلے چاندی ادا کرنے سے قاصر ہوتا تو اس کے عوض مساوی مالیت کا اناج معہ سود قرض خواہ کو ادا کر دیتا تھا۔ سود کی شرح زیادہ سے زیادہ بیس فیصد تھی اور اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ قرض خواہ نے بیس فیصد سے زیادہ سود وصول کیا ہے تو قرضے کی کل رقم ضبط ہو جاتی تھی۔ سُود در سُود کی سخت ممانعت تھی چنانچہ جرم ثابت ہونے پر مجرم سے دُگنی رقم وصول کی جاتی تھی۔

ضابطے میں تجارت کی شرطیں بھی متعین تھیں۔ مثلاً پھیری والا کسی سوداگر یا دکان دار سے مال لے جاتا تو فروخت شدہ مال کی اصل قیمت پر اسے سوداگر کو فروخت شدہ مال کی اصل قیمت مع سُود کے ادا کرنی پڑتی تھی۔ البتہ سُود دِنوں کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ پھیری والے کے نفع میں سوداگر کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ اگر پھیری والا دیوتا کی قسم کھا کر کہتا کہ میرا مال دشمن نے لوٹ لیا ہے تو وہ رقم کی ادائیگی سے بری ہو جاتا تھا۔

خرید و فروخت میں مہر شدہ رسید (جو مٹی کی تختی پر لکھی جاتی تھی) دی جاتی تھی اور اگر پھیری والا لاپروائی برتتا اور رقم ادا کرنے کے بعد سوداگر سے رسید نہ لیتا تو یہ رقم اس کی ادائیگی کے کھاتے میں نہیں لکھی جاتی تھی۔

ضابطہ قانون کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مے فروشی کا پیشہ عورتوں کے لیے مخصوص تھا اور بابل میں باقاعدہ شراب خانے ہوتے تھے جہاں لوگ شراب پینے جایا کرتے تھے اور شراب کے بدلے اناج یا چاندی ادا کرتے تھے۔ اگر مے فروش شراب کم تولتی تھی اور اس کا جرم ثابت ہو جاتا تھا تو اسے پانی میں پھینک دیا جاتا تھا۔

حمورابی کے زمانے میں شراب خانوں میں ہر قسم کے اوباش اور بدقوارہ لوگ جمع ہوتے تھے چنانچہ ضابطے میں لکھا ہے کہ اگر شراب خانے میں راندۂ قانون لوگ داخل ہوں اور مے فروش اربابِ حکومت کو مطلع نہ کرے تو مے فروش کی سزا موت ہے۔

اگر کوئی پروہت راہبہ یا دیوداسی مے خانے کا دروازہ کھولتی اور شراب پیتی پکڑی جاتی تو اسے آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ سزا بڑی سخت تھی لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پروہت

اور راہبائیں اور دیوداسیاں بھی چوری چھپے شراب پیتی تھیں۔

لطف یہ ہے کہ شراب قرض بھی مل جاتی تھی لیکن ایک بوتل شراب کی قیمت فصل کٹنے پر پچاس گو (کوارٹ ۴/۳) ادا کرنی پڑتی تھی۔

خیانتِ مجرمانہ ثابت ہونے پر مجرم کو پانچ گنا جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اناج کی خیانت کرنے والے کو دُگنا جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

لین دین میں گواہوں کی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ ایسا کوئی مقدمہ قابلِ سماعت نہ تھا جس میں چشم دید گواہ موجود نہ ہوں۔

عورت مرد کے رشتے کو بہت تفصیل سے منضبط کیا گیا تھا۔ ضابطے کے بموجب شادی ایک معاہدہ تھی۔ شادی سے پہلے اگر معاہدہ باقاعدہ طور پر مرتب نہ ہوتا تو عدالت شادی کو تسلیم نہ کرتی تھی۔

ایک لوح پر شادی کا معاہدہ ان لفظوں میں درج ہے:

''اماتگل کی شادی جو نئورتا مانوم کی بیٹی ہے اِن لیل عزّ وولد لوگل عزیدہ سے جو اِن لیل کا بڑا پروہت ہے ہوئی۔ اُماتگل ۱۹ شیکل چاندی اپنے شوہر کے گھر بطور جہیز لائی ہے۔

اگر اِن لیل عزّ کبھی اپنی بیوی سے کہے کہ آج سے تم میری بیوی نہیں ہو تو اس کو اپنی بیوی کی ۱۹ شیکل چاندی واپس کرنی ہوگی اور ۱/۲ امینا چاندی بھی بطور رقم طلاق اپنی بیوی کو دینی ہوگی۔ اگر اُماتگل کبھی اپنے شوہر سے کہے کہ تم میرے شوہر نہیں ہو تو اسے ۱۹ شیکل چاندی سے دست بردار ہونا پڑے گا اور ۱/۲ امینا چاندی اپنے شوہر کو دینا ہوگی۔ فریقین نے ہمارے روبرو بادشاہ کی قسم کھا کر عہد کیا۔ آٹھ مردوں، دو عورتوں، محرّر اور افسرِ عدالت کے نام بطور گواہ، دو مہریں، ماہ نسان کی ۸ ویں تاریخ جس سال سمسو اِلنا نے کسور اور سابوم کو مطیع کیا۔ (۱۶۷۲ ـ ق م)

اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ سوتی ہوئی پکڑی جاتی تو دونوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں پھینک دیا جاتا تھا لیکن شوہر اگر اپنی بیوی کو معاف کر دیتا تو بادشاہ بھی

اسے معاف کردیتا تھا (۱۲۹)

اگر شوہر لڑائی میں گرفتار ہو جاتا اور گھر میں کھانے کو ہوتا تو عورت کا فرض تھا کہ ''دوسرے گھر میں نہ جھانکے'' (دوسری شادی نہ کرے) بلکہ شوہر کا انتظار کرے لیکن گھر میں کھانے کو نہ ہوتا تو اسے دوسری شادی کا اختیار تھا۔ البتہ پہلے شوہر کے واپس آنے کی صورت میں بیوی پر لازم تھا کہ واپس چلی جائے مگر دوسرے شوہر سے جو اولاد ہوتی اس پر پہلے شوہر کا کوئی حق نہ تھا۔

مرد اور عورت دونوں کو طلاق کا حق تھا اور طلاق کی بھی باقاعدہ لکھا پڑھی ہوتی تھی۔ چنانچہ طلاق نامے کی ایک لوح برآمد ہوئی ہے جس پر لکھا ہے کہ:

''لوُتو نگ بابا نے اپنی بیوی جمیلۃ اُلیل کو طلاق دے دی۔ ایک سرکاری افسر دُگیدو نے شاہدِ عینی کی حیثیت سے عدالت میں بادشاہ کی قسم کھا کر یہ گواہی دی کہ جمیلۃ الیل نے اپنے شوہر سے میرے سامنے کہا تھا کہ اگر تم مجھے دس شیکل چاندی دے دو تو میں تم پر دعویٰ نہیں کروں گی۔''

عورت اگر اپنے شوہر کو ناپسند کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیتی کہ میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ سوؤں گی تو بلد یہ اس کے چال چلن کی جانچ کرتی اور اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ قصور عورت کا نہیں ہے تو اس کو اپنا جہیز لے کر اپنے میکے جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہ تھی لیکن بیوی اگر دائم المریض ہوتی تو شوہر کو دوسری شادی کا اختیار تھا۔ ایسی صورت میں شوہر کا فرض تھا کہ پہلی بیوی کو گھر میں رکھے اور اس کی مالی امداد کرتا رہے۔ البتہ پہلی بیوی کو اختیار تھا کہ شوہر کے گھر میں رہنے سے انکار کر دے اور اپنا جہیز لے کر اپنے میکے واپس چلی جائے۔

منگنی، مہر اور جہیز کا رواج تھا اور شوہر کو مہر کا کچھ حصہ شادی سے پہلے ادا کرنا پڑتا تھا۔ منگنی کے وقت شوہر بیہ نقدی، زیور اور تحفے تحائف لے کر سسرال جاتا تھا لیکن شادی سے پہلے اگر وہ کسی دوسری لڑکی سے محبت کرنے لگتا اور اپنے ہونے والے سُسر سے جا کر کہتا کہ میں تمہاری بیٹی سے شادی نہیں کروں گا تو سُسر کو اختیار تھا کہ وہ اس آدمی کی لائی ہوئی چیزوں کو

واپس نہ کرے۔

اس کے برعکس اگر لڑکی کے باپ نے ارادہ بدل دیا ہوتا اور لڑکے سے کہتا کہ میں اپنی بیٹی تمہارے ساتھ نہیں بیاہوں گا تو اسے منگیتر کے سامان کا دُگنا سامان واپس کرنا ہوتا۔

جہیز عورت کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد جہیز کی چیزوں پر نہ عورت کے باپ کا حق ہوتا تھا نہ شوہر کا بلکہ وہ چیزیں عورت کی اولاد کو ورثے میں ملتی تھیں لیکن عورت اگر لاولد مر جاتی تو جہیز اس کے باپ کو واپس مل جاتا تھا۔ بشرطیکہ باپ اپنے داماد کو شادی کی قیمت ادا کر دیتا۔ اگر لڑکی کا باپ یہ رقم واپس نہ کرتا تو شوہر کا فرض تھا کہ جہیز میں سے یہ رقم وضع کر لے اور بقیہ جہیز اپنے سُسر کو واپس کر دے۔

باپ کی جائیداد میں بیٹوں کا حق مساوی تھا۔ البتہ باپ اگر اپنے سب سے بڑے بیٹے کے نام پیدائش کے وقت کوئی باغ، کھیت یا مکان لکھ دیتا اور دستاویز پر مہر لگ جاتی تو ہبہ شدہ جائیداد پر دوسرے بھائیوں کا کوئی حق نہ ہوتا لیکن شادی شدہ بھائیوں کا فرض تھا کہ بن بیاہے بھائی کو جائیداد میں مساوی حق دینے کے علاوہ اتنی رقم مزید دیں کہ وہ اپنی شادی کی رقم ادا کر سکے۔

سوتیلے بھائیوں کا حق (اگر ایک باپ کی اولاد ہوں) مساوی تھا لیکن سوتیلی ماؤں کے جہیز میں سوتیلے بیٹوں کا حق نہ تھا۔

باپ بیٹے کو عاق کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے عدالت کی اجازت ضروری تھی۔ عدالت کی تحقیقات کے بعد اگر بیٹا بے قصور ثابت ہوتا تو باپ کی درخواست نامنظور کر دی جاتی تھی۔ پہلے قصور پر عدالت بیٹے کو متنبہ کر دیتی تھی لیکن دوسرے قصور پر باپ بیٹے کو عاق کر دینے کا مجاز تھا۔

آقا اپنی کنیز کے ساتھ بلا شادی کے ہم بستری کرنے کا مجاز تھا۔ اگر آقا کے نطفے سے اولاد ہو جاتی اور آقا نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی کنیز کی اولاد کو ''میرے بچے'' کہہ کر پکارا ہوتا تو باپ کے مرنے کے بعد منکوحہ بیوی اور کنیز کی اولاد کو جائیداد میں مساوی حصہ ملتا تھا۔

لیکن آقا نے اگر کنیز کی اولاد کو اپنی اولاد کہہ کر نہیں پکارا تھا تو وہ وراثت کی مستحق نہیں ہوتی تھی۔ البتہ آقا کے مرنے کے بعد کنیز اور اس کی اولاد آزاد کر دی جاتی تھی اور آقا کی اولاد

کو کنیز یا اس کی اولاد پر کوئی حق نہ ہوتا تھا۔

بیوہ عورت کو اپنے شوہر کے مکان میں تاحیات رہنے کا حق تھا اور بیٹے اسے نکال نہیں سکتے تھے اور نہ مکان کو اس کی زندگی میں فروخت کر سکتے تھے۔ شوہر کی جائیداد میں اس کا بھی ایک حصہ ہوتا تھا۔ اگر بیٹے اسے تنگ کرتے اور گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے تو عدالت کا فرض تھا کہ معاملے کی تحقیقات کرے اور الزام ثابت ہونے پر بیوہ کے حق میں فیصلہ دے تا کہ لڑکے اسے گھر سے بے گھر نہ کر سکیں۔

غلاموں کی زندگی ویسی ہی تھی جیسے حمورابی سے قبل یا بعد غلاموں کی زندگی ہوتی تھی۔ البتہ ان کی خرید و فروخت کے کچھ قاعدے تھے جو حمورابی سے پہلے بھی رائج تھے۔ معاہدے کی ایک لوح سے ان قاعدوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس لوح میں لکھا ہے کہ:

''وامق۔ مرڈک ولدِ لیت عِشتار ساکن شہر اُرسوم کی ایک کنیز مسماۃ عین العاش کو ائسر یا ولد ورازا نے اس کے مالک وامق مرڈک ولد لیت عِشتار سے خریدا۔ اس کی پوری قیمت ۵/۶ مینا، شیکل چاندی نقد ادا کر دی اور ۲/۳ شیکل چاندی مزید ادا کی۔

تین دن تحقیقات کے لیے دیے گئے اور ایک ماہ کی مدت مرگی کی جانچ کے لیے۔

حسبِ ضابطہ قانون شہنشاہ (حمورابی)

پانچ آدمی اور محرر کے نام بطور گواہ۔ ماہِ کسلیم کی پندرھویں تاریخ (جس سال بادشاہ امی وتانا اپنا مجسمہ لایا) (۱۶۱۲۔ق م)''

غلام مردوں کو آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت تھی اور اگر اس رشتے سے اولاد ہو جاتی تو وہ آزاد تصور کی جاتی تھی۔ غلام کا مالک غلام کی اس اولاد کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔

بیوہ عورت کو بھی دوسری شادی کا اختیار تھا لیکن بچے چھوٹے ہوتے تو اسے عدالت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ اگر متوفی شوہر صاحبِ جائیداد ہوتا تو بھی عدالت معاملے کی جانچ کرتی اور دوسرے شوہر کو جائیداد کا متولی مقرر کرتی اور شوہر اور بیوی دونوں کو عدالت کے روبرو تحریری اقرار نامہ دینا پڑتا تھا کہ وہ جائیداد کی حفاظت کریں گے اور متوفی کی اولاد کی مناسب پرورش کریں گے اور گھر کی کوئی چیز فروخت نہیں کریں گے۔

بیوہ عورت دوسری شادی کے وقت اپنا جہیز نئے شوہر کے گھر لے جاسکتی تھی لیکن اسے شادی کے وقت دیے گئے دوسرے تحفے اپنے پہلے شوہر کی اولاد کے پاس چھوڑنا پڑتے تھے۔

بیٹی کو باپ کی جائیداد میں بیٹوں کے برابر حصہ ملتا تھا لیکن وہ اس جائیداد کو رہن یا بیچ نہیں کرسکتی تھی اور نہ یہ جائیداد اس کی اولاد کو ورثے میں ملتی تھی بلکہ اس کی وفات کے بعد یہ جائیداد اس کے بھائیوں میں تقسیم ہوجاتی تھی۔

حمورابی کے زمانے میں جرّاحی کے فن نے بڑی ترقی کرلی تھی۔ چنانچہ ضابطے میں اس فن کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ آنکھوں کا آپریشن بھی ہوتا تھا مگر ضابطے کے بموجب آنکھ کھولنے کی اُجرت مریض کے حسبِ استطاعت مقرر کی گئی تھی۔ اشراف سے دس شیکل چاندی، عام لوگوں سے پانچ شیکل اور اگر غلام کی آنکھیں ہوتیں تو غلام کے مالک کو دو شیکل دینے پڑتے تھے لیکن آپریشن کے باعث اگر مریض کی موت واقع ہوجاتی یا آنکھوں کے آپریشن کی وجہ سے بینائی ضائع ہوجاتی تو ڈاکٹر کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا البتہ مریض اگر غلام ہوتا تو پھر ڈاکٹر کو اس کے عوض ایک عدد غلام فراہم کرنا پڑتا تھا اور اگر غلام کی آنکھ آپریشن سے ضائع ہوجاتی تو ڈاکٹر کو اس کے عوض ایک عدد غلام فراہم کرنا پڑتا تھا اور اگر غلام کی آنکھ آپریشن سے ضائع ہوجاتی تو ڈاکٹر کو غلام کی نصف قیمت چاندی میں ادا کرنی پڑتی تھی۔

ہڈی جوڑنے کا معاوضہ اشرافیہ سے پانچ شیکل چاندی، عوام سے تین شیکل اور غلام کے مالک سے ۲ شیکل تھا۔ مویشیوں کا علاج کرنے والے پیشہ ور ڈاکٹر بھی ہوتے تھے چنانچہ ضابطے میں ان کی فیس بھی درج ہے۔ بیل یا خچر کے آپریشن کی اُجرت ۱/۴ شیکل لیکن آپریشن کی وجہ سے جانور مر جاتا تو جرّاح صاحب کو مویشی کی چوتھائی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔

نیا مکان اگر معمار کی غلطی یا لاپروائی سے گر جاتا اور مالکِ مکان کا سامان ضائع ہوجاتا تو معمار کا فرض تھا کہ مکان کو دوبارہ اپنے خرچ سے تعمیر کرے۔

اور ضابطہ قانون کا اختتام حمورابی نے خودستائی کے ان کلمات پر کیا ہے۔

میں نے دشمن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیا

میں نے جنگ کا خطرہ مٹادیا۔

میں نے ملک کی فلاح و بہبود کو فروغ دیا۔
میں نے اپنی رعایا کو پُر امن بستیوں میں آباد کیا
تا کہ وہ دوستانہ زندگی بسر کر سکیں۔
کسی کی مجال نہ تھی جو اُن پر دھونس جماتا۔
عظیم دیوتاؤں نے مجھے حکم دیا
پس میں وہ مہربان گڈریا بنا جس کے عصا میں خیر ہے۔
میرا سایۂ رحمت میرے شہر پر ہے
میں نے ارضِ سومیر و عکاد کے باشندوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔
میری حفاظت میں وہ خوش حال ہوئے اور پھلے پھُولے۔
میں نے ان پر امن سے حکومت کی اور
میں نے اپنی طاقت سے انھیں ہر آفت سے بچایا

قانون سے زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا عدالتی مقدموں کا مطالعہ ہوتا ہے کیونکہ مقدموں میں قانون کی خشک زمین کے برعکس زندہ انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی غالباً عدالت کے اہم فیصلوں کی اشاعت کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسی ہزاروں لوحیں برآمد ہوئی ہیں جن پر عدالت کے فیصلے درج ہیں۔ ہم یہاں دو فیصلے نقل کرتے ہیں:

''حمازی رَم بنت ابی خر نے منوتوم بنتِ عبدراہ کے خلاف اس کے ایک مکان کے بارے میں جو دُرُوم الشوم میں واقع ہے ملکیت کا دعویٰ کیا۔ اس پر معبد شمس کے ججوں نے منوتوم بنتِ عبدِراہ کا حلفی بیان معبد میں لیا۔ جب منوتوم نے آیا دیوی کی قسم کھائی تو حمازی رم نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ فیصلہ ہوا کہ حمازی رم اب اس مکان کی ملکیت یا وراثت کے بارے میں آئندہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گی۔
(اس کے آگے دو ججوں کے اور محرّر کے جو عورت تھی نام اور مہریں کندہ ہیں۔)''

تین بھائی ایک کنیز کے لیے آپس میں لڑنے لگے۔ بات عدالت تک پہنچی عدالت نے تحقیقات کی اور یہ فیصلہ صادر کیا۔

ہویا کے بیٹے طرمیاہ، شکریہ اور کولاہوپی، نوزی کی عدالت میں ایک مقدمے میں طلب کیے گئے۔ یہ مقدمہ سولولی عشتار نامی ایک کنیز کی ملکیت کے بارے میں تھا۔ طرمیاہ نے عدالت میں یہ بیان دیا کہ میرا باپ ہویا بستر پر بیمار پڑا تھا تب میرے باپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میرے دونوں بڑے بیٹوں کی تو شادی ہو چکی ہے ان کو بیویاں مل گئی ہیں لیکن تجھے بیوی نہیں ملی ہے لہٰذا میں سولولی عشتار کو تجھے بطور تیری بیوی کے دیتا ہوں۔ تب عدالت نے طرمیاہ کے گواہ طلب کیے اور ان کے بیان لیے اور شکریہ اور کولاہوپی کو حکم دیا کہ طرمیاہ کے گواہوں کے خلاف حلف اٹھائیں لیکن شکریہ اور کولاہوپی دیوتاؤں سے ڈر گئے۔ پس طرمیاہ مقدمہ جیت گیا اور سولولی عشتار اس کے حوالے کر دی گئی۔

تین آدمیوں کے نام اور ان کی مہریں اور ایلیا کے دستخط

انیسواں باب

بابل کا عہدِ زرّیں

عظمتِ بابل کا حرفِ آغاز حمورابی تھا اور نقطۂ عروج بخت نصر۔ یہ درست ہے کہ بابل کلدانیوں کے اقتدار سے پہلے بھی مرجعِ خاص و عام تھا اور اس کے تقدس کا سکہ دور دور تک چلتا تھا لیکن اس شہرِ بے مثال کو "ملکوں کی ملکہ" بختِ نصر ہی نے بنایا۔ بخت نصر کے زمانے میں بابل کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ تھی اور وہ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے پرشوکت شہر خیال کیا جاتا تھا۔ علم و حکمت میں بھی بابل کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور حساب، الجبرا، طب، کیمیا اور انجم شناسی کے ہنر میں بابل کے صاحبانِ کمال کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

وادیِ دجلہ و فرات کا قدیم معاشرہ اور اس کے رسم و رواج مدت گزری ختم ہو گئے۔ بابل کے محلات و معابد مٹنے والی چیزیں تھیں سومٹ گئیں لیکن علم فنا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بابل ہی کی شمعِ علم تھی جس سے یونانی دانش کدوں کے چراغ روشن ہوئے۔ افسوس یہ ہے کہ کلدانیوں کی افسوں طرازی اور غیب دانی کی شہرت نے صدیوں تک ان کی علمی خدمات پر پردہ ڈالے رکھا اور دنیا یہی سمجھتی رہی کہ علم و تہذیب کا آفتاب سب سے پہلے یونان کے افق سے ابھرا، حالانکہ یونان کی سائنس، طب، مذہب، فلسفہ، سب نے بابل ہی کے چشمۂ فیض سے اکتساب کیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ بابلی معاشرہ توہّم پرستیوں سے آزاد تھا یا اہلِ بابل کی معیشت کی بنیاد سائنس پر قائم تھی یا وہ ایٹم بم اور ہوائی جہاز بنانے کا فن جانتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ توہم پرستیوں کے باوجود وادیِ دجلہ و فرات کے دانش وروں میں ایک سائنسی اندازِ فکر ضرور موجود تھا۔

اہل بابل کی ذہانت، صناعی اور ہنرمندی کا ذکر ہم اس سے پہلے بھی کر چکے ہیں لیکن کسی

فن میں مہارت پیدا کر لینا اور بات ہے اور اس فن کے پیچھے جو سائنسی عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان کا شعور دوسری بات ہے۔ مثلاً سونار معدنیات کی کیمیاوی خصوصیتوں سے تو بخوبی آگاہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے تجربوں کی بنا پر کیمیا کا کوئی قانون وضع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اچھے سے اچھا کمان ساز یہ نہیں بتا سکتا کہ کمان کو اپنی طرف کھینچنے اور تیر کو دور پھینکنے کے بہ ظاہر متضاد عمل میں حرکت کا کون سا قانون پوشیدہ ہے۔ دست کار ''کیسے''، ''کب'' اور ''کیا'' کا جواب تو دے سکتا ہے لیکن ''کیوں'' کے جواب سے عموماً عاجز ہوتا ہے کیونکہ اس کی ساری صناعی فقط تجرباتی ہوتی ہے اور وہ انھیں تجربات کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔

یہ درست ہے کہ وادیِ دجلہ و فرات کے کاریگر خواہ وہ سونار ہوں یا معمار، پارچہ باف ہوں یا سنگ تراش، اشیا کا فقط تجرباتی علم رکھتے تھے لیکن اشور بنی پال کے کتب خانے اور نیفر، اشورہ، بابل اور اُریک کی کھدائیوں میں بہ کثرت ایسی لوحیں ملی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطے کے پڑھے لکھے لوگوں نے (جو تعداد میں بہت کم تھے) اپنے تجربوں کی بنا پر چند سائنسی اصول اور قوانین بھی وضع کر لیے تھے اور بعض علوم تو ایسے ہیں جن کی ایجاد کا سہرا انھیں قدیم دانشوروں کے سر ہے۔ ان میں سب سے اہم حساب کا فن تھا جس کے بغیر ہیئت و نجوم، کیمیا، طب اور دوسرے علوم کی تدوین ناممکن تھی۔

ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ انسان نے چیزوں کو گننا اور وزن کرنا کب اور کہاں شروع کیا یا وقت اور فاصلے کی پیمائش کا آغاز کب اور کہاں ہوا کیونکہ حجری دور کے غاروں میں اب تک ایسے آثار نہیں ملے ہیں جن سے ابتدائی انسان کی حساب دانی پر روشنی پڑ سکے۔ ممکن ہے کہ اس عہد کے انسان کے ذہن میں وقت، فاصلے اور وزن اور تعداد کا دُھندلا تصور موجود ہو لیکن اس کی سماجی زندگی کا انحصار ان تصورات پر نہ تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے ہر فرد کو جانتا پہچانتا تھا۔ وہ اپنے ریوڑ کے ہر جانور کو آسانی سے شناخت کر سکتا تھا۔ اسے ناپ تول کرنے یا چیزوں کی آمد و خرچ کا حساب رکھنے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ البتہ جب اس نے سفری زندگی ترک کر کے حضری اور زرعی زندگی اختیار کی اور اپنے ذاتی مصرف سے زیادہ چیزیں پیدا کرنے لگا اور ان چیزوں کی خرید و فروخت ہونے لگی تو سماجی ضرورتوں نے انسان کو لامحالہ وزن، پیمانے اور

گنتی کے طریقے ایجاد کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ گنتی کرنے کی مٹی کی گولیاں اور تولنے کے باٹ ان قدیم تہذیبوں کے آثار میں بھی ملے ہیں جو فنِ تحریر سے غالباً واقف نہ تھیں (وادیٔ سندھ کی تہذیب) حقیقت یہ ہے کہ انسان نے وزن اور گنتی کا علم فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے سیکھ لیا تھا بلکہ خود فنِ تحریر کی ابتدا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں حساب دانی ہی کی مرہونِ منت ہے۔

سومیر اور عکاد کے پروہت اپنے مندروں کی آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ ابتدا میں تو انھوں نے اشیا کی تصویروں سے ہندسوں کا کام لیا لیکن رفتہ رفتہ ہندسوں کی مجرّد علامتیں وضع کرلی گئیں۔ مثلاً (کی علامت یہ تھی نو تک یہ علامت برابر لکھی اور دہرائی جاتی تھی البتہ دس کے لیے ایک نئی علامت بنائی گئی تھی۔ بیس لکھنا ہو تو دس کی دو علامتیں اور تیس لکھنا ہو تو تین علامتیں برابر برابر دو لکھ دی جاتی تھیں۔ مگر ان لوگوں کی ترسیم اعداد NOTATION سو کے بجائے ساٹھ پر ختم ہو جاتی تھی اسی لیے بابلی نظامِ اعداد کو SEXICECIMAL کہتے ہیں۔

ساٹھ کا یہی ہندسہ وزن اور پیمائش میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً:

۱۸۰ اڑتی	=	ا۔شیکل
۶۰ شیکل	=	ا۔منا
۶۰ منا	=	ا۔ ٹیلنٹ قنطار

انھوں نے وقت کو بھی ساٹھ ہی وحدتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جس طرح ہم گھنٹے، منٹ اور دائرے کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

اہلِ بابل کی سائنسی ذہنیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اب سے ساڑھے تین ہزار برس ان کے ہندسوں کی قدریں اپنی جگہ سے متعین ہوتی تھیں۔ یعنی بابلیوں کا اصول اعداد شماری وہی تھا جو ہمارا ہے مثلاً جب وہ ۵۵۵۵ لکھتے تو سب سے بائیں جانب کے ۵ کے ہندسے کی قدر پانچ ہزار ہوتی تھی اس کے بعد کے ہندسے کی قدر ۵ سو ہوتی تھی اس کے بعد کے ہندسے کی پچاس اور سب سے دائیں جانب کا ہندسہ اپنی حقیقی قدر کی نمائندگی کرتا تھا حالانکہ رومن ہندسے آج تک مساوی القدر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہم رومن میں XXX لکھتے ہیں تو ان تینوں ہندسوں کی قدریں دس ہی ہوتی ہیں اور ان کی مجموعی قدر فقط تیس ہوتی ہے۔ مختلف القدر

ہندسوں کا اصول وضع کرنا اہلِ بابل کا عظیم کارنامہ ہے۔ وہ لوگ کسر اور عدد صحیح کے علاوہ جوڑ باقی ضرب تقسیم اور سُود در سُود سے بھی بخوبی واقف تھے۔

نیفر اور دوسرے مقامات سے ۱۸ ویں صدی قبلِ مسیح کی علمِ حساب کی جو لوحیں ملی ہیں ان کی کل تعداد تین سو کے قریب ہے۔ ان میں ایک سو لوحوں پر تو حساب کے مختلف مسائل اور ان کے حل لکھے ہیں اور دو سو پر حساب کے مختلف جدول بنے ہیں مگر ان لوحوں پر صفر کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ بابل کم از کم اٹھارویں صدی قبلِ مسیح تک صفر کے استعمال سے ناواقف تھے۔

صفر کی ایجاد ذہنِ انسانی کا بڑا انقلابی کارنامہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ عدم کو وجود کے روپ میں، نفی کو مثبت کی علامت کی شکل میں اور "نہیں" کے مجرّد تصور کو ایک حقیقی پیکر میں پیش کرنے کے لیے بڑی فلسفیانہ بصیرت اور سائنسی سوچ درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب، یونان اور ہند سبھی کا دعویٰ ہے کہ صفر کا ہندسہ ہم نے ایجاد کیا لیکن ہخامنشی اور سلوکی عہد کی بابلی لوحوں کی دستاویزی شہادتوں سے ان بے بنیاد دعوؤں کی تردید ہوجاتی ہے چنانچہ پروفیسر نوگے نوگے باور اور پروفیسر وولی جیسے ماہرینِ آثار نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندسہ صفر کے موجد درحقیقت اہلِ بابل ہی ہیں۔ بابلی لوحوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ بابل ابتدا میں صفر کی علامت "O" کو بطور وقفۂ قلیل (COMA) استعمال کرتے تھے مگر دارائے اعظم (۵۰۰ ق۔م) کے زمانے میں یہ علامت دو ہندسوں کے درمیان بطور ہندسہ استعمال ہونے لگی اور اس کی قدر بھی اپنی جگہ کے اعتبار سے متعین کی جانے لگی اور تین سو قبلِ مسیح میں صفر کا ہندسہ پورے ملک میں باقاعدہ رائج ہوگیا۔ پروفیسر نُوگے باور نے ایک مصری قرطاس کا بھی ذکر کیا ہے جس پر صفر کا ہندسہ صاف پڑھا جاتا ہے لیکن یہ قرطاس دوسری صدی عیسوی کی تحریر ہے۔ اُن دنوں مصر میں بطلیموس کا یونانی خاندان فرماں روا تھا۔ (مصر کے مشہور حساب داں بطلیموس کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔

مگر اہلِ بابل نے حساب سے زیادہ الجبرا کو فروغ دیا۔ چنانچہ حمورابی (اٹھارویں قبلِ مسیح) کے عہد کی کئی لوحیں ملی ہیں جن پر مربع، جذر، جذر الکعب، مکعب، اور مساوات وغیرہ کی مشقیں کی گئی

ہیں۔ یہ لوحیں اعلیٰ جماعت کے طلبا کی درسی مشقیں ہیں۔ اس وقت حساب کی با قاعدہ کتابیں نہ ہوتی تھیں اس لیے استاد مشقوں اور مسئلوں کے ذریعے سبق دیتے تھے۔ مثلاً ایک لوح پر الجبرے کا یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے۔ میں نے چوڑائی کو لمبائی سے ضرب دیا۔ تب میں نے لمبائی اور چوڑائی کے فرق کو رقبے میں جمع کر دیا تو ۱۸۳ ہوئے۔ تب میں نے لمبائی اور چوڑائی کو جمع کیا تو ۲۷ ہوئے۔ لمبائی چوڑائی اور رقبہ بتاؤ۔ الجبرے کی رُو سے آج اس مسئلے کو یوں لکھیں گے۔

اب+اب	=	۱۸۳
+ب	=	۲۷

اس مسئلے کا حل بھی لوح پر درج ہے۔

یہ لوگ ۲ کا قریب قریب صحیح جذر نکال لیتے تھے۔ البتہ علم ہندسہ یعنی جیومیٹری سے انھیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے حکیم فیثا غورث سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے جیومیٹری کی وہ شکل بنائی تھی جو جیومیٹری میں فیثا غورث تھیورم (شکل) کے نام سے مشہور ہے۔ اس شکل کے مطابق مُثلّث قائم الزاویہ کے وتر (HYPOTENUSE) کا مربّع دوسرے پہلوؤں کے مربعوں کے مساوی ہوتا ہے۔

کیلنڈر

زراعت پیشہ لوگوں کے لیے موسم کی تبدیلیوں سے آگاہی بہت ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے زرعی مشاغل موسم کی تبدیلیوں کے پابند ہوتے ہیں۔ گرمی، سردی، بارش، سیلاب اور بہار وخزاں کی آمد و رفت اور دن کا چھوٹا بڑا ہونا وہ تغیّرات ہیں جن پر زراعت کا انحصار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بابلی عہد میں فصلی تیوہاروں کا منانا بھی مذہبی فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پروہتوں کو ان موسمی تبدیلیوں اور تیوہاروں کا با قاعدہ حساب رکھنا ہوتا تھا۔ جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا پروہت ان چیزوں کو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے لیکن تحریر کی ایجاد کے بعد موسم کے تغیّرات اور تیوہاروں کے دن لوحوں پر لکھے جانے لگے۔ اس طرح کیلنڈر یا جنتری کی ابتدا ہوئی۔

بابلی کیلنڈر مصری کیلنڈر کے برعکس قمری تھا کیونکہ پروہت اپنے روزمرّہ کے مشاہدے

سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بارھویں رویتِ ہلال کے وقت وہی موسم ہوتا ہے جو پہلی رویتِ ہلال پر تھا لہٰذا انھوں نے سال کو ۱۲ مہینوں میں تقسیم کیا اور رویتِ ہلال کے مطابق مہینے کو بھی ۲۹ اور ۳۰ دن کا قرار دیا (ہمارے قمری مہینوں میں بھی یہی ہوتا ہے)۔ حمورابی سے پہلے شہری ریاستوں میں مہینے کے نام جدا جدا ہوتے تھے لیکن حمورابی نے سلطنت میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر ہر جگہ مہینوں کے نام ایک ہی کر دیے۔ یہ نام یہودیوں میں اب تک رائج ہیں۔

(۱) تشری	(۷) نِسان
(۲) مارحشوان	(۸) ایار
(۳) کِسلو	(۹) سوان
(۴) تیبت	(۱۰) تموز
(۵) شبات	(۱۱) آب
(۶) ادار	(۱۲) ایلولی

چونکہ چاند کے چار دور ہوتے ہیں (ہلال، آدھا چاند) اس لیے مہینے کو چار ہفتوں میں اور ہفتے کو سات دن میں تقسیم کر لیا گیا۔ البتہ نئے دن کا آغاز غروبِ آفتاب سے ہوتا تھا۔

لیکن جب تجارت اور ساہوکاری نے فروغ پایا تو قمری تقویم کی خرابیاں ظاہر ہونے لگیں۔ بات یہ ہے کہ قمری سال فقط ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے یعنی شمسی سال سے تقریباً ۱۱ دن کم۔ پس ہر تین سال کے بعد دونوں میں ۳۳ دن اور ہر بارہ سال کے بعد ۱۳۲ دن یعنی چار ماہ سے زائد کا فرق ہو جاتا ہے۔ اہلِ بابل کو اس کی وجہ سے سُود کی ادائیگی اور تجارتی معاہدوں کی مدّت متعین کرنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔ چنانچہ کاروباری ضرورتوں کی خاطر قمری کیلنڈر کے پہلو بہ پہلو شمسی کیلنڈر نے بھی رواج پایا۔ شمسی سال کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی کیونکہ زمین پورے ۳۶۵ دن میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ شمسی کیلنڈر موسم کا پابند ہوتا ہے حالانکہ قمری کیلنڈر کا موسم سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم بڑی آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ ۱۰۰۰ء کے جون میں موسم کیسا تھا (گرمی) لیکن ہم شمسی کیلنڈر کی مدد کے بغیر یہ نہیں بتا سکتے کہ ۱۰۰۰ء کے رمضان میں سردی تھی یا گرمی۔ یوں بھی سلطنتِ

بابل کے قیام کی وجہ سے چاند دیوتا کی اہمیت گھٹ گئی تھی اور سورج کا (جو بابل کے دیوتا مرڈک کی علامت تھا) اقتدار بڑھ گیا تھا۔ یہ شمسی سال موسمِ بہار میں (نِسان) جشنِ نوروز سے شروع ہوتا تھا۔

لیکن بابلی سن ہمارے زمانے کے عیسوی، ہجری یا فصلی سن کے مانند کسی خاص وقت سے شروع نہ ہوتا تھا بلکہ ہر نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے نئے سن کا آغاز ہوتا تھا (عہدِ مغلیہ کے سنِ جلوس کی طرح) اس کی وجہ سے سنوں میں کوئی تسلسل قائم نہیں ہوسکتا تھا اور نہ یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ فلاں واقعہ اب سے اتنے برس پہلے پیش آیا تھا۔ اس خرابی کی مثال بتوندس کی وہ لوح ہے جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ نارم سین ابنِ شرقین مجھ سے ۳۲ ہزار برس پہلے حکومت کرتا تھا حالانکہ نارم سین بتوندس سے فقط ۳۱۸ برس پہلے گزرا تھا۔

علمِ ہیئت

یونان کے سب سے پہلے فلسفی اور سائنس دان طالیس کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے ۵۸۵ ق۔م کے سورج گہن کی صحیح پیشین گوئی کی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس وقت یونان (ایشیائے کوچک) اور ایران کی فوجوں میں لڑائی ہورہی تھی اور میدانِ کارزار گرم تھا کہ اتنے میں سورج میں گہن لگا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ فوج کے سپاہی ہیبت سے کانپ گئے اور فریقین نے اس خوف سے صلح کرلی کہ خدا نے گہن کے ذریعے اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ہیرو ڈوٹس اور دوسرے یونانی مورخین نے طالیس کی پیشین گوئی کا واقعہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور طالیس کی ہیئت دانی کو خوب خوب سراہا ہے لیکن اہلِ بابل کے لیے طالیس کی یہ پیشین گوئی کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھی کیونکہ ان کے ہیئت داں طالیس سے کم از کم ہزار برس قبل چاند گہن اور سورج گہن کے بارے میں پیشین گوئی کرنے پر قادر ہوچکے تھے۔ اس کا اعتراف دانایانِ مغرب کو بھی ہے۔ چنانچہ پروفیسر کرک اور پروفیسر رے ون نے اپنی عالمانہ تصنیف ''فلسفیانِ قبل از سقراط'' میں لکھا ہے کہ:

> ''بابلی پروہتوں نے سورج گہن جزوی اور کلّی کے بارے میں کم از کم ۷۲۱ ق۔م سے مذہبی ضروریات کے تحت پیشین گوئیاں شروع کردی تھیں اور چھٹی

صدی میں تو وہ یہ بھی بتا دیتے تھے کہ گہن کن کن مقامات پر نظر آئے گا۔ یہ بات نہایت اغلب ہے کہ طالیس کے اس کارنامے کا ماخذ بابلی دستاویزات ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اکثر تعلیم یافتہ یونانی اس زمانے میں ساردس (ایشیائے کوچک) کی یونانی ریاست لڈیا کا دارالسلطنت) ضرور جاتے تھے اور بابل اور یونان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔"

بابل کے پروہت حساب اور ہیئت کی مدد سے گہن کے بارے میں پیشین گوئی تو صحیح صحیح کرتے تھے لیکن علم کی عیاریاں دیکھو کہ لوگوں کے سامنے وہ گہن کی تاویل مذہبی انداز ہی میں کرتے تھے۔ گہن کے طبعی اسباب بیان کرنے کے بجائے وہ عوام کو یہی بتاتے تھے کہ اس وقت سورج (یا چاند) دیوتا بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کسی عفریت نے ان پر حملہ کر دیا ہے لہٰذا تم لوگ خدا سے دعا مانگو اور بھینٹ چڑھاؤ اور خیرات دو اور خوش عقیدہ لوگ جو اجرامِ فلکی کے قانون سے ناواقف ہوتے تھے گہن کے بھیانک منظر سے ڈر کر پروہتوں کی ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ یہ تو خیر اس زمانے کی باتیں ہیں جب علمِ ہیئت عام نہیں ہوا تھا بلکہ پروہتوں کی خالص اجارہ داری تھا مگر مشرق کے لاکھوں کروڑوں توہم پرست انسان تو آج بھی گہن کو عذابِ الٰہی خیال کرتے ہیں اور اس عذاب سے بچنے کے لیے دریا میں نہاتے ہیں، دعائیں پڑھتے ہیں اور صدقے اتارتے ہیں۔

نیفر میں گیارھویں صدی قبلِ مسیح کی جو لوحیں ملی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بابلی ہیئت داں اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اجرامِ فلکی کا فاصلہ زمین سے مساوی نہیں ہے بلکہ مختلف ہے اور ان فاصلوں کی پیائش کی جا سکتی ہے۔ ان کے حساب کے مطابق اجرامِ فلکی آٹھ تھے اور ان میں چاند زمین کے سب سے قریب تھا۔ آسمان کے تین منطقے تھے اور ہر منطقہ بارہ حصوں میں یا دائرے میں بٹا ہوا تھا اور ہر منطقے کے اپنے چند مخصوص سیارے اور تارا منڈل تھے۔ انھوں نے راس منڈلی بھی تیار کر لی تھی (۴۱۹ ق۔م)۔ اس راس منڈل میں تیس تیس زاویے کے بارہ بُرج تھے۔ یہ وہی راس منڈل ہے جو ہمیں اب تک جنتریوں کے سرورق پر نظر آتا ہے اور جس میں بارہ برجوں کے بارہ ستاروں کے نام اور ان کی حیوانی شکلیں بنی ہوتی ہیں۔

جغرافیہ

دجلہ وفرات کا خِطّہ جغرافیائی اعتبار سے مہذّب دنیا کے وسط میں واقع تھا۔ مغرب میں مصر، کنعان اور عرب کے علاقے تھے۔ شمال میں ایشیائے کوچک اور بحرِروم کے ساحلی ملک تھے۔ مشرق میں ایران، چین اور ہندوستان تھے اور جنوب میں بحرِ ہند کے ساحلی علاقے۔ بابل اور نینوا کے شہران سب ملکوں کی تجارتی گزرگاہ تھے۔ پس اس خطّے کے باشندوں کے تجارتی اور سیاسی مفاد انھیں گردوپیش کے بھی ملکوں کے جغرافیائی حالات سے باخبر ہونے پر مجبور کرتے تھے۔

جغرافیے سے متعلق جو لوحیں برآمد ہوئی ہیں ان پر مختلف ملکوں، شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام اور ان کی جائے وقوع کندہ ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اہلِ بابل کو قطبِ شمالی کا بھی دُھندلا سا علم تھا۔ چنانچہ ایک لوح پر کرۂ شمالی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں سال میں دس مہینے سورج کا گزر نہیں ہوتا۔ چھٹی صدی قبلِ مسیح کی ایک لوح پر دنیا کا نقشہ بنا ہے۔ اس نقشے میں دنیا کی سطح چپٹی دکھائی گئی ہے۔ ایک ''دریائے تلخ'' کرۂ ارض کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دریائے فرات دنیا کے بیچوں بیچ سے بہتا ہے اور نقشے کے چاروں کونوں پر بعض غیر معروف ملکوں کے نام درج ہیں۔ ''جہاں سورج دکھائی نہیں دیتا۔'' غالبًا یہ دنیا کا سب سے پرانا نقشہ ہے حالانکہ اب تک عام خیال یہی ہے کہ پہلا نقشہ یونانی مفکر آناکسی ماندر (ANA XIMANDER) نے بنایا تھا۔ وہ ایشیائے کوچک کے ساحلی شہر ملےتس (MILETUS) کا رہنے والا تھا۔ کیا عجب ہے کہ بابلی نقشے اس کی نظر سے گزرے ہوں اور اس نے ان کی مدد سے اپنا نقشہ مرتّب کیا ہو۔ عالمی نقشے کے علاوہ شہروں اور کھیتوں کے قدیم نقشے بھی ملے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور شہر نیفر کا نقشہ ہے جس کی لوح اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ یہ نقشہ غالبًا ۱۵۰۰ قبلِ مسیح میں بنایا گیا تھا۔ شہر نیفر کی کُھدائی سے اس نقشے کی صحت کی تصدیق بھی ہوگئی ہے۔

طِب اور جرّاحی

لاکھوں برس تک انسان کی واحد غذا جنگلی پھل پھول اور سبزیاں تھیں۔ اس سلسلے

میں انسان نے ابتدا میں نہ جانے کتنے مہلک پھل پھول چکھے ہوں گے اور نہ جانے کتنی زہریلی پتیاں اور جڑیں چبائی ہوں گی تب وہ اپنے غلط اور صحیح تجربوں کی بنا پر حیات بخش غذاؤں کا انتخاب کر سکا ہوگا۔ انھیں تجربوں کے دوران میں انسان کو مختلف جڑی بوٹیوں اور دھاتوں کی طبّی تاثیروں کا علم بھی ہوا اور وہ ان چیزوں سے، جادو منتر سے قطعِ نظر، اپنی بیماریوں کا علاج کرتا رہا لہٰذا ہمیں اپنے پرُکھوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر مجرّب دواؤں کا نہایت بیش قیمت اثاثہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ آج بھی ہماری بیش تر دواؤں کی اساس وہی جڑی بُوٹیاں اور دھاتیں ہیں جن کی طبّی تاثیر قدما نے دریافت کی تھی۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ سومیری زبان میں دوا اور جڑی بوٹیوں کے لیے ایک ہی لفظ مستعمل تھا۔ سَمُو۔ اسی طرح طبیب، غیب داں اور محرر تینوں کو آزو کہتے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ اس زمانے میں علم بہت محدود تھا اور علم سے آگہی رکھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہوتی تھی اس لیے ایک ہی شخص طبیب، شاعر، نجومی اور مذہبی رہنما سبھی کچھ ہوتا تھا۔ پس ماندہ قوموں میں آج بھی ایک ہی شخص قبیلے کے طبیب، شاعر، پروہت اور مشیرِ خاص کے فرائض انجام دیتا ہے۔

ابتدا میں طب کا علم شاید مذہب اور جادو منتر سے آزاد تھا۔ چنانچہ تین ہزار قبلِ مسیح کی طبّی لوحوں میں دیوی دیوتاؤں کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ دواؤں اور ان کی تاثیر کا تذکرہ خالص طبعی انداز میں کیا گیا ہے۔

نیفر کے کھنڈروں سے اسی زمانے کی ایک چھوٹی سی لوح ملی ہے جس پر کسی نامعلوم طبیب نے اپنے ایک درجن سے زائد مجرّب نسخے لکھے تھے۔ اس نے اپنے علم کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے نسخوں پر یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کس مرض کی دوا ہیں اور نہ دواؤں کے وزن دیے ہیں مگر دواؤں سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ عکاد و سومیر اب سے چار ہزار برس پہلے نباتات اور معدنیات کی طبّی تاثیر سے بخوبی آگاہ تھے۔ مثلاً ہمارے گمنام طبیب کے نسخے میں نمک اور شورے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ وہ دودھ، سانپ کی کھال اور کچھوے کی کھوپڑی کا بھی استعمال جانتا ہے لیکن اس کی اکثر دوائیں نباتاتی ہیں۔ ان میں حنا، املتاس، تیزپات، جھاؤ، انجیر، ناشپاتی اور کھجور

اس کی محبوب دوائیں ہیں۔ وہ مفرّدات اور مرکّبات دونوں کا استعمال جانتا ہے اور ان کو بنانے کی ترکیب بتاتا ہے۔ وہ دواؤں کو حل کرنے کے لیے پانی اور شہد سے کام لیتا ہے اور کڑوی دواؤں کو خوش ذائقہ بنانے کے لیے ان میں جو کی شراب ملا دینے کا مشورہ دیتا ہے لیکن ان نسخوں میں نہ تو کسی گنڈے تعویز کا تذکرہ ہے اور نہ کوئی منتر پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اس وقت کے اَطِبّا جادو منتر کے معتقد نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیب اور عوام دونوں کا عقیدہ یہ تھا کہ بیماری کا باعث وہ بدروحیں ہیں جو آدمی کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان کو بھگانے کے ہلیے دواؤں کے علاوہ جادو منتر بھی ضروری ہوتے ہیں۔ یہ ہتھکنڈے غالبًا طبیبوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کیے تھے۔ انھوں نے طب اور جرّاحی کی ایک دیوی بھی جس کا نام باؤتھا وضع کر لی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے طبیبوں کو اپنے عہد میں ویسی ہی بین الاقوامی شہرت حاصل تھی جیسی لندن یا سوئیزرلینڈ کے طبیبوں کو فی زمانہ حاصل ہے۔ چنانچہ بابلی طبیبوں کو حتّیوں، کنعانیوں اور مصریوں کے دربار میں بغرضِ علاج طلب کیا جاتا تھا۔ بابل کی جو طبّی لوحیں بوغاز کائی کے مقام پر نکلی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی قبلِ مسیح کا ایک حتّی بادشاہ حکیم کدان اِن لیل سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بابلی طبیب کو واپس جانے کی اجازت نہ دی۔ تب کدانش مان اِن لیل نے اپنے بادشاہ سے فریاد کی اور بڑے نامہ و پیام کے بعد بے چارے طبیب کو پروانۂ راہ داری ملا۔

طبّی لوحوں سے بابلی فارماکوپیا کی کم از کم ۵۵۰ دواؤں کا سراغ ملتا ہے۔ ان میں ڈھائی سو نام تو جڑی بوٹیوں کے ہیں، ۱۲۰ دھاتوں کے اور ۱۸۰ دوسری چیزوں کے۔ اب تک جو نسخے دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد ۵۸۸۰ ہے۔ ۶۰۰ ۴ نسخوں میں فقط جڑی بوٹیوں کے نام ہیں۔ یہ دوائیں انگور، جوَ، چربی، دودھ اور شہد کے الکحل میں بنا کر دی جاتی تھیں۔

بابل کے اَطِبّا جسم کو سُن کرنے (تخدیر) کے لیے افیون، بھنگ، بلا ذر اور آبی شیکلوان کا استعمال کرتے تھے۔ پیٹ کے درد کا علاج اسپند اور کیمومیل سے کرتے تھے۔ مریض کو قے کروانی ہو تو سرسوں گھول کر پلاتے تھے اور سرسوں ہی کا دانہ بطور قبض کشا کھلاتے تھے۔ پولٹس

بھی سرسوں ہی کی بنائی جاتی تھی۔ بعض اوقات ہمارے شہروں کے مجمع گیر دوا فروشوں کی مانند بابل کے اَطِبّا بھی ایک ہی دوا سے مختلف امراض کا علاج کرتے تھے۔ مثلاً گیندے کا پھول بچھو کے کاٹے کا علاج بھی تھا، دانت کے درد کا بھی، یرقان اور معدے کی خرابی کا بھی اور جنسی بیماریوں کا بھی۔ اس نقص کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بابل کی جڑی بوٹیوں اور نسخوں کی مدد سے اہلِ یونان نے اپنے علمِ طب کی تدوین کی اور پھر یہی علم عربوں نے یونانیوں سے سیکھا اور مغرب نے عربوں سے حاصل کیا۔

ہم نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں حجری دور کے ایک ڈھانچے کا ذکر کیا ہے جس کی ایک ٹانگ کی ہڈی کا آپریشن کیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجری دور کا انسان جرّاحی کی مبادیات سے ضرور واقف تھا۔ حمورابی کے زمانے کی تو دستاویزیں شاہد ہیں کہ بابل میں اب سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے پیشہ ور جرّاح اور طبیب موجود تھے اور ان کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ چنانچہ حمورابی کے ضابطے میں جرّاحوں کو غلط آپریشن کرنے پر سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان سزاؤں کا مقصد دراصل مریضوں کو عطائی جرّاحوں سے محفوظ کرنا تھا مگر تھا یہ لغو قانون کیونکہ اچھے سے اچھے جرّاح کا آپریشن بھی ناکام ہوسکتا تھا۔ بابل میں جرّاحی کے فروغ نہ پانے کا بڑا سبب یہی تعزیزی قوانین تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اہلِ بابل کا علم بالخصوص سائنسی علم بہت ناقص اور خام تھا لیکن اس میں ان کے فہم وادراک کا قصور نہ تھا بلکہ یہ خرابی ان کے عہد کی تھی کیونکہ ہر عہد کی چند معاشرتی، مادّی اور ذہنی مجبوریاں ہوتی ہیں اور بڑے سے بڑا دانش ور بھی عصری حدود سے تجاوز نہیں کرسکتا۔ مثلاً حکمائے یونان پانچویں صدی قبلِ مسیح میں ایٹم کا نظریہ تو پیش کرسکتے تھے لیکن ایٹم بم نہیں بناسکتے تھے کیونکہ ان کو نہ تو ایٹم کی داخلی قوتوں کی خبر تھی نہ وہ ایٹم کے ٹکڑے کرسکتے تھے اور نہ اس زمانے میں سائنسی تکنیک موجود تھی جس کے بغیر ایٹم بم بن ہی نہیں سکتا۔ اہلِ بابل کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں سے پہلے موجودات کو سائنسی نظر سے دیکھا اور ان سے کام لینے کے لیے چند سائنسی اصول وضع کیے البتہ وہ اپنے سائنسی علم کو آگے نہ بڑھاسکے۔ اس کے اسباب معاشرتی تھے۔

بابلی تہذیب تقریباً تین ہزار سال تک زندہ رہی، اس کا زوال تو ہخامنشی عہد ہی میں شروع ہوگیا تھا لیکن یونانی غلبے کے بعد اس میں مقابلے کی طاقت بالکل بھی نہ رہی۔ رفتہ رفتہ اس کے قویٰ مضمحل ہونے لگے اور پھر وہ مرگئی۔

مگر تہذیبیں مرتی کیوں ہیں؟ اس کا آسان جواب تو یہ ہے کہ جب بڑھاپا آتا ہے تو تہذیبیں مرجاتی ہیں مگر انسانوں کی مانند تہذیبوں کی پیرانہ سالی مہ وسال سے متعین نہیں ہوتی بلکہ ان کی حیات وموت کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ان میں معاشرے کے نئے نئے تقاضوں اور انسان کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت باقی ہے یا نہیں۔

تہذیب عبارت ہوتی ہے معاشرے کی طرزِ زندگی سے۔ اس طرز زندگی کی اساس سماجی اعمال وافکار پر ہوتی ہے، اس میں لوگوں کا رہن سہن، رسم ورواج، زبان اور مذہب، رقص اور موسیقی، آلات واوزار، دولت آفرینی کے طریقے، پیداوار کی تقسیم کے ضابطے اور نظم ونسق کے قوانین سبھی شامل ہوتے ہیں۔ درحقیقت تہذیب سماجی اقدار اور تخلیقات کا عطر ہوتی ہے۔ معاشرے کے اعمال وتخلیقات اور افکار وعقائد میں جب تک اجتہادی قوت اور ردّ وقبول کی صلاحیت باقی رہتی ہے تہذیب کا پودا بھی پھولتا رہتا ہے لیکن معاشرہ جب روایتوں کا یکسر غلام ہوجاتا ہے اور اوامر ونواہی کی بندشوں میں اپنے کو جکڑ لیتا ہے اور نئے خیالات اور تجربات سے گریز اختیار کرتا ہے تو پھر معاشرہ اور اس کی تہذیب دونوں جمود کا شکار ہوجاتے ہیں اور ان میں ترقی کی یا دوسری تہذیبوں کے مقابلے کی طاقت نہیں رہ جاتی۔ بابلی تہذیب کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ درحقیقت ہخامنشیوں یا یونانیوں کے ہاتھ ہلاک نہیں ہوئی بلکہ اس کی موت کے اسباب طبعی اور قدرتی تھے۔

بابلی تہذیب کی معاشی بنیاد دریائے دجلہ وفرات کے نہری نظام اور محکوم ملکوں کے سالانہ خراج پر قائم تھی لیکن نہری نظام کے استحکام اور محکوم ملکوں کی اطاعت گزاری کے لیے مضبوط مرکزی حکومت کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ اس کے بغیر نہ تو نہروں کی نگہداشت ممکن تھی اور نہ لوٹ مار کے لیے فوج جمع کی جاسکتی تھی۔

عکادوسومیر میں زراعت کا دارومدار نہری پانی پر تھا۔ اگر نہروں کا نظام درہم برہم

ہو جاتا تھا تو ملک میں قحط پڑ جاتا تھا اور لوگ بھوکوں مرنے لگتے تھے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عکادوسومیر کے اُسی فرماں روا نے شہرت پائی جس نے ملک کی نہروں کو درست رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وادی کے اکثر بادشاہ اپنے فرمانوں میں نئی نہریں کھدوانے کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں اور جس بادشاہ نے نہروں کی طرف سے غفلت برتی وہی ناکام ہوا۔

بنوبدس کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ اس نے وادیٔ دجلہ وفرات کے نہری نظام کی اصلاح وترقی کی مطلق پروانہ کی مگر نہروں کی بربادی میں دریائے فرات کی بے راہ روی کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس زمانے میں یہ دریا آہستہ آہستہ اپنا رخ بدل رہا تھا۔ اس کے باعث پرانی نہریں بے کار ہوتی جارہی تھیں اور دریا کے کنارے شہر بھی ویران ہونے لگے تھے۔ پرانی نہروں کی صفائی اور مرمت نہ ہونے کے باعث مزروعہ علاقے سیم اور تھور کا شکار ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں زرعی پیداوار کا گھٹنا قدرتی امر تھا لیکن یہ مسائل نا قابلِ حل نہ تھے بشرطیکہ مرکز میں کوئی دُور اندیش اور طاقت ور حکومت موجود ہوتی مگر بختِ نصر کے بعد بابل میں پھر کوئی ایسا فرماں روا نہ ہوا جو نہروں کی بحالی کی طرف توجہ کرتا۔ ہخامنشیوں کے عہد میں جب بابل خراج وصول کرنے کے بجائے خراج ادا کرنے پر مجبور ہوا تو اس کی معیشت کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب وہ ایک محکوم معاشرہ تھا اور کوئی تہذیب غلامی میں فروغ نہیں پاتی۔

بابلی تہذیب کے انحطاط کا ایک اور سبب پروہتوں کا کلیسائی نظام تھا۔ یہ بڑی سخت گیر اور با اثر کلیسائیت تھی جس نے لوگوں کو فرسودہ رسوم ورواج کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ پروہتوں کی ہدایتوں سے سرِ مو انحراف کر سکے۔ چنانچہ روایت پرستی پوری قوم کی سرشت بن گئی تھی۔ علم ودانش پر چونکہ پروہتوں کی اجارہ داری قائم تھی اس لیے ملک میں ایسا کوئی طبقہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا جو پروہتوں کے ذہنی استبداد اور استحصال کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کرسکتا۔ پروہت لوگوں کو صبر وقناعت کی تلقین کرتے اور تقدیر پرستی کا سبق پڑھاتے تھے۔ اس تقدیر پرستی کے باعث اصلاح، اجتہاد اور انقلاب کی صلاحیتیں سلب ہوگئیں۔ لوگ لکیر کے فقیر بن گئے اور کسی نے حالات کو بدلنے کی طرف توجہ نہ کی۔ حالانکہ ساتویں اور چھٹی قبلِ مسیح کا زمانہ بڑا انقلاب آفریں زمانہ تھا۔ ہر طرف نئی نئی ایجادیں ہورہی تھیں اور نئے نئے

فلسفے اور نظریے وضع کیے جا رہے تھے۔ گوتم بدھ اور لاؤزے کی تعلیمات کی بدولت ہندوستان اور چین میں نہایت دُور رس سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ایشیائے کوچک (یونان) کے فلسفی، سائنس دان طالیس، انکسی، ماندر، فیثا غورث، دیموقراطیس اور ہیرک، لائکیٹس کائنات کے نمو و تغیُّر کی تشریح خالص طبعی اصولوں پر کر رہے تھے اور جادو، منتر اور تقدیر کے بجائے قوانینِ قدرت کا درس دے رہے تھے۔ لطف یہ ہے کہ ان یونانی فلسفیوں نے طب، ہیئت و نجوم اور حساب و ہندسے کے علوم اہلِ بابل ہی سے سیکھے تھے لیکن بابلی تہذیب اب اپنے گرد و پیش کے تغیُّرات سے کچھ سیکھنے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔

اسی زمانے میں دو ایسی ایجادیں ہوئیں جنہوں نے بین الاقوامی معیشت اور سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اوّل لوہے کا رواج اور دوئم کسالی سکّے کا استعمال۔

یہ درست ہے کہ مشرقِ قریب کے لوگ لوہے کے استعمال سے ہزاروں برس پہلے سے واقف تھے چنانچہ چار ہزار قبلِ مسیح میں اہلِ مصر لوہے کی گولیوں سے ہار اور مالائیں بناتے تھے اور چودھویں صدی قبل مسیح میں اہلِ حتی لوہے سے خنجر بھی بنانے لگے تھے لیکن یہ شہابی لوہا تھا۔ معدنی لوہا نہ تھا۔ البتہ نویں صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کی پہاڑیوں سے کچّا لوہا نکالا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ نئی دھات جو تانبے اور کانسے سے زیادہ سخت مضبوط اور پائیدار تھی اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ کانسے اور تانبے کو ترک کر کے لوہا استعمال کرنے لگے۔ بالخصوص صنعت زراعت کے اوزاروں اور حرب و ضرب کے آلات کی حد تک۔ اس طرح لوہے کا زمانہ شروع اور تانبے اور کانسے کا زمانہ ختم ہوا۔ لیکن بابلی تہذیب نے آہنی دور کی جھنکار نہ سنی بلکہ آخری وقت تک اس عہد آفریں ایجاد کے عواقب و نتائج سے بھی بے خبر رہی۔ یونان خوش قسمت تھا کہ اس کے پہاڑ لوہا اگلتے تھے اور اس کے ہنرمندوں اور صنعت گروں کو اس دھات کی افادیت کا پورا پورا احساس تھا۔

حسنِ اتفاق سے چاندی کی کانوں کا سب سے بڑا ذخیرہ بھی ایشیائے کوچک ہی میں تھا چنانچہ سکّے ڈھالنے کا رواج بھی سب سے پہلے وہیں شروع ہوا۔ ٹکسالی سکّوں سے پیش تر سندھ، ایران اور مشرقِ قریب کے ملکوں میں یا تو اجناسِ بازاری کا مبادلہ ہوتا تھا یا چاندی کے ایک خاص

وزن کے ٹکڑے بطور زر استعمال ہوتے تھے۔ ٹکسالی سکّوں کے رواج نے بین الاقوامی تجارت میں بڑی سہولتیں پیدا کر دیں لیکن قدامت پرستی کا بھلا ہو کہ دارائے اعظم سے قبل وادیِ دجلہ و فرات کے کسی فرماں روا کو سکّے ڈھلوانے کا خیال تک نہ آیا۔ سکندر جب بابل میں داخل ہوا ہوگا تو اسے یہ دیکھ کر واقعی بڑی حیرت ہوئی ہوگی کہ وہ تہذیب جس کا دنیا میں اتنا غلغلہ تھا وہ اب کتنی تہی دامن ہو چکی ہے۔ اہلِ یونان اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے باوجود وادیِ دجلہ و فرات کی تہذیب کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں اور اس کی تاریخی خدمات اس کی خامیوں سے فزوں تر ہیں۔ اس تہذیب نے انسان کو تحریر کا فن سکھایا۔ حساب، ہیئت، الجبرا اور طب جیسے علوم سے بہرہ اندوز کیا، نظم و نسق کے اصول اور قانون کو منضبط کرنے کے طریقے بتائے اور گنبد، مینار اور محراب تعمیر کرنے کے ہنر سے آگاہ کیا۔ دنیا کے سب سے قدیم تاریخی نوشتے اور نقشے اور ادبی شاہکار بھی اسی وادی میں ملے ہیں۔

بابلی تہذیب کو فنا ہوئے دو ہزار برس سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن سچائی کی آنکھوں سے دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ مشرق ہوں یا اہلِ مغرب، یہودی ہوں یا عیسائی، پارسی ہوں یا مسلمان سب کے عقیدوں اور رسم و رواج کا رشتہ بابلی تہذیب ہی سے ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بابلی تہذیب سے ہماری مراد وادیِ دجلہ و فرات کی پرانی تہذیب ہے۔

کتابیات

۱۔قرآن مجید معہ ترجمہ فارسی حضرت شاہ ولی اللہ — اقبال پرنٹنگ ورکس

۲۔قرآن مجید معہ ترجمہ اردو مولانا شاہ رفیع الدین — دہلی

۳۔قرآن مجید معہ ترجمہ اردو مولانا شاہ عبدالقادر

۴۔قرآن مجید معہ ترجمہ اردو مولانا سید اشرف علی تھانوی

۵۔مشکوٰۃ شریف معہ ترجمہ انگریزی حاجی مولانا فضل الکریم۔جلد ۱تا۴

مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۰ء

۶۔قصص الانبیا غلام نبی..............................مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء

۷۔انجیلِ مقدس (اردو)..............................مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء

۸۔انجیلِ مقدس (انگریزی)

Macqueen, James G.:		Babylon. New York 1964.
Hooke, Sb.H	:	Babylonian & Assyrian Religion. Oxford 1962.
James, E.O.	:	Seasonal Festivals and Feasts. London, 1961
Walley. Sir Leonard	:	Excavations at Ur.London, 1955
Rundle Clark, R.T.	:	Myths & Symbols in Ancient Egypt. London, 1959.
Cumont, Franz	:	After Life in Roman Paganism. Yale 1923
Tylor, Edward B	:	Primitive Culture. Vol 1, London 1891.

Lambert, W.G. Ed	:	Babylonian Wisdom Literature, Oxford, 1960.
Burnet, John	:	Early Greek Philosophy, New York, 1957.
Frazer, Sir James G	:	The Golden Bough London, 1949
Radin, Paul,	:	Primitive Man as Philosopher, New York, 1957
Smith, Homer W	:	Man and His Gods. New York, 1957
Hitti, Philip K.	:	History of the Arabs. London, 1958
Kramer, Samuel N.	:	History Begins at Sumer. New York 1959.
Neugebauer, O.	:	The Exact Sciences in Antiquity. Copenhagen, 1951
Spence, Lewis	:	Myths & Legends of Ancient Egypt. London 1922.
	:	The Origin and Growth of Archaeo-logy. London, 1967.
Hooke S.H	:	Middle Eastern Mythlogy. London, 1963.
Lissner,	:	The Living Past, London, 1957.
Ragozin Z.A	:	Assyria, London, 1914
Kramer, Samuel N.	:	Mythologies of the World. NY, 1961
Herodotus	:	The Histories. London, 1959
Pritchard, James B.	:	The Ancient Near East. London 1958
Farrington, Benjamin	:	Greek Science. London, 1953
Lloyd, Seton	:	Foundations in the Dust. London 1955.

Cob. Sonia	:	The Pre-History of East Africa London, 1954.
Raglan Lord	:	The Hero. Thinker's Library, 1949.
Stobart, J.C	:	The Glory that was Greece, London 1960
Allen, Grant	:	The Evolution of the Ideal God. Thinkers Library, 1949.
Weston, Jessie L.	:	From Ritual to Romance. New York 1957.
Cottrel, Leonard	:	Life Under the Pharaohs. London 1964.
Wheeler, Sir Mortimer	:	Archaeology from the Earth, London, 1956.
Frankfurt, Henrl	:	Before Philosophy, London.
Cottrel, Leonard	:	Lost Cities, London, 1957.
Murray, M.A	:	The Splendour that was Egypt. London, 1959.
Mascatl, Sabatino	:	Ancient Semitic Civilisations. New York, 1960.
Roux, Georges	:	Ancient Iraq. London, 1964.
Breasted J.H	:	A History of Egypt. London, 1959
Woolley, Leonard	:	Mesopotamia and the Middle East (Art of the World) London, 1961.
Hawkes, Jacquetta	:	Pre-History (UNESCO) Vol 1 London, 1963
Woolley-Sir Leonard	:	The Beginning of Civilisation.

(UNESCO) Vol 1, London, 1963

Montagu, Ashley : Man. New York, 1958

Chattopadhya : Lokayata, Delhi, 1959

Jung C.G : Psychological Types, London, 1953

Freud, Sigmund : The Basic Writings of Sigmund Freud

Modern Library. New York, 1938.

Parrot, Andre : Sumer, Thames & Hudson, London 1960.

”کوئی شبہ نہیں کہ سبطِ حسن نے محنت طلب، تحقیق طلب، فکر انگیز اور معلومات سے پُر کتاب سپردِ قلم کی ہے اور اس میں بھی ذرا شبہ نہیں کہ اس موضوع پر اردو زبان میں اب تک لکھی جانے والی سب سے اہم کتاب ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ کم از کم عام قاری کے نقطۂ نظر سے اور عام قاری ہی کے لیے یہ کتاب اردو زبان میں قابلِ قدر اور قابلِ تحسین اضافہ ہے۔ زبان و بیان بہت ہی دلکش ہے، سادہ ہے اور اثر آفریں ہے۔“

ابنِ حنیف

’سیپ‘، کراچی، شمارہ ۳۴

”تہذیب ایک جداگانہ وقوعہ نہیں، نہ ہی تہذیبی اداروں اور ثقافتی اقدار کی تشکیل از خود ہو جاتی ہے بلکہ ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تہذیب ایک ایسے سلسلہ در سلسلہ کا نام ہے جس کی پہلی کڑی ماضی بعید کے دھندلکوں میں پوشیدہ ہے تو آخری کڑی مستقبل بعید کی تاریکی میں، یوں تہذیبی ادارے اور تمدنی اقدار ان لہروں سے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو محض سطح کے تموج کو ظاہر کرتی ہے لیکن سمندر صرف لہروں کا نام نہیں بلکہ اس کی تہہ تک پانی ہی پانی ہوتا ہے لیکن سطح پر مچلتی موجیں اور تہہ کا پانی ایک ہی ہیں۔ پس یہی حال قدیم تاریخ کا ہے۔ وہ تاریخ جو کم علمی کی بنا پر نگاہوں سے پوشیدہ دھندلکوں میں ملفوف عجیب و غریب وقوعات کا مجموعہ نظر آتی ہے لیکن در حقیقت ہمارا اس قدیم تاریخ سے وہی تعلق ہے جو سمندر کی تہہ کے پانی اور سطح پر کھیلتی لہروں کا۔

”اردو میں زمانۂ بعید اور قدیم ترین تاریخی وقوعات پر اب تک صرف ابنِ حنیف ہی نے معنویت سے لکھا تھا چنانچہ ’ہزاروں سال پہلے‘، ’تخلیق کائنات‘، ’گل گامش کی داستان‘ اور ’بھولی بسری کہانیاں‘ سبھی ازمنۂ قدیم کے پُر اسرار دھندلکوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اب اس ذیل میں سبطِ حسن کی ’ماضی کے مزار‘ بھی شامل ہو جاتی ہے جو اس موضوع پر بلاشبہ ایک مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ اس میں وادیٔ دجلہ و فرات کے اس مرحوم تہذیب و تمدن کی داستان بیان کی گئی ہے جو صفحۂ ہستی سے تو مٹ گئی ہے لیکن اس کے اثرات اب بھی ہمارے بعض عقائد اور توہمات کی صورت میں نظر آ سکتے ہیں۔۔۔

”..... یہ کتاب صرف اس شخص کے لیے ہے جو علم کی روشنی کو تعصبات کے اندھیرے سے نہیں روکنا چاہتا کیونکہ کئی مذہبی عقائد قدیم ادبیات کا سرمایہ نظر آتے ہیں۔ یہ تاریخ کے اس عہد کے بارے میں ہے جسے ہم مسلمان کفار کا زمانہ قرار دیتے ہیں اس لیے اس سے استفادہ یا کم از کم لطف اندوزی کے لیے ایسے قاری کی ضرورت ہے کہ۔ قلبِ او مومن و دماغش کافر است“

پروفیسر سلیم اختر، ماہنامہ ’کتاب‘، لاہور